MAUR-105,(N)

Tahqeeq Ka Tareeq-e-Kaar

MAUR-105,(N) تحقیق کا طریق کار

MAUR-105,(N)

فہرست

بلاک:1 پانچواں پرچہ: تحقیق کا طریقِ کار

اکائی:1 مبادیات تحقیق: تحقیق وتنقید کا باہمی رشتہ

اکائی:2 تحقیق کی تعریف، اہمیت وافادیت

اکائی:3 تحقیق کا فن اور آغاز وارتقا

اکائی:4 تحقیق کے اصول اور طریقِ کار

اکائی:5 تذکروں میں تحقیقی عناصر

بلاک:2

اکائی:6 اردو میں تحقیق وتدوین کی روایت

اکائی:7 تدوینِ متن: اصول ومسائل

بلاک:3 اردو کے اہم محققین (الف)

اکائی:8 حالی اور شبلی

اکائی:9 مولوی عبدالحق اور امتیاز علی عرشی

اکائی:10 حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود

بلاک:4 اردو کے اہم محققین (ب)

اکائی:11 رشید حسن خاں

اکائی:12 حنیف نقوی

اکائی:13 گیان چند جین

کورس کا تعارف

اشیاء کے سلسلے میں تلاش وتحقیق اور چھان پھٹک انسان کا فطری خاصہ ہے۔ وہ ہر اس شے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا خواہاں ہوتا ہے، جس کے متعلق اس کی معلومات تشنہ ہوتی ہیں۔ وہ ذاتی طور پر ان چیزوں کی تلاش وتحقیق بھی کرتا رہتا ہے۔فطری طور پر انسان بہت حساس واقع ہوا ہے، اسی حساسیت کے سبب غور وفکر کرنا اس کی عادت ہے۔ ہر انسان زندگی میں مختلف مسائل سے دوچار ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی زندگی میں درپیش مسائل کا احوال جاننے کی کوشش اور اس کے تدارک کے لیے سرگرداں رہتا ہے۔اس کے علاوہ زندگی کے جن مسائل سے اسے دلچسپی ہوتی ہے وہ فطری طور پر ان پر گہری نظر ڈالنا چاہتا ہے تاکہ انہیں بہتر سے بہتر بنا سکے۔اس طرح زندگی میں حاصل ہونے والی کامیابیاں اس کی جدوجہد کا نتیجہ ہوتی ہیں۔انسان ابتدا سے ہی اس کوشش میں مصروف ہوجاتا ہے تاکہ زندگی کے متعدد مسائل اور معاملات میں بہتری لاکر اسے مزید استحکام عطا کرسکے۔ بسا اوقات اسے اس کوشش میں ذہنی وفکری طور پر بہت سی الجھنوں اور جدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اس طرح حقیقت کی بازیافت کا یہ عمل اس کے جذبۂ تحقیق کو آہستہ آہستہ پروان چڑھاتا رہتا ہے اور وہ مبہم اور غیر واضح مسائل کو مشاہدات اور دلائل کی روشنی میں پرکھنے کا عادی بن جاتا ہے۔عہدِ حاضر میں انسانی زندگی جس برق رفتاری سے کامیابی کی طرف گامزن ہے اور نئے نئے تجربات ہورہے ہیں اس میں انسان کی اسی عادت کی کارفرمائی شامل ہے۔تحقیق کی بدولت ہی ہم ان مخفی حقیقتوں سے آشنا ہوسکے ہیں جو کل پردۂ خفا میں تھے۔عہدِ حاضر کی ترقیات کو دیکھ کر ہر حساس انسان فطری طور پر مسئلے کے حل کو شواہد کی بنیاد پر دیکھنا چاہتا ہے، جسے اصطلاح میں ہم ''تحقیق'' کہتے ہیں۔

تحقیق اور تنقید ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کا درجہ رکھتے ہیں۔تحقیق اور تنقید معنوی لحاظ سے ایک دوسرے کے اتنے ہی قریب ہیں جتنے عملی طور پر۔تحقیق کے معنی حقائق اور صداقت تک پہنچنے کے ہیں، جبکہ تنقید کے معنی پرکھنے کے ہیں۔تحقیق میں قدم قدم پر مواد کو پرکھنے کی نوبت آتی ہے۔مثلاً تحقیق میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کس موضوع پر تحقیق کی جائے، کیا اس موضوع پر تحقیق کی ضرورت ہے، کیا اس تحقیق سے عوام یا خواص کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے، اس کا دائرہ کار کیا ہے، کیا زیرِ نظر موضوع پر ماضی میں کوئی کام ہوچکا ہے یا نہیں۔اگر پہلے سے تحقیقی کام ہوچکا ہے تو اب مزید تحقیق کی نوعیت کیا ہوگی تاکہ ماضی میں کیے گئے کام کی بہ نسبت اچھے نتائج برآمد ہوسکیں۔لہٰذا تحقیق کے ابتدائی مراحل ہی سے تنقید کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔اس طرح تحقیق کے بغیر تنقید اور تنقید کے بغیر تحقیق کا حق نہیں ادا کیا جاسکتا۔

اکائی 1 ''مبادیات تحقیق: تحقیق وتنقید کا باہمی رشتہ'' پر مبنی ہے۔اس میں تحقیق کے لغوی واصطلاحی معنی نیز اس کی تعریف اور اقسام پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔اس کے علاوہ مواد کی فراہمی اور مقالہ تشکیل دینے کے مراحل کا بیان کیا گیا ہے۔آخر میں تنقید اور تحقیق کا تقابل کرتے ہوئے دونوں کے باہمی رشتے پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی 2 ''تحقیق کی تعریف، اہمیت وافادیت'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں تحقیق کے لغوی واصطلاحی

تعریفات کے ذریعے اس کی تفہیم کی کوشش کی گئی ہے۔اس کے بعد تحقیق کی نوعیت، موضوعات اور مقاصد کے اعتبار سے اس کی قسموں کا بیان کیا گیا ہے۔اسی اکائی میں تحقیق کی اہمیت وافادیت اوراس کے مقاصد پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی 3 ''تحقیق کا فن اور آغاز وارتقا'' پر مبنی ہے۔اس اکائی میں فن تحقیق نگاری کا معروضی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ نیز تحقیق کے آغاز وارتقا پر بحث کرتے ہوئے عہد وار، سرسید احمد خاں، خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد، محسن الملک، مولوی ذکا اللہ، ڈپٹی نذیر احمد، گارساں دتاسی وغیرہ کے تحقیقی کارناموں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 4 میں ''تحقیق کے اصول اور طریقِ کار'' پر گفتگو کی گئی ہے۔جس میں تحقیق کے اصول وضوابط پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے کہ ایک محقق کو تحقیق کرتے وقت کن اصولوں کا خیال رکھنا چاہیے۔اس کے بعد تحقیق کے طریقۂ کار کا سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے۔

اکائی 5 ''تذکروں میں تحقیقی عناصر'' پر مبنی ہے۔جس میں تذکرے کے معانی ومفاہیم کو متعدد ادیبوں کی تعریفات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔اس کے بعد تذکرہ نگاری کے مقاصد اور اس کی خصوصیات کا بھی بیان کیا گیا ہے۔میؔر کے تذکرہ ''نکات الشعرا''، محمد حسین آزاد کا تذکرہ '' آب حیات'' کا تفصیلی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ساتھ ہی تذکروں کے تراجم کے حوالے سے بھی بحث کی گئی ہے۔

چھٹی اکائی میں ''اردو میں تحقیق وتدوین کی روایت'' پر گفتگو کی گئی ہے۔اس اکائی میں اردو میں تحقیق وتدوین کے آغاز و ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس کے ارتقائی مراحل کو دو حصوں، جنوبی ہند اور شمالی ہند میں اردو تحقیق وتدوین میں تقسیم کر کے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

ساتویں اکائی میں ''تدوینِ متن: اصول ومسائل'' پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔جس میں تدوین کی تعریف، متن کی تعریف، مخطوطے کی تعریف پیش کی گئی ہے۔اصطلاحات تدوین کا ذکر کرتے ہوئے ان کی تعریفات بھی پیش کی گئی ہیں۔ساتھ ہی تدوین کے اصول ومسائل کا بھی بیان کیا گیا ہے۔

اکائی 8 ''حالی اور شبلی'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں حالی وشبلی کے حالات زندگی پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ساتھ ہی ان کی اہم تصنیفات وتالیفات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔اسی حصے میں حالی اور شبلی کے تحقیقی کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے اوصاف وامتیازات کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اکائی 9 ''مولوی عبد الحق اور امتیاز علی عرشی'' پر مبنی ہے۔جس میں مولوی عبد الحق وامتیاز علی عرشی کے حالات زندگی پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ساتھ ہی ان کی اہم تصنیفات وتالیفات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔اسی حصے میں مولوی عبد الحق وامتیاز علی عرشی کے تحقیقی کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے اوصاف وامتیازات کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اکائی 10 ''حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبد الودود'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبد الودود کے حالات زندگی پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ساتھ ہی ان کی اہم تصنیفات وتالیفات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔اسی حصے

میں حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود کے تحقیقی کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے اوصاف و امتیازات کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اکائی 11 ''رشید حسن خاں'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں رشید حسن خاں کے حالات زندگی کا بیان کیا گیا ہے۔ساتھ ہی ان کی اہم تصنیفات و تالیفات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔اسی اکائی میں رشید حسن خاں کے تحقیقی کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے اوصاف و امتیازات کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اکائی 12 ''حنیف نقوی'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں حنیف نقوی کے حالات زندگی کا بیان کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ان کی اہم تصنیفات و تالیفات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔اسی اکائی میں حنیف نقوی کے تحقیقی کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے اوصاف و امتیازات کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اکائی 13 ''گیان چند جین'' پر مبنی ہے۔جس میں گیان چند جین کے حالات زندگی کا بیان کیا گیا ہے۔ساتھ ہی ان کی اہم تصنیفات و تالیفات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔اسی اکائی میں گیان چند جین کے تحقیقی کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے اوصاف و امتیازات کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بلاک:1 پانچواں پرچہ: تحقیق کا طریقِ کار

اکائی:1 مبادیات تحقیق: تحقیق وتنقید کا باہمی رشتہ

اکائی:2 تحقیق کی تعریف، اہمیت وافادیت

اکائی:3 تحقیق کا فن اور آغاز وارتقا

اکائی:4 تحقیق کے اصول اور طریقِ کار

اکائی:5 تذکروں میں تحقیقی عناصر

بلاک 1 کا تعارف

اکائی 1 ''مبادیات تحقیق: تحقیق وتنقید کا باہمی رشتہ'' پر مبنی ہے۔اس میں تحقیق کے لغوی و اصطلاحی معنی نیز اس کی تعریف اور اقسام پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔اس کے علاوہ مواد کی فراہمی اور مقالہ تشکیل دینے کے مراحل کا بیان کیا گیا ہے۔آخر میں تنقید اور تحقیق کا تقابل کرتے ہوئے دونوں کے باہمی رشتے پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی 2 ''تحقیق کی تعریف، اہمیت و افادیت'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں تحقیق کے لغوی و اصطلاحی تعریفات کے ذریعے اس کی تفہیم کی کوشش کی گئی ہے۔اس کے بعد تحقیق کی نوعیت،موضوعات اور مقاصد کے اعتبار سے اس کی قسموں کا بیان کیا گیا ہے۔اسی اکائی میں تحقیق کی اہمیت وافادیت اوراس کے مقاصد پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی 3 ''تحقیق کا فن اور آغاز وارتقا'' پر مبنی ہے۔اس اکائی میں فن تحقیق نگاری کا معروضی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔نیز تحقیق کے آغاز وارتقا پر بحث کرتے ہوئے عہد وار، سرسید احمد خاں، خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد، محسن الملک، مولوی ذکا اللہ، ڈپٹی نذیر احمد، گارساں دتاسی وغیرہ کے تحقیقی کارناموں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 4 میں ''تحقیق کے اصول اور طریقِ کار'' پر گفتگو کی گئی ہے۔جس میں تحقیق کے اصول وضوابط پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے کہ ایک محقق کو تحقیق کرتے وقت کن اصولوں کا خیال رکھنا چاہئے۔اس کے بعد تحقیق کے طریقۂ کار کا سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے۔

اکائی 5 ''تذکروں میں تحقیقی عناصر'' پر مبنی ہے۔جس میں تذکرے کے معانی و مفاہیم کو متعدد ادیبوں کی تعریفات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔اس کے بعد تذکرہ نگاری کے مقاصد اور اس کی خصوصیات کا بھی بیان کیا گیا ہے۔میؔر کے تذکرہ ''نکات الشعرا''، محمد حسین آزاد کا تذکرہ ''آب حیات'' کا تفصیلی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ساتھ ہی تذکروں کے تراجم کے حوالے سے بھی بحث کی گئی ہے۔

اکائی:1 مبادیاتِ تحقیق: تحقیق وتنقید کا باہمی رشتہ

1.1 اغراض ومقاصد
1.2 تمہید
1.3 مبادیات تحقیق
1.4 تحقیق کی اقسام
1.5 تحقیق اور تنقید کا رشتہ
1.6 آپ نے کیا سیکھا
1.7 اپنا امتحان خود لیجئے
1.8 سوالات کے جوابات
1.9 فرہنگ
1.10 کتب برائے مطالعہ

1.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- تحقیق کے فن سے واقف ہو جائیں گے۔
- تحقیق کے لغوی اور اصطلاحی معنوں سے واقفیت ہو سکے گی۔
- تحقیق کی بنیادی اور ذیلی قسموں کے بارے میں علم ہو جائے گا۔
- تحقیقی مقالہ لکھنے کا ہنر جان سکیں گے۔
- تحقیقی مقالے کے ضروری اجزا سے متعلق معلومت بہم ہو جائے گی۔
- تنقید اور تحقیق کے رشتے سے آگاہ ہو جائیں گے۔

1.2 تمہید

اشیاء کے سلسلے میں تلاش وتحقیق اور چھان پھٹک انسان کا فطری خاصہ ہے۔ وہ ہر اس شے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا خواہاں ہوتا ہے، جس کے متعلق اس کی معلومات تشنہ ہوتی ہیں۔ وہ ذاتی طور پر ان چیزوں کی تلاش وتحقیق بھی کرتا رہتا ہے۔ فطری طور پر انسان بہت حساس واقع ہوا ہے، اسی حساسیت کے سبب غور وفکر کرنا اس کی عادت ہے۔ ہر انسان زندگی میں مختلف مسائل سے دوچار ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی زندگی میں درپیش مسائل کا احوال جاننے کی کوشش اور اس کے تدارک کے لیے

سرگرداں رہتا ہے۔اس کے علاوہ زندگی کے جن مسائل سے اسے دلچسپی ہوتی ہے وہ فطری طور پر ان پر گہری نظر ڈالنا چاہتا ہے تا کہ انہیں بہتر سے بہتر بنا سکے۔اس طرح زندگی میں حاصل ہونے والی کامیابیاں اس کی جدوجہد کا نتیجہ ہوتی ہیں۔انسان ابتدا سے ہی اس کوشش میں مصروف ہوجاتا ہے تاکہ زندگی کے متعدد مسائل اور معاملات میں بہتری لاکر اسے مزید استحکام عطا کر سکے۔ بسا اوقات اسے اس کوشش میں ذہنی وفکری طور پر بہت سی الجھنوں اور جدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اس طرح حقیقت کی بازیافت کا یہ عمل اس کے جذبۂ تحقیق کو آہستہ آہستہ پروان چڑھاتا رہتا ہے اور وہ مبہم اور غیر واضح مسائل کو مشاہدات اور دلائل کی روشنی میں پرکھنے کا عادی بن جاتا ہے۔عہدِ حاضر میں انسانی زندگی جس برق رفتاری سے کامیابی کی طرف گامزن ہے اور نئے نئے تجربات ہو رہے ہیں اس میں انسان کی اسی عادت کی کارفرمائی شامل ہے۔تحقیق کی بدولت ہی ہم ان مخفی حقیقتوں سے آشنا ہو سکے ہیں جو کل پردۂ خفا میں تھے۔عہدِ حاضر کی ترقیات کو دیکھ کر ہر حساس انسان فطری طور پر مسئلے کے حل کو شواہد کی بنیاد پر دیکھنا چاہتا ہے، جسے اصطلاح میں ہم ''تحقیق'' کہتے ہیں۔

تحقیق اور تنقید ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کا درجہ رکھتے ہیں۔تحقیق اور تنقید معنوی لحاظ سے ایک دوسرے کے اتنے ہی قریب ہیں جتنے عملی طور پر۔تحقیق کے معنی حقائق اور صداقت تک پہنچنے کے ہیں، جبکہ تنقید کے معنی پرکھنے کے ہیں۔تحقیق میں قدم قدم پر مواد کو پرکھنے کی نوبت آتی ہے۔مثلاً تحقیق میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کس موضوع پر تحقیق کی جائے، کیا اس موضوع پر تحقیق کی ضرورت ہے، کیا اس تحقیق سے عوام یا خواص کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے، اس کا دائرہ کار کیا ہے، کیا زیرِ نظر موضوع پر ماضی میں کوئی کام ہو چکا ہے یا نہیں۔اگر پہلے سے تحقیقی کام ہو چکا ہے تو اب مزید تحقیق کی نوعیت کیا ہوگی تاکہ ماضی میں کیے گئے کام کی بہ نسبت اچھے نتائج برآمد ہوسکیں۔لہٰذا تحقیق کے ابتدائی مراحل ہی سے تنقید کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔اس طرح تحقیق کے بغیر تنقید اور تنقید کے بغیر تحقیق کا حق نہیں ادا کیا جا سکتا۔

1.3 مبادیات تحقیق

تحقیق کے لغوی معنی تلاش، تفتیش، دریافت، کھوج اور چھان بین کے ہیں جبکہ اصطلاحی معانی کے لحاظ اسے یہ لفظ بہت متنوع ہے۔اس کے تحت کسی خاص تصور، خیال، فکر، موضوع یا مسئلے سے متعلق نئے حقائق کی تلاش بھی کی جاتی ہے اور موجودہ حقائق کی تصدیق یا تردید کر کے ایسے منطقی نتائج اخذ کیے جاتے ہیں تاکہ موجودہ علم میں اضافہ ہوجائے۔تحقیق کا یہ عمل انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہوجاتا ہے۔ہر ذہین آدمی اپنے آس پاس اور اردگرد کی اشیاء سے متعلق غور وفکر کرتا ہے۔زندگی کے عام مسائل سے لے کر خاص مسائل تک، چاہے اسے اُن مسائل میں دلچسپی ہو یا نہ ہو، البتہ اگر ان مسائل میں انسان کو دلچسپی ہے تو وہ اس کو ہر زاویہ سے دیکھتا اور تفتیش کرتا ہے کہ آخر یہ کیوں ہے؟ اور اگر ہے تو کیسے ہے؟ اس طرح اس کے دماغ میں نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں، جو شکوک کہلاتے ہیں۔دراصل یہ شکوک ہی تحقیق کی مبادیات ہیں۔اگر کسی موضوع، فکر، خیال اور مسئلے کے متعلق انسان کے دل میں شکوک پیدا ہو رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ ان شکوک کو دور کرنے کا جذبہ بھی اس کے اندر پیدا ہوگا اور جب وہ ان شکوک کو دور کرلے گا تو وہ کسی نتیجہ پر پہنچ جائے گا اور نتیجہ پر پہنچنا ہی تحقیق ہے۔اس طرح شکوک/تشکیک کو تحقیق میں بہت اہمیت حاصل ہے۔

روبسٹر کے لغت میں تحقیق کے درج ذیل معانی درج ہیں، جس کا ترجمہ ذیل میں دیا جا رہا ہے:

''انہماک کے ساتھ جستجو یا چھان بین، بالخصوص یا عموماً ناقدانہ اور سیر حاصل تفتیش یا جستجو جس کا مقصد نئے حقائق کا انکشاف اور ان کی صحیح تاویل اور پھر نئے حقائق کے انکشاف کی روشنی میں مروجہ نتائج، نظریات یا قوانین پر نظر ثانی کرنا یا نظر ثانی کیے ہوئے نتائج کا عملی استعمال وغیرہ، نیز کسی شخصیت یا مضمون یا اسی قبیل کی کسی دوسری چیز سے متعلق مخصوص چھان بین، جس کے ذریعہ چھان بین کرنے والا اپنا انکشاف پیش کرے۔''

(webster's New International Dictionary of the English Language, 2nd Edition)

جب انسان کسی چیز کو دیکھ کر تشکیک میں مبتلا ہو کر مسائل کو حل کر لیتا ہے تو بہت خوشی محسوس کرتا ہے۔ اگر انسان کے اندر کسی چیز کو دیکھ کر شک نہ پیدا ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کے اندر تحقیق کا مادہ نہیں ہے۔ لہٰذا تحقیق میں تشکیک کو بنیادی اولیت حاصل ہے۔ کسی مخصوص چیز یا شخص یا اس سے متعلق غور و فکر اور تلاش کا عمل 'تحقیق' کہلاتا ہے۔ کسی فکر، خیال یا مسئلے پر غور و فکر کرنا یا کسی مضمون کا مطالعہ کر کے اس سے حقائق کا انکشاف کرنا تحقیقی عمل ہے۔ اس کے علاوہ موجود اشیاء اور خارج میں موجود چیزوں میں غور و فکر کر کے نئے معانی برآمد کرنا بھی تحقیق ہے۔ 'تشکیک' یعنی شک کرنا تحقیق کے میدان میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ جب ہم کسی چیز یا شے کو دیکھ کر شک کریں گے کہ آخر یہ کیا ہے؟ کیسے ہے؟ اور کیوں ہے؟ تبھی اس کی بازیافت کر پانا ممکن ہوگا۔ ہم ان تمام شکوک و شبہات کا پتہ لگانے کی کوشش کریں گے۔ لہٰذا تحقیق میں تشکیک کو اولیت کا درجہ دیا گیا ہے۔ تحقیق میں صرف حقائق کو جمع کرنا ہی نہیں بلکہ ان کی تشریح و تعبیر بھی کرنا ہے۔ حقائق جمع کرنا اور ان کی پوری درستی کا خیال رکھنا تحقیق کا لازمی جزو ہے۔

'تحقیق' حقائق کی بازیافت کا نام ہے۔ تحقیق اپنے زیرِ بحث موضوع سے متعلق تمام مآخذ کا پوری دیانت داری اور تلاش و جستجو کے ساتھ مطالعہ کرنے کا نام ہے۔ تحقیق میں ضروری ہے کہ موضوع کے تمام پہلوؤں کا مکمل نظم و ضبط اور صبر و تحمل نیز دیانت داری کے ساتھ جائزہ لیا جائے۔ اس طرح کے طریقہ کار سے بآسانی صحیح نتائج تک رسائی ہو سکتی ہے۔ تحقیق میں کسی علمی مسئلہ، سائنسی فکر او رسماجی نکتہ کو پیش کیا جاتا ہے یا کوئی نئی بات سامنے لائی جاتی ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ تحقیق میں جو بات پیش کی جائے وہ نئی ہی ہو۔ ماقبل میں کہی گئی بات اگر تشنہ ہے یا اس میں کوئی خامی اور کجی رہ گئی ہے تو اس کی تحقیق کر کے حقائق تک پہنچا جا سکتا ہے۔ تحقیق میں کوئی بھی منزل حرفِ آخر نہیں ہوتی، مرورِ ایام کے ساتھ اس میں نئی نئی شقیں نکال کر تحقیقی پہلو نکالا جا سکتا ہے۔ تحقیق کا مقصد کسی نامعلوم خیال، فکر اور مسئلہ کے سلسلے میں حقائق کی تلاش ہی نہیں بلکہ معلوم حقائق کی توسیع بھی ہے۔ تحقیق میں معلوم حقائق کی خامیوں کی تصحیح بھی کی جاتی ہے اور اس کی تردید کر کے نئے معانی نکالے جاتے ہیں۔ اس طرح دونوں ہی صورتوں میں علم میں اضافہ ہوتا ہے اور نئے امکانات واضح ہوتے ہیں۔ تحقیق سے لاینحل مسائل کا حل پیش کیا جاتا ہے، اسی لیے کرافورڈ نے تحقیق کی مندرجہ ذیل خصوصیات بتائی ہیں:

(1) اس کا مرکز کوئی مسئلہ ہوتا ہے۔

(2) اس میں کوئی نئی بات کہی جاتی ہے۔

(3) اس کا دارومدار جستجو پسند دل اور دماغی رجحان پر ہے۔

(4) اس کے لیے کھلے دل و دماغ کی ضرورت ہے۔

(5) اس کا انحصار اس مفروضہ پر ہے کہ دنیا کی ہر چیز میں تبدیلی ممکن ہے۔

(6) اس کا مقصد قوانین کا انکشاف کرنا اور پھر انہیں عام بنانا ہے۔

(7) یہ سبب اور اثر کا مطالعہ ہے۔

(8) اس کی بنیاد پیمانہ پر ہے۔

(9) اس کے لیے ایک بیدار فنی طریقہ کار لازمی ہے۔

تمام حقائق اور تجربات یکجا کرنے کے بعد محقق سب سے زیادہ ان حقائق کو اہمیت دیتا ہے جو فنکار کے عہد میں لکھی گئی دستاویزات سے اخذ کیے گئے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان حقائق کو بے چوں و چرا تسلیم کرلے کیونکہ کسی حقیقت کو چھپانے یا دوسری طرح سے پیش کرنے یا کسی ایسے واقعہ کا ذکر کرنے کے جو کبھی وجود میں نہ آیا ہو، کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے مصنف نے غیر شعوری طور پر غلط لکھ دیا ہو۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ مصنف نے عمداً حقیقت سے روگردانی کی ہو، اس لئے محقق کے لیے ضروری ہے کہ ہر چیز کو تشکیک کی نظر سے دیکھ کر حقائق کی بازیافت کرے۔

1.4 تحقیق کی اقسام

ابتدائی طور پر تحقیق کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں: (1) میدانی تحقیق (2) کتابی تحقیق

(1) میدانی تحقیق:

میدانی تحقیق کا دائرہ اپنے اندر بہت وسعت رکھتا ہے۔ اس تحقیق کا تعلق سماج میں رونما ہونے والے عام مسائل سے ہے۔ سماج و معاشرے میں موجود خارجی اشیاء کی تلاش و جستجو، عینی مشاہدات، مظاہر قدرت کی تحقیق، اشیاء اور افراد کے سلسلے میں کسی چیز کی تلاش و تفتیش اور اس سے برآمد ہونے والے نتائج میدانی تحقیق کے دائرہ کار میں آتے ہیں۔ میدانی تحقیق کے لیے ضروری ہے کہ محقق اپنے اردگرد کے مقامات کی سیر کر کے اپنے تجربات و مشاہدات کے ذریعہ نتائج اخذ کرے۔

(2) کتابی تحقیق:

کتابی تحقیق ہی دراصل ادبی تحقیق کے نام سے جانی جاتی ہے۔ کتابی تحقیق میں کتب، قدیم و کلاسیکی متون، مخطوطے، علمی اسناد، منابع و مصادر، ماہرین کے آراء و نظریات اور کتب خانوں کی محدود فضا میں تلاش و جستجو کر کے حقائق کی تفتیش کر کے ان سے معلومات افزا نتائج کا استخراج کیا جاتا ہے۔ کتابی تحقیق میں تحریری ماٰخذ و مصادر زیادہ کارآمد اور معاون ثابت ہوتے ہیں۔

تحقیق ایک جامع اور وسیع پیمانے پر کیا جانے والا عمل ہے۔ تحقیق کی وسعت اور اس کے مختلف مقاصد کو دیکھتے ہوئے تحقیق کی

بہت سی قسمیں کی جاسکتی ہیں۔ تحقیق کے جامع مقاصد کے پیش نظر تحقیق کو تین قسموں میں بانٹا جاسکتا ہے:

1- نظریاتی یا بنیادی تحقیق

2- اطلاقی تحقیق

3- اقدامی تحقیق

(1) نظریاتی یا بنیادی تحقیق (Basic Research) میں صرف نظری مباحث کا عمل دخل ہوتا ہے۔اس قسم کی تحقیق سے نئے خیالات کی وضاحت وصراحت اور تعین قدر میں مدد فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔اس تحقیق کے نتائج کا اطلاق ہمیشہ آنے والے دنوں میں ہوتا ہے۔اس تحقیق میں عمومی اصول وضوابط ،نظریات وافکار وضع کیے جاتے ہیں۔اس کو فلسفیانہ تحقیق بھی کہا جاتا ہے۔اس میں عموماً محرکات سے آگاہی اور صداقت کو پرکھنا ہوتا ہے۔اس کی سب سے بڑی خوبی اشیاء کو تفصیل سے بیان کرنا ہوتا ہے جسے سائنسی طریقوں کی مدد سے ہی بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔اس کے نتائج کا اطلاق ہمیشہ مستقبل پر ہوتا ہے۔

(2) اطلاقی تحقیق (Applied Research) معلومات وآگہی میں اضافہ سے متعلق ہے۔اس تحقیق میں عملی طور پر نتائج کو سامنے لایا جاتا ہے یعنی یہ تحقیق نتائج کی روشنی میں اشیاء کو پرکھتی ہے۔جو نظریات نظریاتی تحقیق میں وضع کیے گئے ہیں انہیں اصولوں کو مدنظر رکھ کر اطلاقی تحقیق کام کرتی ہے۔گویا اطلاقی تحقیق کا تعلق کیوں، کیسے اور کیا سے ہوتا ہے۔یہ کسی مسئلے یا شے کے حصول کے طریقے کی افادیت پر مرکز ہوتی ہے۔سائنس وٹکنالوجی سے لے کر معاشرتی صورت حال وضروریات وغیرہ اس کے دائرۂ کار میں آتے ہیں۔اس میں تجزیاتی طریق کار بھی شامل ہوتا ہے۔

(3) اقدامی تحقیق (Action Research) محدود نوعیت کے مسائل میں زیادہ کارآمد ہے۔ اس میں مسائل کے حل، تدارک اور اقدامات تجویز کیے جاتے ہیں۔اس قسم کی تحقیق میں نظریات یا اصول وضع نہیں ہوتے بلکہ عام طور پر اسے تحقیق شمار نہیں کیا جاتا۔ادبی تحقیق میں اس کی ضرورت خال خال ہوتی ہے۔

موضوع کے اعتبار سے ادبی تحقیق کی مندرجہ ذیل قسمیں بیان کی جاتی ہیں:

سوانحی یا تاریخی تحقیق

اس تحقیق کے تحت کسی شاعر، ادیب یا کسی صنف کے تخلیق کاروں کی حیات اور اس کی تخلیقات سے متعلق تحقیق پیش کی جاتی ہے۔اس تحقیق کا انداز تاریخی ہوتا ہے۔اس کے علاوہ اس تحقیق میں شاعر وادیب کے عہد، رجحانات اور تدریجی تغیر وارتقا بھی شامل ہوتے ہیں۔

تنقیدی تحقیق

اس تحقیق میں عام طور پر مقالہ جاتی تحقیق کو شامل کیا جاتا ہے۔ایم فل کے ڈیزرٹیشن اور پی ایچ ڈی کے مقالے اس تحقیق کے ذیل میں آتے ہیں، جس میں تجزیاتی اور تنقیدی تحقیق کر کے مقالہ کو تکمیل تک پہنچایا جاتا ہے۔

حوالہ جاتی تحقیق

اس تحقیق میں کسی مخصوص موضوع یا مسئلہ سے متعلق حقائق کو یکجا کر کے نتائج نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس تحقیق میں وضاحتی فہرستیں، اشاریے اور انسائیکلوپیڈیا وغیرہ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

موضوع اور مواد کے اعتبار سے تحقیق کی بہت ساری دیگر قسمیں بھی ہیں جو درج ذیل ہیں:

1۔ تاریخی تحقیق Historicl Research

2۔ بیانیہ تحقیق Descriptive Research

3۔ تجرباتی تحقیق Experimental Research

4۔ کلینکی تحقیق Clinical Research

5۔ موضوعاتی تحقیق

الغرض تحقیق میں انکشاف حقائق کو منطقی ترتیب کے علاوہ اہمیت کے نقطۂ نظر سے بھی اولیت حاصل ہے۔تحقیق میں اولاً حقائق کا پتہ لگایا جاتا ہے، اس کے بعد اس سے برآمد شدہ نتائج کو سامنے لایا جاتا ہے۔کیونکہ حقائق کا پتہ لگائے بغیر نتائج نکالنا مشکل امر ہے۔تحقیق میں وقت کو بہت اہمیت حاصل ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ تحقیق کرنے سے قبل اس کا ایک خاکہ بنالیا جائے، جس میں تحقیق پر صرف کیے جانے والے وقت کی بھی تعیین ہو۔یعنی محقق کو تخمینہ لگالینا چاہیے کہ تحقیقی مواد تلاش کرنے میں کتنا وقت درکار ہوگا اور اخذ نتائج میں کتنا؟ اس کے لیے مغربی محققین نے درج ذیل درجہ بندی کی ہے: (الف) مواد کی تلاش (ب) مقالہ لکھنا:

(الف) مواد کی تلاش

مواد کی تلاش کے تحت درج ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

(1) موضوع کا انتخاب

(2) پس منظری مطالعہ

(3) عارضی فہرستِ مآخذ تیار کرنا

(4) عارضی خاکہ

(5) پڑھنا اور نوٹ لینا

(6) نوٹوں کو ترتیب دینا

(ب) مقالہ لکھنا:

(1) جمع شدہ مواد کا تنقیدی تجزیہ

(2) آخری خاکہ تیار کرنا

(3) پہلا مسودہ

(4) نظر ثانی

(5) آخری فہرست ماخذ تیار کرنا

(6) آخری مسودہ

مواد کی تلاش اور تحقیق کی سبھی تیاریوں کے بعد مقالہ لکھنے کے عمل کو کئی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، جو درج ذیل ہیں:

فہرست:- کتاب میں فہرست کی جگہ مقدمہ سے بھی قبل ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ فہرست میں مقدمہ کا ذکر شامل ہوتا ہے۔ عام طور سے فہرست بنانے کے دو طریقے رائج ہیں: (1) اجمالی (2) وضاحتی

اجمالی فہرست میں صرف باب کا عنوان درج کر دیا جاتا ہے، اس کے متعلقات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے۔ جبکہ وضاحتی فہرست میں عنوان درج کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے ذیلی اور ضمنی عنوانات بھی درج کرنے ہوتے ہیں۔

مقدمہ:- مقدمہ کو انگریزی میں Preface Lawsuit Preamble, جبکہ اردو میں دیباچہ، تمہید اور مقدمہ کہتے ہیں۔ یہ ایسی تحریر ہوتی ہے جس میں کسی کتاب کا مختصر سا تعارف ہوتا ہے۔ جب مصنف کوئی تحقیق کرتا ہے یا کسی متن کی تدوین کا کام انجام دیتا ہے تو وہ کتاب کی ابتدا میں اپنا نقطۂ نظر اور اپنی تحقیقسے تعلق چند بنیادی، اہم اور ضروری باتوں کی وضاحت کرتا ہے نیز کتاب ومقالہ لکھنے کے دوران برتے جانے والے مسائل، اصول اور طریق کار کی تشریح کرتا ہے۔ مقدمہ میں مصنف یہبھی عرض کرتا ہے کہ اس کام کے دوران اس کو کیا دقتیں اور پریشانیاں پیش آئیں۔ اسے کن کن مسائل ومراحل سے گزرنا پڑا اور مسائل کے تدارک کی کیا کیا صورتیں عمل میں لائی گئیں۔ اس تحریر کو عرف عام میں دیباچہ یا مقدمہ کہا جاتا ہے۔ عام طور سے مقدمہ کی زبان فصیح وبلیغ اور عالمانہ عبارت پر مشتمل ہوتی ہے۔ مقدمہ مقالے کی ابتدا میں ہوتا ہے لیکن تصنیفی ترتیب اور اصولی طور پر اسے کتاب کی تکمیل کے بعد لکھا جاتا ہے۔ مقدمہ میں موضوع کی اہمیت بیان کی جاتی ہے۔ اگر مقالہ میں پیش کیے گئے متون کے مختلف نسخے ہوتے ہیں تو ان نسخوں کے ذکر کے بعد یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مصنف کے پیش نظر کون سا نسخہ رہا ہے۔ علاوہ ازیں مقالہ نگار، مقدمہ میں ان تمام افراد و کتب خانوں اور اداروں کا شکریہ ادا کرتا ہے، جن کی رہنمائی اور تعاون دورانِ تحقیق حاصل رہی ہے۔ مقدمہ میں موضوع کی ضرورت، اغراض ومقاصد اور اہمیت کو اجاگر کیا جاتا ہے، اس میں متعلقہ موضوع کی مختلف جہات پر ماقبل میں ہونے والے کام کا تجزیہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے اور اپنے کام کے امتیاز، طریقِ کار اور اسلوب کا تعارف بھی کرایا جا سکتا ہے۔ چونکہ تحقیق، حقیقت کی بازیافت کا عمل ہے، اس لیے محقق کو غیر جانب دار، غیر متعصب اور غیر جذباتی ہونا چاہیے۔ مقالے میں پرجوش، فلسفیانہ انداز، شاعرانہ جملے اور غیر منطقی جذباتی انداز مقالے کو عیب دار بنا دیتا ہے۔ مقدمہ میں متن کے مصنف اور اس مصنف کے بارے میں ضروری اور ناگزیر نکات کے سوا کچھ بھی پیش کرنا علمی غیر دیانت داری کے ساتھ اخلاقی جرم بھی ہے۔ مقدمہ نگار کو ہر نکتہ پیش کرتے وقت یہ دیکھ لینا چاہئے کہ کوئی مخصوص نکتہ چھوٹ تو نہیں گیا ہے۔ اس سلسلہ میں گیان چند لکھتے ہیں:

> ’’مصنف کا پیش لفظ ہمیشہ کتاب کی تکمیل کے بعد لکھا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس میں تصنیف کی شان نزول، ضرورت، دقتوں، اکتسابات وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے۔ اسی لیے اسے کتاب

میں سب سے پہلے دیا جاتا ہے۔اس صورت حال کے پیش نظر مصنف کا پیش لفظ اوّل اور دوسرے کا مقدمہ اس کے بعد آنا چاہئے، تاکہ مصنف اپنے پیش لفظ میں مقدمہ نگار کے مقدمے کا بھی ذکر کر سکے۔لیکن اگر اتفاقیہ طور پر مصنف نے اپنے پیش لفظ میں موضوع کتاب پر عالمانہ بحث شروع کردی ہے، اس طرح جیسے وہ کتاب کا پہلا باب ہو، تو ایسے پیش لفظ کو دوسرے کے مقدمے کے بعد ہی آنا چاہئے تاکہ اس تمہیدی بحث کا سلسلہ باب اوّل سے کسی انقطاع کے بغیر مل جائے۔''(تحقیق کا فن، مرتب: ڈاکٹر گیان چند جین، عفیف آفسیٹ پرنٹرس، نئی دہلی۔6، اشاعت 2012، ص291)

مقدمہ میں بے جا طوالت سے گریز کرنا چاہیا ورحتی المقدور اختصار سے کام لیتے ہوئے کتاب کا تعارف بھی اختصار کے ساتھ پیش کرنا چاہئے۔مقدمہ میں کتاب کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں کا تعارف بھی شامل کرنا چاہیے۔ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق مقدمہ میں درج ذیل مطالب ہونے ضروری ہیں:

(1) متن کی مختصر لیکن مستند سوانح حیات، اس کی جملہ تصانیف کی فہرست۔

(2) موضوع متن کا تعارف۔

(3) متن پر مختصر تنقید۔

(4) اگر متن قدیم ہے تو لسانی جائزہ۔

(5) جن قلمی نسخوں سے متن تیار کیا گیا ہے، ان سب کا مختصر تعارف۔

(6) تدوین میں اپنایا گیا طریقِ کار۔

(7) اگر متن میں کہیں ترمیم یا تنسیخ کا عمل ہوا ہو تو اس صفحہ کا عکس دینا چاہئے۔

حواشی:-حاشیہ کے لغوی معنی کنارہ کے ہوتے ہیں، یعنی کتاب کے کنارہ کا وہ حصہ جہاں مشکل الفاظ اور تراکیب، مقامی روزمرہ اور ضرب المثل کی وضاحت یا ایسے امور جو متن کے ساتھ نہیں لکھے جاتے، انہیں درج کردیا جاتا ہے۔حاشیہ متن کا متضاد ہے۔اصطلاحی طور پر حاشیہ سے وہ عبارت مراد ہوتی جو کسی کتاب کے صفحہ کے کنارے پر لکھی جائے۔اس میں متن پر اضافوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔یعنی وہ شرح ہے جو کسی متن پر لکھی جاتی ہے۔حاشیہ نگاری بھی ایک قدیم فن ہے۔اگر یہ فن نہ ہوتا تو بہت سے افکار پیدا ہوتے ہی ختم ہو جاتے اور ہم تک ہرگز منتقل نہ ہوتے کیونکہ مصنف کو ان کے اندراج کیلئے الگ کتاب تصنیف کرنی پڑتی، جو بعض حالات میں ممکن نہیں تھی۔حواشی کی بدولت ہی بہت سے اغلاط کی تصحیح ہوسکتی ہے۔حاشیہ نگاری کا عمل سنجیدہ اور فنی تحریروں نیز ترتیبِ متن کا اہم اور لازمی حصہ سمجھا جاتا ہے۔حاشیہ نگاری کے ذریعہ نہ صرف ماخذ کی نشاندہی کی جاتی ہے بلکہ بہت سے توضیح طلب نکات کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے۔ایسے بہت سے امور حاشیے میں درج کردیے جاتے ہیں جو متن کا حصہ نہیں بن سکتے۔اگر متن کی وضاحتیں درمیانِ متن میں ہی کردی جائیں تو قاری کو دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ منشائے مصنف سے بخوبی آگاہی نہیں حاصل

کر پاتا، یہی وجہ ہے کہ ضروری امور کی وضاحت حواشی کے تحت کی جاتی ہے۔اس کے علاوہ قدیم متن کی تدوین کے حوالے سے اختلافی قرأتوں کی نشاندہی بھی حواشی کے تحت کی جاتی ہے۔حواشی کے تحت متن کے مقتضیات،توضیحی روایات اور تصدیقی دلائل کو شامل کیا جاتا ہے۔تحقیقی اور تنقیدی کام' حواشی اور حوالہ جات کے بغیر اہمیت کے حامل نہیں سمجھے جاتے،اس لیے حاشیہ نگاری تصنیف و تالیف کا لازمی عنصر ہے، جسے مکمل کیے بغیر علمی اور تحقیقی مواد قارئین کو احسن طریقے سے پیش نہیں کیا جاسکتا۔حاشیہ نگاری فکری ارتقاء کی آئینہ دار،عصری تقاضوں کو تصنیف میں سمونے کی امین اور کتاب کی افادیت بڑھانے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔حاشیہ نگاری کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مصنف جب اپنے مسودے پر نظر ثانی کرتا ہے تو اس میں جو ترمیم و اضافہ کرتا ہے وہ حاشیہ نگاری کے تحت ہی کرتا ہے۔ماہرین کے مطابق حاشیے میں عام طور پر تین طرح کے ذیلی امور درج کیے جاتے ہیں:

(1) اولاً ان مراجع، مآخذ، منابع اور مصادر کا اندراج کرنا، جن سے محقق، مدون یا مرتب نے استفادہ کیا ہے۔ یہ مآخذ مطبوعہ، غیر مطبوعہ، خطبات، گفتگو یا انٹرویو کی شکل میں ہو سکتے ہیں۔ان کا تذکرہ حاشیے میں کرنا ضروری ہے۔اس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ محقق نے اپنے موضوع کی تفتیش و تحقیق میں مذکورہ کتابوں سے رجوع کیا ہے۔اگر قاری چاہے تو نشان زد کتابوں کے اصل اقتباسات تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔

(2) تحقیق کے دوران بعض مواقع ایسے آتے ہیں کہ متن میں درپیش بعض امور کی وضاحت ضروری ہوتی ہے، ایسی وضاحتوں کی توضیحات اگر متن میں کردی جائے تو متن کی سلاست ختم ہوجاتی ہے اور متن بے ربط ہو جاتا ہے۔کبھی کبھی کوئی غیر مشہور نام، مقام یا اشیاء کا ذکر آجاتا ہے، اگر محقق اسی جگہ ان غیر مشہور ناموں، مقامات یا اشیاء کی وضاحت کرے گا تو متن کا ربط ٹوٹ جائے گا، اس لیے ضروری ہے کہ ایسی مجہول اور نامعلوم چیزوں کی تشریح حواشی میں کردی جائے۔

مآخذ دو قسم کے ہوتے ہیں: (1) بنیادی مآخذ (2) ثانوی مآخذ

(1) بنیادی مآخذ:- اگر دوران تحقیق کسی موضوع سے متعلق بالواسطہ طور پر کسی کتب، مقالے، روزنامچے، دستاویزات، مخطوطات اور خطبات وغیرہ سے استفادہ کیا گیا ہے، تو وہ بنیادی ماخذ کہلائیں گے۔

(2) ثانوی مآخذ:- اگر دوران تحقیق کسی موضوع سے متعلق کوئی کتاب، مخطوطہ یا خطبہ سے محقق نے استفادہ تو کیا ہے لیکن براہ راست اس سے کوئی حوالہ یا اقتباس نہیں پیش کیا ہے تو وہ ثانوی ماخذ کے ذیل میں آئیں گے۔

اس سلسلے میں ضروری ہے کہ محقق اپنی تحقیق کو کارآمد بنانے کے لیے بنیادی مآخذ پر زیادہ توجہ دے اور جہاں تک ممکن ہو ثانوی مآخذ پر انحصار نہ کرے۔البتہ جہاں ثانوی مآخذ کا ذکر ناگزیر ہو وہاں اس کا موازنہ بنیادی مآخذ سے کرنے کے بعد پیش کرے۔ورنہ نقل در نقل کا یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا اور اصل حقائق پردۂ خفا میں رہیں گے۔

ضمیمہ:- ضمیمہ کسی خاندان کے اس دوست کی طرح ہے جو یقیناً اس گھر کا فرد نہیں بن سکتا۔وہ ایسا جزو لاینفک ہوتا ہے جسے گھر سے جدا بھی نہیں کیا جاسکتا۔کتاب کا وہ حصہ ضمیمہ کہلاتا ہے، جو متن اور موضوع سے متعلق تو ہو لیکن کنہی وجوہ کی بنا پر اسے متن کے ساتھ شامل نہ کیا جاسکتا ہو۔ایسی صورت میں کتاب کے آخر میں اس حصہ کو شامل کر کے ضمیمہ کا نام دیا جاتا ہے۔ضمیمہ میں زیادہ تر متن

کے کسی موضوع کی مزید تفصیل، اس پر تبصرہ یا اس کے متعلقات پیش کیے جاتے ہیں۔

تعلیقات:۔ تحقیقی اصطلاح میں تعلیقات وہ یادداشتیں ہیں جو ضمیمہ کے طور پر کتاب میں درج کی جاتی ہیں۔ اس میں تاریخی، ادبی، لغوی اور فرہنگی امور شامل ہوتے ہیں۔ متنِ کتاب میں بعض ایسے امور کا تذکرہ ہوتا ہے، جن کی وضاحت سے کتاب کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور بسا اوقات عدم توضیحات کی بنا پر اصل مفہوم تک رسائی نہیں ہو پاتی۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیقات نگاری کی بہت اہمیت ہے۔ اس سے مختلف فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ مثلاً:

(1) متن زیادہ انتقادی اور پُر از معلومات ہو جاتا ہے۔

(2) بعض اوقات کتاب سے اتنا فائدہ نہیں ہوتا جتنا تعلیقات سے۔

(3) تعلیقات سے مطالبِ کتاب کی تفہیم و تنقید میں بڑی مدد ملتی ہے۔

(4) کتاب کی غرض و غایت تعلیقات سے پوری ہوتی ہے۔

(5) اس سے مصنف کے علم و فضل کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

کتابیات:۔ کتابیات دراصل ان کتابوں اور رسائل و جرائد کی فہرست ہوتی ہے، جن سے دورانِ تحقیق استفادہ کیا گیا ہے۔ کتابیات کی فہرست کتاب کے آخر میں اور اشاریے سے قبل ہوتی ہے، اگر اشاریہ نہ ہو تو کتابیات ہی آخری جز ہوگا۔ کتابیات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(الف) وہ کتابیں، رسائل و جرائد جن کے اقتباسات کتاب میں براہ راست دیے گئے ہیں۔

(ب) وہ کتابیں، رسائل و جرائد جن سے استفادہ تو کیا گیا ہے لیکن ان کے اقتباسات درج نہیں کیے گئے ہیں۔

انہیں ہم بنیادی مآخذ کی کتابیات اور ثانوی مآخذ کی کتابیات بھی کہہ سکتے ہیں۔

کتابیات بناتے وقت درج ذیل امور کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

(1) مخطوطے اور دستاویزات

(2) مطبوعات

(3) مقالات و مقدمات

(4) اخبارات، رسائل و جرائد

(5) جس زبان میں کتاب لکھی گئی ہے، اس کے علاوہ اسی موضوع پر دیگر زبانوں کی کتابوں کا تذکرہ

اشاریہ:۔ اشاریہ سازی کا عمل کتاب کی اہمیت میں اضافہ کر دیتا ہے۔ جیسا کہ نام سے واضح ہے کہ اشاریہ ان چیزوں کو واضح کرتا ہوگا جو غیر مجہول ہوں۔ اشاریہ میں اشخاص، مقامات، کتب اور اداروں نیز انجمنوں کی نشاندہی کی جاتی ہے کہ کون کون سے اشخاص، مقامات، کتب اور اداروں نیز انجمنوں کے نام کتاب کے کس صفحہ پر آئے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اشاریہ سازی کا عمل کتاب کی تکمیل کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ اشاریہ بناتے وقت اشخاص، کتب اور مقامات وغیرہ کو حروف ابجد کی ترتیب سے درج

کیا جانا چاہیے۔ ہر اندراج کے آگے ان تمام صفحات کے نمبر درج کیے جائیں گے جن پر وہ اندراج واقع ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر غیر ضروری اور کم اہم نام کو اشاریے میں درج کیا جائے۔

ترقیمہ:-ترقیمہ وہ عبارت کہلاتی ہے جو کتاب کے بالکل آخری صفحہ پر درج ہوتی ہے۔ یہ عبارت کاتب کے قلم سے اور کاتب کی طرف سے ہوتی ہے۔یعنی اس تحریر میں کتاب یہ بیان دیتا ہے کہ یہ کتاب کس تاریخ، مقام اور کن کن مراحل سے گزری ہے۔یعنی نقل کرنے والے شخص کی وہ عبارت جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ یہ نسخہ کہاں اور کب نقل کیا گیا اور نقل برداری کا فریضہ کس نے انجام دیا اور اس کے محرکات کیا تھے۔

1.5 تحقیق اور تنقید کا رشتہ

تحقیق اور تنقید دونوں کا انحصار تخلیق پر ہے،یعنی پہلے کسی فن پارہ کی تخلیق عمل میں آتی ہے اس کے بعد ہی اس کی تحقیق اور اس پر تنقید کے اصول منضبط ہوتے ہیں۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں کی بنیاد تخلیق پر ہے۔لہٰذا جب تک تحقیق و تنقید میں باہم ربط و ہم آہنگی نہیں ہوگی اس وقت تک نہ ہی اچھی تخلیق کی توقع کی جاسکتی ہے اور نہ ہی بامعنی قرأت کی۔اس طرح تخلیق اصل شے ہوئی اور تحقیق و تنقید ثانوی کیوں کہ ان دونوں کا وجود تخلیق کے بغیر ناممکن ہے۔تحقیق دراصل تلاش و جستجو کی مدد سے حقائق کی بازیافت اور کھرے کھوٹے میں تمیز کا نام ہے نیز اشیاء کی ماہیت و نوعیت کی تصدیق بھی تحقیق کے ذریعہ ہوتی ہے وہیں تنقید کسی چیز، خیال یا فکر معائب و محاسن میں تمیز پیدا کرنے کا نام ہے۔ایلیٹ نے اپنے مضمون میں تخلیقی اور تنقیدی رشتے پر اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ شاید درحقیقت ایک مصنف کی اپنی تصنیف کے سلسلے میں محنت شاقہ کا بڑا حصہ تنقیدی محنت کا ہوتا ہے یعنی چھاننے، جوڑنے، تعمیر کرنے، خارج کرنے، صحیح کرنے، جانچنے کی محنت یہ اذیت ناک محنت جتنی تنقیدی ہوتی ہے اتنی ہی تخلیقی ہوتی ہے۔

تحقیق میں کسی فن پارے کے اصل متن کی سچائیاں تلاش کی جاتی ہیں جبکہ تنقید میں اس کی معنویت پر زور دیا جاتا ہے۔کسی فن پارے کے سلسلے میں محقق کو تلاش و جستجو، تفتیش و تصدیق تو کرنا ہی ہوتی ہے ساتھ ہی ساتھ اسے اس فن پارے میں معنویت بھی تلاش کرنا ہوتی ہے۔لہٰذا تحقیق کے ساتھ معنویت کی تلاش ہی تحقیق و تنقید کے رشتے کو مستحکم بناتی ہے۔ایک محقق جب کسی مواد کو تلاش کر کے اس کی صداقت کے معیار متعین کرتا ہے تو اس کے پیش نظر اس کے محاسن اور معائب بھی ہوتے ہیں جو تنقید کی اولین منزل ہے۔اس کے برعکس جب ایک نقاد اپنی تنقیدی بصیرت کی بنیاد پر کسی فن پارے میں محاسن و معائب تلاش کر کے اس کے تعین قدر کا فریضہ انجام دے رہا ہوتا ہے تو اس کے پیش نظر فن پارے کی صداقت اور حقیقت بھی ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ تحقیق کو تنقید کے بغیر اور تنقید کو تحقیق کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب اولین تحقیق وجود میں آئی ہوگی، پھر اسے تنقید کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہوگا اور اس فن پارے کو پرکھ کر اقداری پیمانے اور راہ نما اصول وضع کیے گئے ہوں تبھی سے تحقیق اور تنقید کا ایک رشتہ قائم ہو گیا ہوگا۔اس کے بعد جب بھی کسی محقق نے کوئی تحقیقی کام انجام دیا ہوگا، تو ظاہر ہے کہ اس نے تنقید کے وضع کردہ اصولوں کو مدنظر رکھ کر اپنی تحقیق میں مزید بہتری و ترقی کا سامان پیدا کیا ہوگا۔محقق کے لیے ضروری ہیں کہ وہ نقادوں کے وضع کردہ پیمانوں اور معیارات کی کلی طور پر پابندی کرے، وہ ان

سے آگے بڑھ کر نئے تجربات بھی کرسکتا ہے اور نئے پیمانے وجود میں لاسکتا ہے۔ اس پورے عمل میں محقق بھی نقاد بن جاتا ہے لیکن اس کی تنقید اور نقاد کی تنقید میں یہ فرق ہے کہ محقق کی تنقید صرف اس کے دماغ تک محدود رہتی ہے جب کہ نقاد کی تنقید منظر عام پر آجاتی ہے۔

تحقیق نام ہے کسی معدوم شے کو وجود میں لانے اور نامعلوم کو معلوم کرنے کا، جبکہ تنقید اس حقیقت کی معقولیت اور افادیت نیز تعین قدر متعین کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ تحقیق اور تنقید کا عمل انجام دینے کے لیے باقاعدگی سے منصوبہ بندی ضروری ہے۔ ایک محقق اپنی تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقید کے وضع کردہ اصولوں کی روشنی میں تحقیق کی سمت کو آگے بڑھاتا ہے کیونکہ تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقید کی بھی کارفرمائی ضروری ہوتی ہے۔ یعنی تحقیق اور تنقید کے لیے کون سا طریقہ کار یا کون کون سے مناسب طریقے اپنائے جائیں۔ یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ تحقیق میں کس درجہ اہمیت کے حامل مسئلے کو حل کرنے کے لیے کون سا طریق کار اپنایا جائے یا پھر تنقید کے لیے کس ضابطے کو مناسب گردانا کیا جائے؟ غرض کہ محقق اور نقاد دونوں کا نصب العین صداقت کا دریافت کرنا ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ محقق کو کسی شے کے وجود میں لانے کی فکر دامن گیر رہتی ہے اور نقاد کو تخلیق کے تعین قدر سے واسطہ ہوتا ہے۔

محقق اور نقاد کی منصوبہ بندی میں چاہے وہ مفروضات ہوں یا مسلمات، دونوں میں خاطر خواہ اور مثبت نتیجہ برآمد کرنے کے لیے بعض سوالات قائم کیے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تحقیق میں اس بات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے کہ جو مفروضہ قائم کیا گیا ہے اس سے متعلق براہین، دلائل اور شواہد موجود ہیں یا نہیں جبکہ تنقید میں اس بات پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے جو مفروضہ قائم کیا جارہا ہے یا جس متن کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا جارہا ہے، اس سے ادب کے تقاضوں کی تکمیل ہورہی ہے کہ نہیں؟

محقق جس طرح کمزور دلائل اور شواہد کو اہمیت نہیں دیتا، اسی طرح نقاد بھی ادبی تقاضوں اور معیارات کے برخلاف متن پر اپنے نظریات کو نہیں تھوپا جاتا۔ جس طرح ایک محقق زیر نظر موضوع کے حصول کے تمام ذرائع، مطلوبہ مواد، اس مواد پر کی گئی سابقہ تحقیق، متن، اختلاف نسخ اور مستند روایات سے استفادہ کرنے کے بعد ہی کوئی نتیجہ برآمد کرتا ہے اسی طرح ایک نقاد تنقید کے وضع کردہ اصولوں کے تحت ادب پارے کا تجزیہ کر کے تعین قدر کرتا ہے۔ تحقیق اور تنقید کا عمل ایک ایسا عمل ہے جس میں دونوں فن سچائی اور صداقت کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ دونوں کا کام اپنے اپنے معیارات اور حدود میں رہتے ہوئے فن پارے کی قدر و قیمت متعین کرنا ہوتا ہے۔ دونوں کا مقصد حق کی آگہی اور سچ کی تلاش ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نگیندر تحقیق اور تنقید کے رشتے کی بابت لکھتے ہیں:

> ''لفظ انوسندھان (تحقیق) کا اصل مادہ ''دھا'' ہے جس میں ''سم'' کا سابقہ لگا کر سندھان لفظ بنتا ہے، اس کے معنی ہوئے نشانہ باندھنا اور ''الوچنا'' (تنقید) کا اصل مادہ ہے ''لوچ''، جس کے معنی ہیں دیکھنا۔ اسی اصل مادہ کے مفہوم کی بنیاد پر دونوں کے مروجہ مفہوم ہیں۔ آگے چل کر فرق ہوجاتا ہے۔ ایک کا مطلب ہے نشانہ باندھ کر اس کے پیچھے بڑھنا اور دوسرے کے معنی ہیں پوری طرح سے دیکھنا پرکھنا۔ یہی دونوں کا بنیادی فرق ہے۔ تحقیق میں حقائق کی دریافت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اور تنقید میں جانچنے پرکھنے پر

۔اگر چہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے غیر متعلق نہیں ہیں تاہم حقائق معلوم کرنے کا کام جانچ پرکھ کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا۔اسی طرح جانچنے پرکھنے کا عمل بھی پہلے حقائق کی دریافت سے شروع ہوتا ہے پھر بھی تحقیق اور تنقید کے میدان کی وسعت یکساں نہیں ہے۔''(ڈاکٹر سلطانہ بخش (مرتبہ)،اردو میں اصول تحقیق،2012،ص221)

تحقیق کا مطلب کسی چیز کی تفتیش کرنا یا نشانہ لگا کر کسی ہدف کا تعاقب کرنا جبکہ تنقید کے معانی میں دیکھنا شامل ہیں۔گویا تحقیق اور تنقید کے لغوی مفہوم کی بنیاد پر دونوں کے مروجہ مفہوم مشترک ہیں لیکن آگے چل کر دونوں میں فرق ہو جاتا ہے۔ایک کا مطلب ہے نشانہ باندھ کر اس کے پیچھے بڑھنا اور دوسرے کے معنی ہیں پوری طرح سے دیکھنا پرکھنا۔گویا تحقیق اور تنقید میں یہی بنیادی فرق ہے ۔تحقیق میں حقائق کی دریافت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے جبکہ تنقید میں جانچنے پرکھنے پر زیادہ زور صرف ہوتا ہے۔اگر چہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے غیر متعلق نہیں ہیں تاہم حقائق معلوم کرنے کا کام جانچ پرکھ کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔محقق اور نقاد دونوں ہی صداقت کی دریافت میں سرگرداں رہتے ہیں۔محقق کو زیادہ تر مواد سے تعلق ہوتا ہے جبکہ نقاد کو تخلیق سے۔محقق کو کسی شے کے وجود میں آنے کی فکر دامن گیر رہتی ہے،جبکہ نقاد کو محقق کے ذریعہ یکجا کیے گئے حقائق کی۔محقق اور نقاد دونوں ہی ادبی متن کا مطالعہ کرتے ہیں اور دونوں ہی تخلیق سے متعلق خارجی معلومات پر نظر رکھتے ہیں۔دونوں ہی حقائق کی بازیافت اور تعین قدر کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔

ادبی تحقیق اور ادبی تنقید کا کام علم وفضل کی بنیاد پر ایک دوسرے کی تکمیل کرنا ہے۔محقق کا کام کسی ادبی فن پارے یا متن کی تہہ میں جا کر پوشیدہ صداقتوں کو منصۂ شہود پر لانا ہوتا ہے جبکہ نقاد کا کام اس کی سچائیوں کو پرکھ کر تعین قدر کرنا ہوتی ہے۔البتہ یہ ضرور ہے کہ نقاد کا تعلق تخلیق اور اس کی مختلف جہتوں سے ہوتا ہے جب کہ تحقیق کسی فن پارہ کے وجود میں آنے کی علتوں اور اس کی تاریخ سے سروکار رکھتی ہے۔ایک مغربی نقاد جارج وہیلے کا کہنا ہے کہ کوئی سچا محقق تنقیدی مہارت کے بغیر کام نہیں چلا سکتا۔نقاد کو محقق بنے بغیر بغیر چارہ نہیں ورنہ تاثراتی نقاد ہو کر رہ جائے گا۔تحقیقی علم کے بغیر تنقید محض خیالی بات بن کر رہ جائے گی۔''مذکورہ باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے تحقیق اور تنقید کے بعض مماثلات وافتراقات کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

تحقیق وتنقید کے مماثلات:

(1) تحقیق اور تنقید دونوں ادب کے شعبے ہیں۔

(2) تحقیق اور تنقید ادب کی ضمنی شکلیں ہیں۔

(3) تحقیق اور تنقید میں حقائق کی تلاش،تعین قدر اور تجزیہ وتشریح مشترک ہیں۔

(4) دونوں کی نظریں حقائق پر مرکوز ہوتی ہیں۔

(5) دونوں میں تشریح،تعبیر،تاویل،تجزیہ اور تشریح شامل ہیں۔

(6) دونوں کا مدعا ادب کو سماج کے لیے مفید اور کارآمد بنا کر پیش کرنا ہے۔

تحقیق وتنقید کے افتراقات:

(1) تحقیق اور تنقید کا مادہ مختلف ہے۔ تحقیق کا مادہ ح ق ق ہے، جس کے معنی کسی چیز کی دریافت، حقائق کی بازیافت اور سچائی کی تلاش کے ہیں، جبکہ تنقید کے معنی محاسن ومعائب کا پتہ لگانے کے ہیں۔

(2) تحقیق کا منشا علم میں اضافہ ہے، جبکہ تنقید کا مقصد علم سے آگہی ہے۔

(3) تحقیق میں دریافت پر زور صرف کیا جاتا ہے اور تنقید میں جانچ پرکھ پر۔

(4) تحقیق اور تنقید کی بہت سی شکلیں ایک دوسرے کے دائرہ کار سے خارج ہیں۔

(5) تحقیق کے عمل میں سائنسی معروضیت ہوتی ہے، جبکہ تنقید میں اس کی اہمیت ثانوی ہے۔

(6) تحقیق کے ذریعہ ادب سے دلچسپی پیدا کرنے کی توقع نہیں کی جاسکتی، جبکہ تنقید ادب سے دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہے۔

(7) تحقیق' حقائق کی بنیاد پر نئے موقف قائم کرتی ہے، جبکہ تنقید ان موقف کا تجزیہ پیش کرتی ہے۔

(8) تحقیق' نئے اسرار کا انکشاف کرتی ہے، جبکہ تنقید تخلیق کی ماہیت کا انکشاف کرتی ہے۔

(9) تحقیق کا موضوع پوشیدہ چیزوں کو برآمد کرنا ہوتا ہے، جبکہ تنقید کا موضوع منکشف ہے۔

(10) تحقیق میں پہلے سے کوئی مقررہ معیار نہیں ہوتا، جبکہ تنقید میں معیارات موجود ہوتے ہیں۔

متذکرہ معروضات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ بعض تحقیق وتنقید کے درمیان بعض مماثلات اور افتراقات کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ محقق کو ہر حال میں معروضی طریقۂ کار اختیار کرنا ہوتا ہے، جبکہ نقاد اپنے دائرہ میں رہتے ہوئے موضوعی بھی ہوسکتا ہے۔ کوئی متن خواہ جدید عہد سے متعلق ہو یا ہزاروں سال قدیم ہو، دونوں کی صداقت وتعین قدر تنقیدی شعور کے بغیر ناممکن ہے۔ تحقیق اور تنقید کے فرق کو ڈاکٹر چندر بھان نے اس طرح واضح کرنے کی کوشش کی ہے:

(1) نقاد اپنی ذاتی پسند تک محدود رہ کر لکھ سکتا ہے۔ محقق ذاتی پسندیدگی سے اوپر اٹھ کر ہی کامیاب ہوسکتا ہے۔

(2) نقاد موضوعی (Subjective) رہ کر ہی لکھ سکتا ہے۔ محقق کو معروضی رہنا ضروری ہے۔

(3) محقق ایک مسئلہ پیش کرتا ہے اور اس کا ذہنی حل فراہم کرتا ہے۔ نقاد محض حقیقت کے انکشاف پر قانع ہوسکتا ہے اس کے لیے حل پیش کرنا ضروری نہیں۔

(4) محقق جملہ حقائق جمع کر کے ان کا تجزیہ کرتا ہے، نقاد کو جملہ حقایق پیشِ نظر رکھنا ضروری نہیں۔

(5) نقاد کا اصلی کام تشریح وتاویل ہے، محقق حقائق کی عملی طریقے سے تنظیم وگروہ بندی کرتا ہے۔

(6) نقاد کا مقصد تخلیق کے تخلیقی عمل اور اظہار کی جمالیات کو پرکھنا ہے۔ محقق کا مقصود اب تک کے علم میں اضافہ کرنا ہے۔ (شودھ پرودھی اور پرکریا، ص:16)

محقق کو بہر حال معروضی رہنا چاہیے جب کہ نقاد اپنی ترجیحات کی بنیاد پر موضوعی بھی ہوسکتا ہے۔ محقق کو کامیابی ذاتی پسند سے بلند ہو کر ملتی ہے جب کہ نقاد اپنی ذاتی پسند کے دائرے میں رہ کر بھی کامیاب ہوسکتا ہے۔ محقق کو ہمیشہ متعلقہ متن یا موضوع کے جملہ

حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے تجزیہ واحتساب کرنا چاہیے جب کہ نقاد کسی مخصوص حقیقت یا تصور نقد کو بنیاد بنا کر بھی احتساب قدر کرسکتا ہے۔ محقق کو اپنی تلاش وجستجو کی بنیاد پر متن یا موضوع سے متعلق دستیاب علم میں اضافہ کرنا چاہیے جب کہ نقاد کو تعبیر و تفہیم کی بنیاد پر نئے معنیاتی ابعاد پیش کرنا چاہیے۔

الغرض ادب میں تنقید اور تحقیق دونوں کی اہمیت مسلم ہے۔ تحقیق کے ذریعہ مستند حقائق سامنے آتے ہیں اور تنقید سے اس کے صحیح نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ تحقیق حقائق کی بازیافت اور ان کی تفتیش وتلاش کا کام کرتی ہے، جبکہ تنقید اس تحقیق کی مدد سے کسی فن پارے کے محاسن اور معائن کا پتہ لگا کر اس کی تعبیر وتشریح کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ محقق اصل مواد تک رسائی کے لیے تعینِ زمانہ، انتساب، داخلی اور خارجی شواہد اور روایات کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتا ہے، جبکہ نقاد کسی فن پارے کے متن کی بنیاد پر اس کے مشتملات، اسلوب اور اس کی ہیئت کو جانچتا ہے۔ اس طرح تنقید کے ذریعہ تحقیق کو بہتر اور کارآمد بنایا جاسکتا ہے۔ تحقیق اور تنقید کا چولی دامن کا ساتھ اس لیے بھی ہے کیونکہ صحیح حقائق کی عدم موجودگی میں تنقید بھی اپنا صحیح فیصلہ صادر نہیں کرسکتی۔ حنیف نقوی لکھتے ہیں:

> ''......محقق وقت کے لامتناہی سلسلے کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو دوبارہ جوڑنے اور تاریخ کی بھولی بسری سچائیوں کو ازسرِ نو منظّم ومربوط کرنے کا وہ اہم فریضہ انجام دیتا ہے جس کے بغیر نہ ہم اپنے تہذیبی تشخص کا عرفان حاصل کرسکتے ہیں اور نہ علوم وفنون کا کارواں نئی جہتوں سے آشنا اور نئے آفاق سے روشناس ہوسکتا ہے۔'' (حنیف نقوی، تحقیق وتدوین مسائل ومباحث، 2010، ص 11)

تحقیق اور تنقید کا مقصد ادب کی تفہیم ہے۔ دونوں ہی کے پیش نظر ادبی تخلیقات ہوتی ہیں اور اس طرح دونوں ہی کا کام قارئین کی رہنمائی کرنا ہوتا ہے۔ دونوں فن پاروں سے متعلق خارجی اور داخلی شواہد سے استفادہ کرتے ہیں۔ تحقیق کا مقصد جہاں کسی ادیب یا اس کی تخلیقات کو صحت کے ساتھ قارئین تک پہنچانا ہے وہیں تنقید بھی اس کی معاون کے طور پر ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

1.6 آپ نے کیا سیکھا

- چیزوں کے سلسلے میں تلاش وتحقیق اور چھان پھٹک انسان کا فطری خاصہ ہے۔
- شکوک/تشکیک کو تحقیق میں بہت اہمیت حاصل ہے۔
- کسی مخصوص چیز یا شخص یا اس سے متعلق غور وفکر اور تلاش کا عمل 'تحقیق' کہلاتا ہے۔
- 'تحقیق' حقائق کی بازیافت کا نام ہے۔
- تحقیق اور تنقید ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کا درجہ رکھتے ہیں۔
- تحقیق میں کوئی بھی منزل حرف آخر نہیں ہوتی، مرورِ ایام کے ساتھ اس میں نئی نئی شقیں نکال کر تحقیقی پہلو نکالا جاسکتا ہے۔
- ادبی تحقیق میں کتب، قدیم وکلاسیکی متون، مخطوطے، علمی اسناد، منابع ومصادر، ماہرین کے آراء ونظریات اور کتب خانوں کی

محدود فضا میں تلاش وجستجو کر کے حقائق کی تفتیش کر کے ان سے معلومات افزا نتائج کا استخراج کیا جاتا ہے۔ کتابی تحقیق میں تحریری مآخذ و مصادر زیادہ کارآمد اور معاون ثابت ہوتے ہیں۔

- تحقیق میں کسی فن پارے کے اصل متن کی سچائیاں تلاش کی جاتی ہیں جبکہ تنقید میں اس کی معنویت پر زور دیا جاتا ہے۔
- تحقیق کے ذریعہ ادب سے دلچسپی پیدا کرنے کی توقع نہیں کی جاسکتی، جبکہ تنقید ادب سے دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہے۔
- تحقیق اور تنقید کا مقصد ادب کی تفہیم ہے۔ دونوں ہی کے پیش نظر ادبی تخلیقات ہوتی ہیں اور اس طرح دونوں ہی کا کام قارئین کی رہنمائی کرنا ہوتا ہے۔

1.7 اپنا امتحان خود لیجئے

سوال 1: تحقیق کے لغوی معنی بتاتے ہوئے اس کی مبادیات پر روشنی ڈالئے؟

سوال 2: تحقیق کے اصطلاحی معنی بیان کرتے ہوئے تحقیق وتنقید کے رشتے پر روشنی ڈالئے۔

سوال 3: بنیادی طور پر تحقیق کی کتنی قسمیں ہیں؟

سوال 4: تحقیق وتنقید کی بنیاد کیا ہے؟

سوال 5: تحقیق وتنقید کا منشا کیا ہے؟

1.8 سوالات کے جوابات

جواب 1: تحقیق کے لغوی معنی تلاش، تفتیش، دریافت، کھوج اور چھان بین کے ہیں۔ اس کے تحت کسی خاص تصور، خیال، فکر، موضوع یا مسئلے سے متعلق نئے حقائق کی تلاش بھی کی جاتی ہے اور موجودہ حقائق کی تصدیق یا تردید کر کے ایسے منطقی نتائج اخذ کیے جاتے ہیں تا کہ موجودہ علم میں اضافہ ہو جائے۔ تحقیق کا یہ عمل انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے۔ زندگی کے عام مسائل سے لے کر خاص مسائل تک، چاہے اسے اُن مسائل میں دلچسپی ہو یا نہ ہو، البتہ اگر ان مسائل میں انسان کو دلچسپی ہے تو وہ اس کو ہر زاویہ سے دیکھتا اور تفتیش کرتا ہے کہ آخر یہ کیوں ہے؟ اور اگر ہے تو کیسے ہے؟ اس طرح اس کے دماغ میں نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں، جو شکوک کہلاتے ہیں۔ دراصل یہ شکوک ہی تحقیق کی مبادیات ہیں۔ اگر کسی موضوع، فکر، خیال اور مسئلے کے متعلق انسان کے دل میں شکوک پیدا ہو رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ ان شکوک کو دور کرنے کا جذبہ بھی اس کے اندر پیدا ہوگا اور جب وہ ان شکوک کو دور کر لے گا تو وہ کسی نتیجہ پر پہنچ جائے گا اور نتیجہ پر پہنچنا ہی تحقیق ہے۔

تحقیق اپنے زیرِ بحث موضوع سے متعلق تمام آماخذ کا پوری دیانت داری اور تلاش وجستجو کے ساتھ مطالعہ کرنے کا نام ہے۔ تحقیق میں ضروری ہے کہ موضوع کے تمام پہلوؤں کا مکمل نظم و ضبط اور صبر وتحمل نیز دیانت داری کے ساتھ جائزہ لیا جائے۔ اس طرح کے طریقہ کار سے بآسانی صحیح نتائج تک رسائی ہوسکتی ہے۔ تحقیق میں کسی علمی مسئلہ، سائنسی فکر اور سماجی

نکتہ کو پیش کیا جاتا ہے یا کوئی نئی بات سامنے لائی جاتی ہے۔لیکن ضروری نہیں کہ تحقیق میں جو بات پیش کی جائے وہ نئی ہی ہو۔ ماقبل میں کہی گئی بات اگر تشنہ ہے یا اس میں کوئی خامی اور کجی رہ گئی ہے تو اس کی تحقیق کر کے حقائق تک پہنچا جا سکتا ہے۔

جواب 2: تحقیق میں کسی خاص تصور، خیال، فکر، موضوع یا مسئلے سے متعلق نئے حقائق کی تلاش بھی کی جاتی ہے۔'تحقیق' حقائق کی بازیافت کا نام ہے۔تحقیق اپنے زیرِ بحث موضوع سے متعلق تمام مآخذ کا پوری دیانت داری اور تلاش وجستجو کے ساتھ مطالعہ کرنے کا نام ہے۔تحقیق میں ضروری ہے کہ موضوع کے تمام پہلوؤں کا مکمل نظم وضبط اور صبر وتحمل نیز دیانت داری کے ساتھ جائزہ لیا جائے۔اس طرح کے طریقہ کار سے بآسانی صحیح نتائج تک رسائی ہو سکتی ہے۔تحقیق میں کسی علمی مسئلہ، سائنسی فکر او رسماجی نکتہ کو پیش کیا جاتا ہے یا کوئی نئی بات سامنے لائی جاتی ہے۔لیکن ضروری نہیں کہ تحقیق میں جو بات پیش کی جائے وہ نئی ہی ہو۔ ماقبل میں کہی گئی بات اگر تشنہ ہے یا اس میں کوئی خامی اور کجی رہ گئی ہے تو اس کی تحقیق کر کے حقائق تک پہنچا جا سکتا ہے۔تحقیق میں کوئی بھی منزل حرف آخر نہیں ہوتی، مرورِ ایام کے ساتھ اس میں نئی نئی شقیں نکال کر تحقیقی پہلو نکالا جا سکتا ہے۔تحقیق کا مقصد کسی نامعلوم خیال، فکر اور مسئلہ کے سلسلے میں حقائق کی تلاش ہی نہیں بلکہ معلوم حقائق کی توسیع بھی ہے۔ تحقیق میں معلوم حقائق کی خامیوں کی تصحیح بھی کی جاتی ہے اور اس کی تردید کر کے نئے معانی نکالے جاتے ہیں۔اس طرح دونوں ہی صورتوں میں علم میں اضافہ ہوتا ہے اور نئے امکانات واضح ہوتے ہیں۔تحقیق سے لاینحل مسائل کا حل پیش کیا جاتا ہے۔

تحقیق میں کسی فن پارے کے اصل متن کی سچائیاں تلاش کی جاتی ہیں جبکہ تنقید میں اس کی معنویت پر زور دیا جاتا ہے۔کسی فن پارے کے سلسلے میں محقق کو تلاش وجستجو، تفتیش وتصدیق تو کرنا ہی ہوتی ہے ساتھ ہی ساتھ اسے اس فن پارے میں معنویت بھی تلاش کرنا ہوتی ہے۔لہٰذا تحقیق کے ساتھ معنویت کی تلاش ہی تحقیق وتنقید کے رشتے کو مستحکم بناتی ہے۔ایک محقق جب کسی مواد کو تلاش کر کے اس کی صداقت کے معیار متعین کرتا ہے تو اس کے پیش نظر اس کے محاسن اور معائب بھی ہوتے ہیں جو تنقید کی اولین منزل ہے۔اس کے برعکس جب ایک نقاد اپنی تنقیدی بصیرت کی بنیاد پر کسی فن پارے میں محاسن ومعائب تلاش کر کے اس کے تعین قدر کا فریضہ انجام دے رہا ہوتا ہے تو اس کے پیش نظر فن پارے کی صداقت اور حقیقت بھی ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ تحقیق کو تنقید کے بغیر اور تنقید کو تحقیق کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔

جواب 3: بنیادی طور پر تحقیق کی دو قسمیں ہیں: (1) میدانی تحقیق، میدانی تحقیق کا دائرہ اپنے اندر بہت وسعت رکھتا ہے۔اس تحقیق کا تعلق سماج میں رونما ہونے والے عام مسائل سے ہے۔سماج و معاشرے میں موجود خارجی اشیاء کی تلاش وجستجو، عینی مشاہدات، مظاہر قدرت کی تحقیق، اشیاء اور افراد کے سلسلے میں کسی چیز کی تلاش وتفتیش اور اس سے برآمد ہونے والے نتائج میدانی تحقیق کے دائرہ کار میں آتے ہیں۔میدانی تحقیق کے لیے ضروری ہے کہ محقق اپنے اردگرد کے مقامات کی سیر کر کے اپنے تجربات ومشاہدات کے ذریعہ نتائج اخذ کرے۔

(2) تحقیق کی دوسری قسم کتابی تحقیق ہے۔کتابی تحقیق ہی دراصل ادبی تحقیق کے نام سے جانی جاتی ہے۔تحقیق ایک جامع اور

وسیع پیمانے پر کیا جانے والا عمل ہے۔ کتابی تحقیق میں کتب، قدیم وکلاسیکی متون، مخطوطے، علمی اسناد، منابع ومصادر، ماہرین کے آراء ونظریات اور کتب خانوں کی محدود فضا میں تلاش وجستجو کر کے حقائق کی تفتیش کر کے ان سے معلومات افزا نتائج کا استخراج کیا جاتا ہے۔ کتابی تحقیق میں تحریری مآخذ ومصادر زیادہ کارآمد اور معاون ثابت ہوتے ہیں۔

جواب 4: تحقیق وتنقید کی بنیاد فن پارہ پر ہوتی ہے۔ یعنی پہلے کسی فن پارہ کی تخلیق عمل میں آتی ہے اس کے بعد ہی اس کی تحقیق اور اس پر تنقید کے اصول منضبط ہوتے ہیں۔ پہلے کسی فن پارہ کی تخلیق عمل میں آتی ہے اس کے بعد ہی اس کی تحقیق اور اس پر تنقید کے اصول منضبط ہوتے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں کی بنیاد تخلیق پر ہے۔ لہٰذا جب تک تحقیق وتنقید میں باہم ربط وہم آہنگی نہیں ہوگی اس وقت تک نہ ہی اچھی تخلیق کی توقع کی جاسکتی ہے اور نہ ہی بامعنی قرأت کی۔ اس طرح تخلیق اصل شے ہوئی اور تحقیق وتنقید ثانوی کیوں کہ ان دونوں کا وجود تخلیق کے بغیر ناممکن ہے۔ تحقیق دراصل تلاش وجستجو کی مدد سے حقائق کی بازیافت اور کھرے کھوٹے میں تمیز کا نام ہے نیز اشیاء کی ماہیت ونوعیت کی تصدیق بھی تحقیق کے ذریعہ ہوتی ہے وہیں تنقید کسی چیز، خیال یا فکر معائب ومحاسن میں تمیز پیدا کرنے کا نام ہے۔ ایلیٹ نے اپنے مضمون میں تخلیقی اور تنقیدی رشتے پر اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ شاید درحقیقت ایک مصنف کی اپنی تصنیف کے سلسلے میں محنت شاقہ کا بڑا حصہ تنقیدی محنت کا ہوتا ہے یعنی چھاننے، جوڑنے، تعمیر کرنے، خارج کرنے، صحیح کرنے، جانچنے کی محنت یہ اذیت ناک محنت جتنی تنقیدی ہوتی ہے اتنی ہی تخلیقی ہوتی ہے۔

جواب 5: تحقیق کا منشا علم میں اضافہ ہے، جبکہ تنقید کا مقصد علم سے آگہی ہے۔ ادبی تحقیق اور ادبی تنقید کا کام علم وفضل کی بنیاد پر ایک دوسرے کی تکمیل کرنا ہے۔ یعنی محقق کا کام کسی ادبی فن پارے یا متن کی تہہ میں جا کر پوشیدہ صداقتوں کو منصۂ شہود پر لانا ہوتا ہے جبکہ نقاد کا کام اس کی سچائیوں کو پرکھ کر تعین قدر کرنا ہوتی ہے۔

ادبی تحقیق اور ادبی تنقید کا کام علم وفضل کی بنیاد پر ایک دوسرے کی تکمیل کرنا ہے۔ محقق کا کام کسی ادبی فن پارے یا متن کی تہہ میں جا کر پوشیدہ صداقتوں کو منصۂ شہود پر لانا ہوتا ہے جبکہ نقاد کا کام اس کی سچائیوں کو پرکھ کر تعین قدر کرنا ہوتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ نقاد کا تعلق تخلیق اور اس کی مختلف جہتوں سے ہوتا ہے جب کہ تحقیق کسی فن پارہ کے وجود میں آنے کی علتوں اور اس کی تاریخ سے سروکار رکھتی ہے۔ ایک مغربی نقاد جارج وھیلے کا کہنا ہے کہ کوئی سچا محقق تنقیدی مہارت کے بغیر کام نہیں چلا سکتا۔ نقاد کو محقق بنے بغیر بغیر چارہ نہیں ورنہ تاثراتی نقاد ہو کر رہ جائے گا۔ تحقیقی علم کے بغیر تنقید محض خیالی بات بن کر رہ جائے گی۔''

1.9 فرہنگ

الفاظ	معانی
مشاہدات	مشاہدہ کی جمع، دیکھنا، دید، نظارہ، درشن
پردۂ خفا	پوشیدگی، چھپانے کا عمل، سربستگی

انہماک	محویت، شغف، استغراق، انتہائی مشغولیت
تشکیک	شک میں ڈالنا، دوسرے کو شک میں ڈالنا
بازیافت	دوبارہ حصول، گمشدہ چیز کا ملنا، منتقل شدہ زمین کا ضبط کر لینا
اسناد	سند کی جمع، دستاویزات، سرٹیفکٹ
منابع	منبع کی جمع، نکلنے کی جگہ، پانی کے نکلنے یا پھوٹنے کی جگہیں، چشمے، سوتے
مصادر	مصدر کی جمع، ذرائع، اسباب، بنیادیں، جڑیں
تدارک	تلافی، بدلہ، مکافات، گم شدہ چیز کا پانا
انقطاع	کٹ جانا، قطع ہونے کیا عمل، علیحدگی، منقطع ہونا
تنسیخ	باطل قرار دینا، کالعدم کرنا، مٹانا، نیست و نابود کرنا
مماثلات	مماثل کی جمع، مانند، مثل، نظیر، مشابہ، ملتا جلتا، ہم شکل، مترادف
افتراقات	افتراق کی جمع، جدائی، دوری، فصل، کنارہ کشی

1.10 کتب برائے مطالعہ

1. مبادیات تحقیق عبدالرزاق قریشی انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی 2014
2. اردو میں ادبی تحقیق ڈاکٹر سلطانہ بخش مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد 1986
3. تحقیق کا فن گیان چند جین اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ 2009
4. ادبی تحقیق مسائل و تجزیہ رشید حسن خاں اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1990
5. آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی اردو اکادمی، دہلی 1990

اکائی:2 تحقیق کی تعریف،اہمیت وافادیت

2.1 اغراض ومقاصد
2.2 تمہید
2.3 تحقیق کی لغوی تعریف
2.4 تحقیق کی اصطلاحی تعریف
2.5 تحقیق کی قسمیں
2.6 اہمیت وافادیت
2.7 تحقیق کے مقاصد
2.8 آپ نے کیا سیکھا
2.9 اپنا امتحان خود لیجئے
2.10 سوالات کے جوابات
2.11 فرہنگ
2.12 کتب برائے مطالعہ

1.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- تحقیق کی لغوی تعریف جان سکیں گے۔
- مختلف علماء کے بیانات کے حوالے سے تحقیق کا مفہوم سمجھ سکیں گے۔
- مقاصد،نوعیت،موضوع کے اعتبار سے تحقیق کی قسموں سے آگاہ ہوں گے۔
- تحقیق کے مقاصد سے واقف ہوجائیں گے۔
- تحقیق کی اہمیت سے بہرہ ور ہوں گے۔
- روزمرہ زندگی میں تحقیق کی افادیت معلوم ہوجائے گی۔

2.2 تمہید

کسی شے،مسئلہ یا امر کے متعلقصحت ودرستگی،سچائی وصداقت اوراستواری وپائیداری کے ساتھ تلاش وتفیش کا نام تحقیق ہے۔
لفظ تحقیق اپنے تمام تر معنوں میں صدق وسچائی،واقعہ کے اصل سے مطابق ہونے اوراستحکام وپائیداری کے معنی ومفہوم کا متقاضی ہوتا

ہے۔کسی شے یا واقعہ کی تحقیق کے معانی و مفاہیم کو مختلف تعبیرات میں پیش کیا جاسکتا ہے مثلاً کسی چیز کو ثابت و مستحکم کرنا، کسی چیز یا متن کی درستگی کو ثابت کرنا، کسی مطلب کے سچ ہونے کو ظاہر کرنا یعنی تحقیق اپنے تمام تر معنوں میں حقائق کی شناخت کا نام ہے۔تحقیق دراصل کسی حق ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔یعنی درست مطلب کے حصول کی خاطر فکری اور علمی کاوش، تلاش و جستجو اور اس کے اثبات نیز پیش کرنے کا نام تحقیق ہے۔تحقیق میں کسی شے کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی سعی کی جاتی ہے، اس کی بنیاد تلاش و جستجو، مشاہدات وتجربات اور علوم کے افہام و تفہیم پر ہوتی ہے۔تحقیق کی یہ کوشش کبھی کامیاب ہوجاتی ہے اور کبھی ناکام بھی، لیکن تحقیق کا مسلسل عمل اس کو کامیابی سے ہمکنار کردیتا ہے۔تحقیق سے نئی دریافتیں، نئے حقائق اور نئے انکشافات بھی جنم لیتے ہیں اور مروجہ ایجادات، انکشافات اور نظریات پر نظر ثانی بھی کی جاتی ہے اور ان کی اثرات تلاش کر کے صحیح تاویلیں بھی پیش کی جاتی ہیں۔تحقیق کی بدولت ہی نت نئی ترقیات اور حیرت انگیز ایجادات ہورہی ہیں۔یہ سب انسان کی اسی فکری گہرائی اور غور و فکر کا نتیجہ ہیں جس کا مرکز و محور تحقیق ہے۔

2.3 تحقیق کی لغوی تعریف:

پانچ حرفوں پر مشتمل عربی کا لفظ 'تحقیق' جس کا مادہ ح+ق+ق ہے، باب تفعیل کا مصدر ہے اور حقّق، یحقّق، تحقیقاً سے ماخوذ ہے۔حق باطل کی ضد ہے۔اس کے لغوی معنی تفتیش، تلاش، کھوج، دریافت اور چھان بین کے ہیں یعنی حقائق کی تلاش کا نام تحقیق ہے۔تحقیق کے مترادفات میں راست، صحیح، درست، سچ مچ، تصدیق، ثبوت، مسلم، تسلیم کردہ، یقین، اعتبار، چھان بین، تلاش، تجسس، تفتیش، کھوج، سراغ، پتا، دریافت، پوچھ گچھ، جانچ، شناخت، معتبر، پختہ، واثق، قابلِ اعتبار، امتحان اور تجربہ جیسے الفاظ شامل ہیں۔اس سلسلے میں عربی کی مشہور لغت ''لسان العرب'' کے مولف ابن منظور الافریقی لکھتے ہیں:

> ''حق باطل کی ضد ہے اور اس کی جمع حقوق آتی ہے، الواسحاق فرماتے ہیں حق سے مراد نبی اکرامؐ کی بات ہے جو کہ حق ہے اور اس کے معنیٰ ''ثابت ہونا'' ہے۔اور حق بات یقینی امر میں ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے 'بَل نقذِفُ بِا لحقّ عَلَی الباطِل' 'ہم حق کے ذریعے باطل کو مٹا دیں گے'۔'' (لسان العرب، جلد10، ص79)

تاج العروف کے مولف لفظ 'تحقیق' کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

> ''حقیقت الامر' کسی معاملے کی تحقیق کرنا یعنی بات کرنا، مراد ہے مکمل یقین ہوجانا اور کسی شے کی حقیقت وہ ہوتی ہے جو یقینی طور پر ثابت ہو اور اہلِ لغت کے نزدیک اپنی اصل معنی میں استعمال ہوا ہے اور کسی چیز کی حقیقت اس کا خالص ہونا ہوتا ہے اور کسی معاملے کی حقیقت سے مراد اس کی یقینی صورتِ حال ہوتی ہے۔'' (زبیری، تارج العروف من جواہر القاموس، جلد13، 1994، ص:79)

تحقیق کے معانی و مفاہیم میں صحیح، درست، سچ مچ، ٹھیک، واقعی طور پر، تصدیق، ثبوت، دراصل، درحقیقت، یقین، ضرور، بے

شک، یقیناً، چھان بین، پہچان، تلاش، دریافت، پوچھ گچھ، جانچ، امتحان اور تجربہ وغیرہ معانی شامل ہیں۔ 'تحقیق' باطل، جھوٹ، غلط، لایعنیت اور تشکیک کی ضد ہے۔ تحقیق کے لغوی معنی کی وضاحت سید عبداللہ کے الفاظ میں:

''تحقیق کے لغوی معنی کسی شے کی حقیقت کا اثبات ہے۔ اصطلاحاً یہ ایک ایسے طرزِ مطالعہ کا نام ہے جس میں موجود مواد کے صحیح یا غلط کو بعض مسلمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔ تاریخی تحقیق میں کسی امر واقعہ کے وقوع کے امکان وانکار کی چھان بین مدنظر ہوتی ہے۔'' (تحقیق وتنقید، مشمولہ اردو میں ادبی تحقیق، جلد اول، مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، 1986، ص:29)

جبکہ مالک رام لکھتے ہیں:

''تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے، اس کا مادہ ح ق ق جس سے معنی ہیں کھرے کھوٹے کی چھان بین یا بات کی تصدیق کرنا۔ دوسرے الفاظ میں تحقیق کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے علم وادب میں کھرے کو کھوٹے سے، مغز کو چھلکے سے، حق کو باطل سے الگ کریں۔ انگریزی لفظ ریسرچ کے بھی یہی معنی اور مقاصد ہیں۔'' (مالک رام، اردو میں تحقیق، رہبر تحقیق، 1976، ص:55)

عربی-اردو ڈکشنری ''مصباح اللغات'' میں تحقیق کے معنی اس طرح درج ہیں:

حَقّقَه': تاکید کرنا، واجب کرنا، حقّقَ القولَ والظن: تصدیق کرنا، تحقّقَ الخبر: ثابت ہونا، یقین کرنا، الحقیقة: وہ چیز جس کی حمایت واجب ہو، کہا جاتا ہے ''هُوَ حَامِي الحقيقَةَ، وهُو مَن حِمَا ةَ الحقائق'' یعنی وہ اُس چیز کی حفاظت کرتا ہے جس کا دفاع اس کے ذمے لازم ہے، وہ لفظ جو اپنے موضوع لہٗ میں مستعمل ہو، حَقِيقَةَ الشئ، چیز کا منتہا اور اصل، جمع حقائق۔ (مصباح اللغاتِ ابو الفضل عبد الحفیظ بلیاوی، ص166)

تحقیق کے لیے انگریزی میں 'Research' کی اصطلاح ہے، جو فرنچ لفظ 'Recherche" سے لیا گیا ہے۔ اس کے معنی 'پیچھے جا کر تلاش کرنے' کے ہیں۔ انگریزی لفظ 'Search' فرنچ لفظ 'Cherche' سے ماخوذ ہے جس کا ماخذ لاطینی لفظ 'Circare' ہے۔ اس کے معنی 'گھومنا پھرنا' کے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ریسرچ کے مخصوص معنوں میں گھوم پھر کر تلاش کرنا یا دوبارہ تلاش کرنا بھی شامل ہیں۔

سیویرنس (Severance) کے مطابق:

''Research is finding out something to the

known...Research is the process of discovering something new,"

''تحقیق حقیقت کی دریافت کے ذریعہ علم میں اضافہ کرنے کا نام ہے......تحقیق کچھ نیا تلاش کرنے کا عمل ہے۔''

John C.Almack in Research and Thesis Writing,1930,Riverside, Press,Cambridge U.S.A,P.12

تحقیق کی لغوی تعریف کرتے ہوئے گیان چند جین لکھتے ہیں:

''تحقیق کے لغوی معنی حق کو ثابت کرنا، حق کی طرف پھیرنا، کسی چیز کی کھوج کرنا یا کسی شے کی حقیقت کو ثابت کرنا ہے۔ تحقیق کا انگریزی مترادف Research ہے۔ رابرٹ راس کے مطابق Research فرنچ زبان کے لفظ Rechercher سے نکلا ہے جس کے معنی پیچھے جا کر تلاش کرنا ہے۔ انگریزی لفظ Search کا ماخذ فرنچ لفظ Chercher ہے جو لاطینی زبان کے لفظ Circare سے ماخوذ ہے، جس کے معنی گھومنا پھرنا ہے۔ اس طرح Research کے معنی ہوئے گھوم پھر کر تلاش کرنا۔'' تحقیق کا فن، گیان چند جین، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1990، ص:30)

2.4 تحقیق کی اصطلاحی تعریف

تحقیق کی تمام تر لغوی تعریفات سے بہت حد تک اس کے معانی کی وضاحت ہو چکی ہے۔ اصطلاحی معنوں میں 'تحقیق' اس محتاط اور باضابطہ عمل کو کہتے ہیں جس کے تحت کسی خاص تصور، خیال، فکر، موضوع یا مسئلے سے متعلق نئے حقائق کی تلاش یا موجودہ حقائق کی تصدیق یا تردید کی جاتی ہے۔ تحقیق سے ایسے منطقی نتائج اخذ کیے جاتے ہیں جن سے غیر موجود علم کی تلاش ہوتی ہے اور موجودہ علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک انگریزی لغت کے اعتبار سے تحقیق محتاط یا سرگرم تلاش، اور گہری جستجو کا نام ہے۔ انہماک کے ساتھ جستجو یا چھان بین، بالخصوص یا عموماً ناقدانہ سیر حاصل تفتیش یا جستجو جس کا مقصد نئے حقائق کا انکشاف اور ان کی صحیح تاویل اور پھر نئے حقائق کے انکشاف کی روشنی میں مروجہ نتائج، نظریات یا قوانین پر نظر ثانی کرنا یا نظر ثانی کیے ہوئے نتائج کا عملی استعمال وغیرہ نیز کسی شخصیت یا مضمون یا اسی قبیل کی کسی دوسری چیز سے متعلق مخصوص چھان بین، جس کے ذریعے چھان بین کرنے والا اپنا انکشاف پیش کرے۔ آکسفورڈ ڈکشنری نے تحقیق کے درج ذیل نتائج برآمد کیے ہیں:

(1) کسی مخصوص چیز یا شخص سے متعلق گہری یا محتاط تلاش کا عمل

(2) کسی حقیقت کے انکشاف کی غرض سے محتاط غور و فکر یا کسی مضمون کے مطالعہ کے ذریعہ تلاش یا چھان بین، ناقدانہ یا سائنسی سلسلۂ تلاش

(3) کسی مضمون کی چھان بین یا مسلسل مطالعہ

(4) دوسری بار یا بار بار کی تلاش

تحقیق کی تعریف کرتے ہوئے قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

''تحقیق کسی امر کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے، کوشش کا لفظ ارادتاً مستعمل ہوا ہے، وجہ یہ کہ دیکھنا اور دیکھنے کی کوشش ایک نہیں۔ کوشش کامیاب بھی ہوتی ہے اور ناکام بھی۔ ناکامی کبھی جزوی ہوتی ہے کبھی کلّی۔'' (عبدالستار دلوی (مرتبہ) ادبی اور لسانی تحقیق، 1984، بمبئی یونیورسٹی، ممبئی، ص 77)

جمیل جالبی نے تحقیق کے معنی کچھ اس طرح بیان کیے ہیں:

''تحقیق کے معنی ہیں کسی مسئلے یا کسی بات کی کھوج لگا کر اس طور پر اس کی تہ تک پہنچنا کہ وہ مسئلہ یا وہ بات اصل شکل اور حقیقی روپ میں پوری طرح سامنے آجائے۔ یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اصل مسئلہ کیا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ایسا کیوں ہے...... تحقیق کا کام سچ کو جھوٹ سے، صحیح کو غلط سے الگ کر کے اصل حقیقت کو دریافت کرنا ہے...... حقیقت اور سچائی کی تلاش تحقیق کا کام ہے۔'' (جمیل جالبی، ادبی تحقیق، 1996، ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص 11)

مندرجہ بالا تعریفات کی رو سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ 'تحقیق' کسی مخصوص چیز یا شخص سے متعلق گہری یا محتاط تلاش کا عمل ہے۔ تحقیق میں کسی حقیقت کے انکشاف کی غرض سے محتاط غور و فکر سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون کے مطالبہ کے تلاش یا چھان بین نیز ناقدانہ یا سائنسی تلاش کا عمل تحقیق کہلاتی ہے۔ منظّم طریق کار اور حق کو باطل سے الگ کرنا ہی تحقیق ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین فرماتے ہیں:

''ریسرچ ایک حقیقت پنہاں یا حقیقت مبہم کو افشا کرنے کا باضابطہ عمل ہے۔'' (تحقیق کا فن از گیان چند جین، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو، دوسرا ایڈیشن 2009، ص 3)

تحقیق کے لیے ہندی میں 'انوسندھان' (vul/kku) کا لفظ رائج ہے، اس کا مادہ 'دھا' ہے جس کے معنی برقرار رکھنا، چھان بین، جانچ پڑتال، اور جائزہ کے ہیں۔ 'سندھان (l/kku)' کا مطلب ہے سمت، لکش (ہدف)، یعنی مقصود برقرار رکھنا یا نشانہ لگانا، جبکہ 'انو' (vu) کے معنی تعاقب کرنے یا پیچھے چلنے کے ہیں۔ اس طرح 'انوسندھان' کا مطلب ہوا 'کسی مقصد کو سامنے رکھ کر اس کا تعاقب کرنا' یعنی سچائی کے لیے اشیاء کے پیچھے چلنا۔ انوسندھان کے ایک معنی ٹوٹے بکھرے دھاگوں کو جوڑنا بھی ہے۔

ہندی لفظ شودھ کا مادہ شدھ یا خالص ہے۔ شودھ کے معنی میل دور کر کے خالص کرنا، صاف کرنا جیسے کسی دھات وغیرہ کو۔

ہندی میں تحقیق کے لیے ایک لفظ 'انویشن' (vuo"k.k) بھی مستعمل ہے۔ اس کا مادہ ایش بہ یائے معروف ہے۔ ایش یا ایشا

کے معنی تمنا یا چاہنا ہیں، انو کے معنی پیچھے یعنی کسی تمنا کا پیچھا کرنا۔ اگر اس کا مادہ ایش بہ فتحہ اول تسلیم کیا جائے تو ایش کے معنی جاننا کے ہیں یعنی جانکاری کے پیچھے جانا یعنی کسی تمنا کا پیچھا کرنا۔ اگر اس کا مادہ ایش بہ فتحہ اول مانا جائے تو ایش کے معنی جاننا کے ہیں یعنی جان کاری کے پیچھے جانا۔ اس کے معنی بھی کسی شے یا حقائق کی تلاش کے ہیں۔

ہندی میں ایک لفظ 'گویشن' (xo"k.k) بھی اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے یعنی گائے کو پانی کی خواہش۔ ان سب کے اصطلاحی معنی کھوجنے اور تلاش کرنے کی کوشش کے ہیں۔ ان میں صرف انوسندھا اور شودھ کا چلن عام ہے۔ ڈاکٹر ناگیندر کہتے ہیں کہ خلفشار کو چھوڑ کر محض ایک اصطلاح طے کر لینی چاہیے۔ ان کی رائے میں انوسندھان مناسب ترین اصطلاح ہے۔ ڈاکٹر ناگیندر لکھتے ہیں:

fgUnh e ^fjlp^ d fy, vul/kku] vUo'k.k] "kk/k rFkk [kkt vkfn vud
'kCnk dk i;kx gkrk gA ;gk LFkyr% ; lHkh 'kCn ik;% iFkk; gh eku
tkr g] ijUr lLØr e bld vFkh e l{e vRrj gA vul/kku dk vFk
g ifjiPNk] ijh{k.k] leh{k.k vkfnA l/kku dk vFk gA
fn"kk fo"k'k e ioRr djuk ;k gkuk vkj vu dk vFk g ihNk ; bl
idkj vul/kku dk vFk gvk&l"pknxeu vFkkr fdlh r"; dh ikflr d
fy, ifjiPNk] ijh{k.k vkfn djukA

(شودھ اور سدھانت مشمولہ ''انوسندھان کا سوروپ''، نیشنل پبلیشنگ ہاوس، ص3)

مذکورہ بالا جامع تعریفوں کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ تحقیق نام ہے:

نامعلوم حقائق کی تلاش اور

معلوم حقائق کی توسیع یا ان کی خامیوں کی تصحیح

تحقیق کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے، یہ کبھی ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کا دائرہ کار مزید وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ مثلاً دوران تحقیق ہم محسوس کرتے ہیں کہ ایک سوال کے بعد دوسرا سوال جنم لے رہا ہے۔ یہ سوال نئے خیالات، تصورت، تجزیات اور بہتر صورت حال کا اشارہ ہوتے ہیں، جو بعد میں ایک بہترین اور متاثر کن اور توقع کے مطابق خاصے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ تحقیق حقائق کی تلاش کا نام ہے، جو اہلِ علم کو ان کی کوتاہیوں اور لغزشوں سے آگاہ کر کے ان کی اصلاح کرتی ہے۔ حقیقت کی اس تلاش اور چھان بین سے ماضی کے وہ اہم گوشے آشکار ہو جاتے ہیں جن پر گردشِ ایام کی دھول پڑ چکی ہوتی ہے۔ گویا تحقیق کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ:

- تحقیق کی بنیاد تشکیک، تجسس، آمادگی اور تجربات و شواہد پر استوار ہوتی ہے۔
- تحقیق کسی موضوع یا مسئلے سے متعلق نامعلوم یا پوشیدہ حقائق کی از سرِ نو تلاش یا تلاش شدہ حقائق کی بازیافت ہے۔
- تحقیق میں نامعلوم حقائق کی دریافت کے ساتھ ہی مسلمات کی نئی تعبیر و تشریح بھی کی جاتی ہے۔
- ہر تحقیقی عمل میں مخصوص سائنسی طریقہ کار اختیار کیا جاتا ہے۔
- تحقیق سے اصول و نظریات کی تشکیل و تربیت میں مدد ملتی ہے۔
- تحقیق مسائل کا حل تلاش کرنے میں مدد کرتی ہے۔

لغوی اعتبار سے لفظ 'تحقیق' زیادہ بامعنی اور متنوع ہے نیز اپنے اندر تحقیق کے اصطلاحی مفہوم کو سمیٹتا نظر آتا ہے لیکن اصطلاحی طور پر یہ لفظ کہیں زیادہ وسیع اور معانی سے بھرپور ہے۔ یہ لفظ پوشیدہ حقائق کی تلاش تک ہی محدود نہیں بلکہ منصوبہ بند اور باضابطہ طریقے سے معلومات کو یکجا کرنے کا نام ہے۔اس کے ذریعے مسائل کے قابلِ اعتبار حل تک پہنچ کر معلومات کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور پھر اس کی توجیہ اور تعبیر کی جاتی ہے۔تحقیق کے ذریعے علوم کو دریافت کیا جاتا ہے۔تحقیق ایک مسلسل عمل کا نام ہے۔ماضی میں کی گئی تحقیق حال میں غلط ثابت ہوسکتی ہے کیونکہ ذرائع معلومات میں متواتر اضافہ ہوتا رہتا ہے،اس لیے ضروری نہیں کہ پہلے والی تحقیق ہی مسلم الثبوت بنی رہے۔

تحقیق ایک مسلسل عمل ہے جس میں نئے واقعات کا علم ہوتا رہتا ہے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کون سی حقیقت کتنے پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔اکثر صورتوں میں ہوتا یہ ہے کہ حجابات بتدریج اٹھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ تحقیق میں اصلیت کا تعین اس وقت تک حاصل شدہ معلومات پر مبنی ہوتا ہے۔جب بھی ایسی نئی معلومات حاصل ہوں گی جو اصول تحقیق کے مطابق قابل قبول ہوں تو انہیں لازماً قبول کرلیا جائے گا اور اس کے مطابق صورت حال کو تسلیم کرلیا جائے گا۔خواہ نئی معلومات گزشتہ مسلمات کی تکذیب کرتی ہو یا ان کی مزید تصدیق کرتی ہو یا ان کی مدد سے اضافے ممکن ہوں۔بہرحال دریافت کا عمل اسی طرح جاری رہے گا اور ردوقبول کے احکامات بھی اسی طرح کارفرما رہیں گے۔

2.5 تحقیق کی قسمیں:

انسان کے اندر تحقیق کا مادہ روزِ ازل سے تھا لیکن جوں جوں دنیا ترقی کے منازل طے کرتی گئی، یہ مادہ پنپتا گیا اور آج انسان نے ہر میدان میں ایجادات کے محیر العقول کارنامے انجام دیے ہیں۔علمی شعبوں میں بھی تحقیق کی رفتار تیز ہوگئی ہے اور اس کا دائرۂ کار وسیع تر ہوتا چلا گیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ تحقیق کو بھی کئی خانوں میں بانٹا گیا ہے۔اس سلسلے میں بعض ماہرین نے تحقیق کے مقاصد کے مدنظر تحقیق کی تقسیم کی ہے جبکہ بعض نے دائرۂ کار اور تحقیق کے طریق کار کو مدنظر رکھ کر۔بعض نے حسبِ نوعیت اس کی تقسیم کی ہے جبکہ بعض نے موضوعات کو مدنظر رکھا ہے۔غرض تحقیق کی قسموں سے متعلق ماہرین کی مختلف آراء ہیں۔تحقیق کے تنوع کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک ایسا بھرپور سائنسی عمل ہے کہ اسے خانوں میں تقسیم کرنا محال ہے۔تاہم اس عمل کی مختلف کیفیات کو سمجھنے کے لیے زمرہ بندی کا یہ عمل ضروری ہوجاتا ہے۔

مقاصد کے اعتبار سے تحقیق کی تین قسمیں ہیں:

(1) بنیادی تحقیق Basic Research

اس تحقیق میں نظری مباحث شامل ہوتے ہیں۔تحقیق کے عام اصول کو وضع کرنا، تعبیر نو کرنا، نظریے بنانا اس میں شامل ہے۔ اس کو فلسفیانہ تحقیق بھی کہتے ہیں۔اس میں عموماً محرکات کا علم اور صداقت کو پرکھنا شامل ہوتا ہے۔

(2) اطلاقی تحقیق Applied Research

اس تحقیق کے ذریعہ کسی چیز کے حصول کے طریقے دریافت کیے جاتے ہیں۔سائنس وٹکنالوجی سے لے کر معاشرتی صورتِ

حال وضروریات انسانی میں اس قسم کی تحقیق کارآمد ہوتی ہے۔اس تحقیق میں تجزیاتی طریق کاربھی شامل ہوتا ہے۔

(3)اقدامی تحقیق Action Research

یہ تحقیق فوری اور محدودنوعیت کے مسائل میں کارآمد ہوتی ہے۔اس میں مسائل کے حل اوراس کے انسداد کے اقدامات پر غور کیا جاتا ہے۔اس قسم کی تحقیق سے نظریات یا اصول وضع نہیں کیے جاتے بلکہ عام طور پر اسے تحقیق میں شمار ہی نہیں کیا جاتا۔

نوعیت کے لحاظ سے تحقیق کی دو قسمیں ہیں:

(1) مقداری تحقیق Quantitative Research

اس تحقیق میں ناپنے،تولنے اور شمار کیا جانے والا مواد زیر بحث آتا ہے۔لسانیات کے اعداد وشمار،کسی شخصیت کے کوائف اور فن پارے میں مستعمل مخصوص الفاظ،محاورات،اصطلاحات یا دیگر مطالعہ جاتی کوائف وغیرہ کو یکجا کیا جاتا ہے۔

(2) معیاری تحقیق Qualitative Research

اس تحقیق میں تاریخی،دستاویزی امور زیر بحث لا کر نقد ونظر کے اصولوں پر پرکھا جاتا ہے۔

موضوع کے اعتبار سے تحقیق کی پانچ قسمیں ہیں:

(1) علمی تحقیق Academic Research

(2) سائنسی تحقیق Scientific Research

(3) سماجی تحقیق Social Research

(4) تکنیکی تحقیق Technological Research

(5) تعلیمی تحقیق Educational Research

طریقۂ کار کے اعتبار سے تحقیق کی دو قسمیں ہیں:

(1) علمی تحقیق (2) عملی تحقیق

علمی تحقیق میں جمیع علوم کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ان کے طریقۂ کار کے مدنظر انھیں مختلف ذیلی اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے،جبکہ عملی تحقیق کو ادبی تحقیق کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ادبی تحقیق' خالص سائنسی تحقیق کی طرز پر غیر اطلاقی یا تصوری ہوتی ہے۔اس میں تاریخی اور تجزیاتی طریقۂ کار اپنایا جاتا ہے۔ادبی تحقیق سے مراد وہ تحقیق ہے جو زبان وادب سے متعلق ہو۔تحقیق جس طرح سماجی اور معاشی مسائل کی طرف اپنی توجہ دلاتی ہے اسی طرح ادب،آرٹ اور انسان کی داخلی زندگی کے مسائل پر بھی غور وخوض کر کے اس کی صحت کی تصدیق کرتی ہے۔

ادبی تحقیق کی مختلف اقسام درج ذیل ہیں:

(1) سوانحی یا تاریخی تحقیق:اس میں کسی فن کار اوراس کے فن پارے سے متعلق تحقیق کی جاتی ہے۔فن کار کا عہد،سوانح،خاندانی پس منظر،تعلیم،عہد،معاصرین،اس دور کی تحریکیں اوراس کے فکری اور فنی امتیازات زیر بحث آتے ہیں۔اس میں اردو ادب کی کسی

صنف کے اہم ادباء وشعراء کی تخلیقات کا تجزیہ کرتے ہوئے اس عہد کے اہم رجحانات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ ادب کی مختلف تحریکوں کا مطالعہ،اس کے اسباب ومقاصد وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔ان تمام امور کے لیے سوانحی یا تاریخی تحقیق کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔

(2) تنقیدی تحقیق: تنقیدی تحقیق کا چلن عام طور پر جامعات میں ہوتا ہے۔اس کے تحت معروضی انداز میں مطالعہ کر کے نتائج برآمد کیے جاتے ہیں۔تحقیق کی یہ قسم عام طور پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات کے لیے استعمال میں لائی جاتی ہے،جس میں کسی مصنف یا فن پارے کی تحقیق کے بعد اس کا تنقیدی تجزیہ کیا جاتا ہے۔

(3) تدوین متن: یہ تحقیق کی سب سے کارآمد قسم ہے،اس میں کسی قدیم متن کو یکجا کر کے اس کا مختلف زاویے سے مطالعہ اور تجزیہ کیا جاتا ہے۔متن کو جمع کرتے وقت مختلف نسخوں سے تقابل کے ذریعہ متن کا تعین کیا جاتا ہے اور منشائے مصنف تک رسائی حاصل کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔اس طرح ایک نیا اور مستند متن برآمد ہو جاتا ہے۔

(4) حوالہ جاتی تحقیق: اس طرح کی تحقیق میں وضاحتی فہرستیں،اشاریے اور انسائیکلو پیڈیا وغیرہ تیار کیا جاتا ہے۔

(5) بین العلومی تحقیق: اس تحقیق میں ادب اور کسی دوسرے مضمون جیسے سماجیات،معاشیات،ریاضی،تاریخ وغیرہ کے مشترک موضوعات پر تحقیق کر کے نتائج نکالے جاتے ہیں۔

ادبی تحقیق کی ضرورت اس لیے درپیش ہوتی ہے کہ ہم اس بیان پر یقین نہ کر لیں جو صدیوں قبل مطبوعہ یا غیر مطبوعہ صورت میں چلی آرہی ہیں۔ادبی تحقیق کسی ادیب،شاعر،نقاد کے کارناموں پر فیصلہ صادر کرتی ہے۔ادبی میدان میں ان کا قد اور حیثیت نیز تعین قدر کرنے میں معاون ہوتی ہے۔تحقیق کی بدولت ہی ادب اور لسانیات کے شعبوں نے ترقی کے منازل طے کیے ہیں۔ادب میں وقت کے تقاضوں کے مطابق ہونے والے تغیر وتبدل تحقیق کی ہی بدولت ممکن ہیں۔ہر عہد کی شاعری اور ادب کے رجحانات،رفتار اور تعین قدر تحقیق کے ذریعہ ہی ممکن ہو سکے ہیں۔ادبی تحقیق میں کسی فن پارے کے وجود کا جائزہ کئی حوالوں سے لیا جاتا ہے۔یہ سارے حوالے اپنے مخصوص معانی میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے علیحدہ مقام رکھتے ہیں،مثلاً کسی ادب پارے کی تفتیش وتلاش اور جستجو نیز چھان بین کے درج ذیل مراحل ہوتے ہیں:

(1) تخلیق (2) تنقید (3) تحقیق (4) تدوین (5) ترتیب

کسی فن پارے کو وجود میں لانے کا عمل تخلیق کہلاتا ہے۔اس عمل میں فن کار ایک ایسے تجربے سے دوچار ہوتا ہے جس میں وہ اپنے خیالات،مشاہدات،تجربات اور واردات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر ایک فن پارہ کو جنم دیتا ہے۔یہ ادب پارہ عام بول چال سے نہ صرف جدا ہوتا ہے بلکہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے اہمیت کا حامل بھی ہوتا ہے۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ادب زندگی کے فنکارانہ اظہار کا نام ہے۔اس اظہار میں ایک ادیب یا شاعر کسی خاص صنف میں اپنے خیال کو پروتا ہے۔یہ نصف ناول،افسانہ،ڈرامہ،غزل،رباعی،مرثیہ کوئی بھی ہو سکتی ہے۔یعنی خیالات کو لفظوں میں ڈھالنے کے تجربے کو ادبی تخلیق کہا جاتا ہے۔تخلیقی کتابوں میں کلیات ذوق،یادگار غالب،بالِ جبرئیل اور اسباب بغاوت ہند کو رکھا جا سکتا ہے۔

کسی فن پارے کی تخلیق کے بعد تنقید اپنا کام شروع کرتی ہے، تاکہ اس کے محاسن اور معایب سامنے آسکیں۔ اگر اس کے اندر کوئی خامی موجود ہے تو اس کی اصلاح کی جاسکے اور اگر محاسن ہیں تو اس کی تعریف کی جاسکے۔ اس طرح عملی تخلیق کے بعد اس کو تنقید کی کسوٹی سے گزرنا پڑتا ہے۔ گویا تنقید بھی تحقیق کی ایک قسم ہوئی، جس کے ذریعہ محاسن و معایب کی تفتیش و تلاش کا کام کیا جاتا ہے۔ تنقیدی کتابوں میں مقدمہ شعر و شاعری، موازنہ انیس و دبیر، اصولِ انتقاد ادبیات وغیرہ بہترین کتابیں ہیں۔

تدوین کا عمل سائنٹفک حوالوں سے کیا جاتا ہے جس میں مخطوطوں، تحریروں یا متون کو جمع کر کے منشائے مصنف کے مطابق ترتیب دیا جاتا ہے، اس میں بھی تحقیق کی کارفرمائی شامل ہوتی ہے اور تلاشِ بسیار کے بعد متن کو اس کی اصل روح تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے، جیسے کربل کتھا، نوطرز مرصع وغیرہ تدوین کی مثالیں ہیں۔

ترتیب کا عمل بھی تحقیق کی ایک قسم ہے، اس میں منتشر ادب پاروں کو اس کی نوعیت کے اعتبار سے تلاش و تفتیش کے بعد یکجا کیا جاتا ہے۔ گویا تحقیق کا عمل ہر میدان میں کارفرما رہتا ہے۔

طریقۂ کار کے اعتبار سے تحقیق کی تین قسمیں ہیں:

(1) تاریخی یا دستاویزی تحقیق Historical or Documentary Research

(2) بیانیہ/ جائزہ کاری تحقیق Descriptive or Survey Research

(3) تجزیاتی یا کنٹرول تحقیق Experimental or Controlled Research

---

2.6 اہمیت و افادیت

علوم و فنون کے سبھی شعبوں میں تحقیق کی بہت اہمیت ہے، اس کے تحت کسی موضوع یا مسئلے کی تہہ تک پہنچ کر اس کے خاطر نتائج برآمد کیے جاتے ہیں، جس سے زندگی گزارنے کے طریقوں میں آسانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ تحقیق کی بدولت ہی ٹیلی ویژن، اسمارٹ فون، کمپیوٹر، لیپ ٹاپ اور نت نئی ایجادات ممکن ہوسکی ہیں۔ انسان نے اپنی اسی خاصیت کی بنا پر بڑی بڑی ایجادات اور موجود اشیاء میں تحقیق کر کے بڑے بڑے معرکے سر کیے ہیں۔ تلاش و تفتیش کے اسی وصف کی بدولت ہی انسان نے پوری دنیا کو قبضہ میں کر لیا ہے۔ سائنسی ایجادات نے عقل انسانی کو حیران و پریشان کر دیا ہے۔ تلاش کا یہ سلسلہ دنیا کے قائم ہونے سے آج تک جاری و ساری ہے۔ قدیم زمانہ میں جب علوم کے ذرائع نہیں تھے، اس کے وسائل محدود تھے اور تلاش و تحقیق کے دائرے بھی محدود تھے تب بھی انسان تلاش میں سرگرداں رہتا تھا لیکن آج علوم کے لامحدود وسائل مہیا ہیں اور اس کا دائرہ کار بھی لامحدود ہے، ظاہر ہے کہ قدیم عہد کے مقابلے جدید عہد میں انکشافات اور ایجادات میں تیزی آئی ہے، جو تحقیق کے عمل سے ہی ممکن ہوسکی ہے۔ مختلف شعبہ ہائے علوم میں تحقیق کی الگ الگ اہمیت و افادیت ہوتی ہے۔ معاشیات، سماجیات، اقتصادیات، سیاسیات وغیرہ میں تحقیق کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

ادبی میدان میں تحقیق اپنے صحیح معنوں میں اہمیت کی حامل ہے۔ ادبی تحقیق میں تمام مواد جمع کر کے اس میں درپیش مشکلات کو

حل کیا جاتا ہے اور تحقیق کے بعد کسی صحیح نتائج پر پہنچا جاتا ہے۔نتائج برآمد کر کے نئے حقائق سامنے لائے جاتے ہیں یا مسلمہ حقائق کی تصدیق وتردید یا توسیع کی جاتی ہے۔ادبی تحقیق کی وضاحت کرتے ہوئے گیان چند جین لکھتے ہیں:

''جن مصنفین ،جن ادوار،جن علاقوں ،جن کتابوں اور متفرق تخلیقات کے بارے میں کم معلوم ہے ان کے بارے میں مزید معلومات حاصل کی جائیں۔ان کے بارے میں اب تک جو کچھ معلوم ہے اس کی جانچ پڑتال کر کے اس کی غلط بیانیوں کی تصحیح کر دی جائے تا کہ غلط مواد کی بنا پر غلط فیصلے صادر نہ کر دیے جائیں۔''(گیان چند جین،تحقیق کا فن،2009،ص7)

انسان کی ضروریات کبھی ختم نہیں ہوسکتیں،ایک نیا دن نئی خواہش کے ساتھ طلوع ہوتا ہے،جس کے باعث تحقیق کی اہمیت مزید دگنی ہوتی چلی جاتی ہے۔تحقیق کا اصل مدعا فطرت یا انسانی زندگی سے متعلق مسائل کے حل کی تلاش ہے۔تحقیق انسانی علوم وفنون کی وسعت میں اضافہ کرتی ہے۔آج ہم زندگی کی جن آسائشوں سے لطف اٹھا رہے ہیں، وہ سب تحقیق کی بدولت ممکن ہوسکی ہیں۔دراصل تہذیب انسانی کی بنیاد ہی تحقیق کے ذریعہ ہوئی ہے۔تحقیق کا فن بہت وسعت اور تنوع کا حامل ہے۔علم کے ہر میدان میں تحقیق کی ضرورت پڑتی ہے لیکن ادب میں اس کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ادب میں تحقیق کی اہمیت مسلم ہے کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔اس لیے تمام شعری اور نثری متون کی تعبیر وتفہیم اور اس کی تشریح کے لیے فنکار کی زندگی،اس کے کلام کی خصوصیات،اس کی اور عہد سے واقفیت ضروری ہے۔اسی طرح فنکار کے ماقبل اور معاصر علمی وادبی پس منظر کا مطالعہ فن پارہ کو سمجھنے میں معاون ہوتا ہے،جو تحقیق کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔تحقیق کے ذریعہ کسی فنکار کی زندگی سے متعلق صحیح نتائج پر پہنچا جاسکتا ہے۔

تحقیق کو تعلیم سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا کیونکہ تعلیم کا پہلا زینہ ہی تحقیق ہے۔یہ تعلیم کی بنیادی اکائی ہے،جس کی بدولت نہ صرف شعبۂ تعلیم کی صورت حال کو مزید بہتر بنایا جاسکتا ہے بلکہ تحقیق کے ذریعہ عمل کو بھی بہتر بنایا جاسکتا ہے۔دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں تحقیق کو خاص اہمیت حاصل ہے، یہاں تک کہ غیر ملکی یونیورسٹیوں میں تحقیق کا علیحدہ شعبہ قائم ہوتا ہے، جو نہ صرف شعبۂ تعلیم بلکہ ملکی ترقی میں معاون ہوتا ہے۔اگر ہم بھی ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ شامل ہونا چاہتے ہیں تو تعلیم کے ساتھ ساتھ تحقیق کے شعبے پر خاص توجہ دینی ہوگی۔

چونکہ تحقیق کا مقصد تفتیش وتلاش کے بعد کسی نتیجے پر پہنچنا ہوتا ہے،اس لیے ضروری ہے کہ موضوع یا مسئلہ کی گہرائی تک پہنچ کر اس کا حل تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ اسے انسانی زندگی کے لیے مددگار بنایا جائے۔تحقیق سے حاصل ہونے والے فوائد کسی ایک کے لیے نہیں بلکہ نوع انسانی کے لیے مفید ہوتے ہیں لیکن ان کا اطلاق مخصوص طرز عمل اور طرز فکر کے لوگوں پر ہی ہوتا ہے۔تحقیق کے ذریعہ ہی تہذیب وثقافت کے پوشیدہ حقائق اور نئی صداقتوں کو تلاش کیا جاسکا ہے،جس کی بدولت جہالت سے دوری آسان ہوگئی ہے۔تحقیق کے ذریعے ہی نئے راستے اور بہترین منزلوں کی تلاش ممکن ہوسکی ہے۔

تحقیق کسی بھی سماج کی معاشرتی اور معاشی ترقی کے لیے بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ترقی یافتہ ممالک نے تحقیق کے ذریعے ہی

بڑے بڑے میدانوں میں فتح پائی ہے۔ یہ ایک ایسا قیمتی اثاثہ ہے جس کے ذریعہ انسان سماجی اور معاشی ترقی کی راہیں آسان بناتا ہے۔ تحقیق کے ذریعہ نہ صرف اپنی معلومات و تجربات میں اضافہ کیا جاسکتا ہے بلکہ ذہن کے دریچوں میں اٹھنے والی الجھنوں کو دور کرتے ہوئے سوالات کے جوابات تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ مختلف توجیہات ومفروضات کے بارے میں دماغ میں جو ابہام واشکال پیدا ہوتے ہیں انہیں دور کیا جاسکتا ہے اور اس سے برآمد ہونے والے نتائج سے ادب اور معاشرتی نظام کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ جب کوئی محقق اپنے کسی مضمون یا موضوع پر تحقیق کر رہا ہوتا ہے تو اس کے بارے میں پہلے سے موجود علمی مواد کا مطالعہ اس کے علم اور مہارت میں زبردست اضافہ کرتا ہے، اور وہ تمام تر حقائق سے آگاہ ہو جاتا ہے، اس طرح اس کے لیے تجزیہ کرنا آسان ہوتا چلا جاتا ہے۔ کسی بھی موضوع پر تحقیق کے سلسلے میں یا مسائل کا حل ڈھونڈنے کے لیے کئی پہلو سامنے آتے ہیں اور ایک کے بجائے کئی راستے یا طریقے سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔

2.7 تحقیق کے مقاصد

تحقیق کے مقاصد کے سلسلے میں درج ذیل تین نکات اہم ہیں:

(1) حیات اور ماحول کی زیادہ سے زیادہ قرینِ قیاس تفہیم

(2) اس تفہیم کی بنیاد پر نئے نظریات کی تشکیل

(3) نئے نظریات کی بنیاد پر مسائل کا حل

مذکورہ تینوں نکات اپنے اندر ایک باہمی ربط رکھتے ہیں لیکن ہر تحقیق کرنے والے کے لیے ضروری نہیں وہ ان تینوں مقاصد کو پیش نظر رکھے۔ تحقیق پورے انسانی سماج کی ایک مشترکہ کوشش کا نام ہے، جس کے فوائد کا دائرہ کار کسی ایک خطہ، ملک یا سماج تک محدود نہیں بلکہ کے اس کے فوائد لامحدود ہیں۔ سلطانہ بخش نے تحقیق کے مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

(1) تحقیق کا پہلا مقصد نظریے کی نشوونما اور ارتقاء ہے۔ اس قسم کی تحقیق نئے خیالات کو واضح طور پر متعین کرنے اور مقاصد زندگی کو سمجھنے میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی افادیت اشیاء کو تفصیل سے بیان کرنا ہے جو سائنسی طریقوں کی مدد سے ہی ممکن ہے۔ اور اس کے نتائج کا اطلاق ہمیشہ مستقبل پر ہوتا ہے۔ اس قسم کی تحقیق کو نظریاتی یا بنیادی تحقیق Theoretical & Basic Research کہا جاتا ہے۔

(2) تحقیق کا دوسرا مقصد حقائق کو ایک جگہ اکٹھا کرنا ہے۔ لہٰذا اس عمل کے لیے بکثرت سروے یا تاریخی تحقیق سے خاص اطلاعات حاصل کی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں سائنسی طریقۂ تحقیق سے بھی حقائق اکٹھے کیے جاسکتے ہیں۔ اس کو اطلاقی تحقیق Factual or Applied Research کہتے ہیں۔

(3) تحقیق کا تیسرا مقصد یہ ہے کہ اس کا تعلق فوری اور عملی مسائل سے ہو یا وہ محقق کو سمجھنے یا حل کرنے میں مدد دے سکے۔ اس قسم کی تحقیق سے تعلق رکھنے والوں کو سائنٹفک طریقۂ تحقیق استعمال کرنا چاہیے۔ تحقیق کے اس مقصد کو انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر کی جانے والی تجربات کو ہر صورت بہتر بنانا مقصود ہوتا ہے۔ ایسی تحقیق Practical or Action

Research کہلاتی ہے۔(سلطانہ بخش، اردو میں اصول تحقیق، 1986، ص:5)

2.8 آپ نے کیا سیکھا

- تحقیق سے نئی دریافتیں، نئے حقائق اور نئے انکشافات بھی جنم لیتے ہیں اور مروجہ ایجادات، انکشافات اور نظریات پر نظر ثانی بھی کی جاتی ہے اور ان کی اثرات تلاش کر کے صحیح تاویلیں بھی پیش کی جاتی ہیں۔
- ادب میں تحقیق کی اہمیت مسلم ہے کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔
- تحقیق کے لیے انگریزی میں 'Research' کی اصطلاح ہے، جو فرنچ لفظ 'Recherche" سے لیا گیا ہے۔اس کے معنی 'پیچھے جا کر تلاش کرنے' کے ہیں۔انگریزی لفظ 'Search' فرنچ لفظ 'Cherche' سے ماخوذ ہے جس کا ماخذ لاطینی لفظ 'Circare' ہے۔اس کے معنی 'گھومنا پھرنا' کے ہیں۔
- تحقیق کے لیے ہندی میں 'انوسندھان' (vu l /kku) کا لفظ رائج ہے، اس کا مادہ 'دھاب' ہے جس کے معنی برقرار رکھنا، چھان بین، جانچ پڑتال، اور جائزہ کے ہیں۔'سندھان (l /kku)' کا مطلب ہے سمت، لکش (ہدف)، یعنی مقصود برقرار رکھنا یا نشانہ لگانا، جبکہ 'انو' (vu) کے معنی تعاقب کرنے یا پیچھے چلنے کے ہیں۔اس طرح 'انوسندھان' کا مطلب ہوا 'کسی مقصد کو سامنے رکھ کر اس کا تعاقب کرنا'، یعنی سچائی کے لیے اشیاء کے پیچھے چلنا۔
- نامعلوم حقائق کی تلاش تحقیق کہلاتی ہے۔
- معلوم حقائق کی توسیع یا ان کی خامیوں کی تصحیح بھی تحقیق کے ذیل میں آتی ہے۔
- ادبی تحقیق میں تمام مواد جمع کر کے اس میں درپیش مشکلات کو حل کیا جاتا ہے اور تحقیق کے بعد کسی صحیح نتائج پر پہنچا جاتا ہے۔نتائج برآمد کر کے نئے حقائق سامنے لائے جاتے ہیں یا مسلمہ حقائق کی تصدیق و تردید یا توسیع کی جاتی ہے۔
- تحقیق کا پہلا مقصد نظریے کی نشو و نما اور ارتقاء ہے۔
- تحقیق کا دوسرا مقصد حقائق کو ایک جگہ اکٹھا کرنا ہے۔
- تحقیق کا تیسرا مقصد یہ ہے کہ اس کا تعلق فوری اور عملی مسائل سے ہو یا وہ محقق کو سمجھنے یا حل کرنے میں مدد دے سکے۔

2.9 اپنا امتحان خود لیجیے

سوال1: تحقیق کا مادہ کیا ہے؟ اس کے مختلف معانی پر روشنی ڈالئے۔

سوال2: ادبی تحقیق کی اقسام پر روشنی ڈالئے۔

سوال3: تحقیق کے لیے ہندی اور انگریزی میں کون سی اصطلاحیں رائج ہے؟

سوال4: تحقیق کے مقاصد کیا ہیں؟

سوال5: ادبی تحقیق کی اہمیت پر روشنی ڈالئے۔

2.10 سوالات کے جوابات

جواب 1: لفظ 'تحقیق' جس کا مادہ ح+ق+ق ہے۔ یہ باب تفعیل کا مصدر ہے اور حقّق، یحَقّق، تحقیقاً سے ماخوذ ہے۔ حق باطل کی ضد ہے۔ اس کے لغوی معنی تفتیش، تلاش، کھوج، دریافت اور چھان بین کے ہیں یعنی حقائق کی تلاش کا نام تحقیق ہے۔

تحقیق کے معانی و مفاہیم میں صحیح، درست، سچ مچ، ٹھیک، واقعی طور پر، تصدیق، ثبوت، دراصل، درحقیقت، یقین، ضرور، بے شک، یقیناً، چھان بین، پہچان، تلاش، دریافت، پوچھ گچھ، جانچ، امتحان اور تجربہ وغیرہ معانی شامل ہیں۔ 'تحقیق' باطل، جھوٹ، غلط، لایعنیت اور تشکیک کی ضد ہے۔

لغوی اعتبار سے لفظ 'تحقیق' زیادہ بامعنی اور متنوع ہے نیز اپنے اندر تحقیق کے اصطلاحی مفہوم کو سمیٹتا نظر آتا ہے لیکن اصطلاحی طور پر یہ لفظ کہیں زیادہ وسیع اور معانی سے بھرپور ہے۔ یہ لفظ پوشیدہ حقائق کی تلاش تک ہی محدود نہیں بلکہ منصوبہ بند اور باضابطہ طریقے سے معلومات کو یکجا کرنے کا نام ہے۔ اس کے ذریعے مسائل کے قابلِ اعتبار حل تک پہنچ کر معلومات کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور پھر اس کی توجیہ اور تعبیر کی جاتی ہے۔ تحقیق کے ذریعے علوم کو دریافت کیا جاتا ہے۔ تحقیق ایک مسلسل عمل کا نام ہے۔

جواب 2: ادبی تحقیق کی اقسام درج ذیل ہیں:

(1) سوانحی یا تاریخی تحقیق: اس میں کسی فن کار اور اس کے فن پارے سے متعلق تحقیق کی جاتی ہے۔ فن کار کا عہد، سوانح، خاندانی پس منظر، تعلیم، عہد، معاصرین، اس دور کی تحریکیں اور اس کے فکری اور فنی امتیازات زیر بحث آتے ہیں۔ اس میں اردو ادب کی کسی صنف کے اہم ادباء و شعراء کی تخلیقات کا تجزیہ کرتے ہوئے اس عہد کے اہم رجحانات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ادب کی مختلف تحریکوں کا مطالعہ، اس کے اسباب و مقاصد وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔ ان تمام امور کے لیے سوانحی یا تاریخی تحقیق کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔

(2) تنقیدی تحقیق: تنقیدی تحقیق کا چلن عام طور پر جامعات میں ہوتا ہے۔ اس کے تحت معروضی انداز میں مطالعہ کر کے نتائج برآمد کیے جاتے ہیں۔ تحقیق کی یہ قسم عام طور پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات کے لیے استعمال میں لائی جاتی ہے، جس میں کسی مصنف یا فن پارے کی تحقیق کے بعد اس کا تنقیدی تجزیہ کیا جاتا ہے۔

(3) تدوین متن: یہ تحقیق کی سب سے کارآمد قسم ہے، اس میں کسی قدیم متن کو یکجا کر کے اس کا مختلف زاویے سے مطالعہ اور تجزیہ کیا جاتا ہے۔ متن کو جمع کرتے وقت مختلف نسخوں سے تقابل کے ذریعہ متن کا تعین کیا جاتا ہے اور منشائے مصنف تک رسائی حاصل کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ اس طرح ایک نیا اور مستند متن برآمد ہو جاتا ہے۔

(4) حوالہ جاتی تحقیق: اس طرح کی تحقیق میں وضاحتی فہرستیں، اشاریے اور انسائیکلوپیڈیا وغیرہ تیار کیا جاتا ہے۔

(5) بین العلومی تحقیق: اس تحقیق میں ادب اور کسی دوسرے مضمون جیسے سماجیات، معاشیات، ریاضی، تاریخ وغیرہ کے مشترک موضوعات پر تحقیق کر کے نتائج نکالے جاتے ہیں۔

جواب3: تحقیق کے لیے انگریزی میں 'Research' کی اصطلاح رائج ہے۔ یہ فرنچ لفظ 'Recherche" سے لیا گیا ہے۔ اس کے معنی 'پیچھے جا کر تلاش کرنے' کے ہیں۔ انگریزی لفظ 'Search' فرنچ لفظ 'Cherche' سے ماخوذ ہے جس کا ماخذ لاطینی لفظ 'Circare' ہے۔ جبکہ ہندی میں تحقیق کے لیے انوسندھان' (vu l /kku) کا لفظ رائج ہے، اس کا مادہ 'دھا ب' ہے جس کے معنی برقرار رکھنا، چھان بین، جانچ پڑتال ،اور جائزہ کے ہیں۔ 'سندھان (l /kku)' کا مطلب ہے سمت، لکش (ہدف)، یعنی مقصود برقرار رکھنا یا نشانہ لگانا، جبکہ 'انو' (vu) کے معنی تعاقب کرنے یا پیچھے چلنے کے ہیں۔ اس طرح 'انوسندھان' کا مطلب ہوا 'کسی مقصد کو سامنے رکھ کر اس کا تعاقب کرنا' یعنی سچائی کے لیے اشیاء کے پیچھے چلنا۔ انوسندھان کے ایک معنی ٹوٹے بکھرے دھاگوں کو جوڑنا بھی ہے۔

جواب4: تحقیق کا پہلا مقصد نظریے کی نشوونما اور ارتقاء ہے۔ اس قسم کی تحقیق نئے خیالات کو واضح طور پر متعین کرنے اور مقاصد زندگی کو سمجھنے میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی افادیت اشیاء کو تفصیل سے بیان کرنا ہے جو سائنسی طریقوں کی مدد سے ہی ممکن ہے۔ اور اس کے نتائج کا اطلاق ہمیشہ مستقبل پر ہوتا ہے۔ اس قسم کی تحقیق کو نظریاتی یا بنیادی تحقیق Theoretical & Basic Research کہا جاتا ہے۔

تحقیق کا دوسرا مقصد حقائق کو ایک جگہ اکٹھا کرنا ہے۔ لہٰذا اس عمل کے لیے بکثرت سروے یا تاریخی تحقیق سے خاص اطلاعات حاصل کی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں سائنسی طریقۂ تحقیق سے بھی حقائق اکٹھے کیے جا سکتے ہیں۔ اس کو اطلاقی تحقیق Factual or Applied Research کہتے ہیں۔

تحقیق کا تیسرا مقصد یہ ہے کہ اس کا تعلق فوری اور عملی مسائل سے ہو یا وہ محقق کو سمجھنے یا حل کرنے میں مدد دے سکے۔ اس قسم کی تحقیق سے تعلق رکھنے والوں کو سائنٹفک طریقۂ تحقیق استعمال کرنا چاہیے۔ تحقیق کے اس مقصد کو انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر کی جانے والی تجربات کو ہر صورت بہتر بنانا مقصود ہوتا ہے۔ ایسی تحقیق Practical or Action Research کہلاتی ہے۔

جواب5: ادب میں تحقیق کی اہمیت مسلم ہے کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ اس لیے تمام شعری اور نثری متون کی تعبیر و تفہیم اور اس کی تشریح کے لیے فنکار کی زندگی، اس کے کلام کی خصوصیات، اس کی اور عہد سے واقفیت ضروری ہے۔ اسی طرح فنکار کے ماقبل اور معاصر علمی و ادبی پس منظر کا مطالعہ فن پارہ کو سمجھنے میں معاون ہوتا ہے، جو تحقیق کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ تحقیق کے ذریعہ کسی فنکار کی زندگی سے متعلق صحیح نتائج پر پہنچا جا سکتا ہے۔ ادبی حوالے سے تحقیق اپنے صحیح معنوں میں اہمیت کی حامل ہے۔ ادبی تحقیق میں تمام مواد جمع کر کے اس میں درپیش مشکلات کو حل کیا جاتا ہے اور تحقیق کے بعد کسی صحیح نتائج پر پہنچا جاتا ہے۔ نتائج برآمد کر کے نئے حقائق سامنے لائے جاتے ہیں یا مسلمہ حقائق کی تصدیق و تردید یا توسیع کی جاتی ہے۔

2.11 فرہنگ

الفاظ	معانی

متقاضی	تقاضا یا طلب کرنے والا، مطالبہ کرنے والا
مولف	مصنف، کسی کتاب کا لکھنے والا
لایعنیت	بے معنی، بے سر و پا، لغو، مہمل، فضول
مغز	گودا، بھیجا، دماغ
محتاط	احتیاط پسند، احتیاط رکھنے والا، خبردار، وہ جو بہت احتیاط رکھے
حقائق	سچائیاں، صداتیں، حقیقتیں
تجسس	جستجو، کھوج، تحقیق، تلاش، چھان بین، کرید
شواہد	دلیلیں، حجتیں، ثبوت، مثالیں، گواہیاں
استوار	مضبوط بندھا ہوا، ناقابل رد، نہ ٹوٹنے والا، غیر متزلزل
متنوع	مختلف نوع، قسمیں رکھنے والا، قسم قسم کا، طرح طرح کا
بتدریج	رفتہ رفتہ، زینہ بزینہ، درجہ بدرجہ

2.12 کتب برائے مطالعہ

1.	ادبی تحقیق	جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۹۴ء
2.	تحقیق کا فن	گیان چند جین	اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ	2009
3.	مبادیات تحقیق	عبدالرزاق قریشی	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی	2014
4.	جدید اردو تنقید اصول اور نظریات	شارب ردولوی	اترپردیش اردو اکادمی	1981
5.	ادبی تحقیق: مسائل و مباحث	حنیف نقوی	اسکرین پلے، وارانسی	2010
6.	ادبی تحقیق مسائل و تجزیہ	رشید حسین خاں	اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	1990

اکائی 3: تحقیق کا فن اور آغاز و ارتقا

3.1 اغراض و مقاصد
3.2 تمہید
3.3 تحقیق کا فن
3.4 آغاز و ارتقا
3.5 آپ نے کیا سیکھا
3.6 اپنا امتحان خود لیجیے
3.7 سوالات کے جوابات
3.8 فرہنگ
3.9 کتب برائے مطالعہ

3.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی میں آپ

- تحقیق کے فن سے واقف ہو جائیں گے۔
- تحقیق کے آغاز اور ارتقا سے واقفیت ہو جائے گی۔
- اردو کے اولین محقق سے آگاہ ہو جائیں گے۔
- سرسید کے تحقیقی کارناموں کو جان سکیں گے۔
- سرسید کے رفقاء کی تحقیقی کاوشوں سے بہرہ ور ہو جائیں گے۔
- سرسید اور ان کے رفقاء کی بعض تحقیقی تصنیفات کے بارے میں معلوم حاصل ہو جائے گی۔

3.2 تمہید

تمام علوم وفنون کا ارتقا اور اس کی ترقی تحقیق کی ہی رہین منت ہے۔ عہد آفرینش سے لے کر عہد جدید تک انسان نے جتنے بھی ارتقائی منازل طے کیے ہیں وہ تحقیق کی بدولت ہی ممکن ہو سکے ہیں۔ تحقیق، حقیقت کو جاننے اور حق کو پہچاننے کا نام ہے۔ تحقیق کے ذریعہ کسی چیز کے حق ہونے کے اثبات اور جو اس کے برعکس ہے، اس کے ابطال کی کوشش کی جاتی ہے۔ تحقیق کا مطلب صرف حقائق کا دریافت کرنا نہیں ہے یا حقائق کو جمع کر دینا ہی تحقیق نہیں ہے بلکہ تحقیق کا صحیح مقصد یہ ہے کہ حقائق کا از سرنو جائزہ لے کر نئے نتائج تک پہنچنے کی سعی کی جائے۔ تحقیق میں کسی امر یا اشیا کا مطالعہ اور تجزیہ حقائق کی روشنی میں اس طرح کیا جاتا ہے کہ کوئی نئی شے وجود میں آ جائے یا موجود چیز کو صداقت کی کسوٹی پر اس طرح پرکھا جائے کہ ماقبل کے نتائج کی مزید تصحیح ہو سکے۔ اگر تحقیق کا عمل نہ ہوتا تو

بیشتر علمی و عملی سرگرمیاں ناپید ہوتیں اور انسان اپنی زندگی کے مختلف گوشوں میں ان ترقیات سے محروم بھی ہو جاتا جو یکسر اس کی فطرت کے منافی تھا۔ اسی حقیقت کی بازیافت اور نت نئے حقائق کی جستجو نے اس کے فطری جذبات کو فروغ دیا اور وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں انکشافات کی سمت گامزن ہوا اور دلائل و براہین کی کسوٹی پر پرکھ کر ایک خاص نتیجہ پر پہنچا۔ آج کے سائنسی اور تکنیکی عہد میں حقیقت کی دریافت ہی علم وفن کا اہم سرمایہ تصور کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعبہ ہائے علوم وفنون اس وقت تک قابل اعتبار نہیں سمجھے جاتے جب تک کہ ان پر تحقیق کی مہر ثبت نہ ہو جائے۔ عصر حاضر میں ہر میدان میں تحقیق کے بعد ہی' اشیاء اور علوم وفنون مسلم الثبوت کہلاتے ہیں۔ تحقیق ایک ایسا عمل ہے جو کائنات کے تاریک گوشوں کو منور کرتا ہے اور زندگی کی تعمیر نو کرتا ہے۔

تحقیق کی ابتدا تذکرہ نگاری سے ہوئی، اولین تذکروں میں فارسی زبان کے تذکرے ملتے ہیں، لیکن بعد میں اردو میں بھی تذکرہ نویسی کا آغاز ہوا۔ چنانچہ میر تقی میر کا تذکرہ 'نکات الشعراء' اردو زبان کا اولین تذکرہ ہے۔ تذکروں کے بعد اردو میں ادبی تحقیق کی باقاعدہ ابتدا انیسویں صدی کے اواخر سے تسلیم کی جاتی ہے، جب سر سید احمد خاں اور ان کے رفقاء نے تحقیقی نوعیت کی کتابیں تصنیف کیں۔ سر سید کے رفقاء میں رفقاء محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی، مولوی ذکاء اللہ، مولوی چراغ علی اور گارساں دتاسی وغیرہ اہم محققین کی حیثیت سے اردو ادب کے افق پر نمودار ہوئے۔ ان محققین کی علمی، فکری اور اجتہادی بصیرت سے ہر میدان میں خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔

3.3 تحقیق کا فن

تحقیق کا مقصد عموماً حیاتِ انسانی کو زیادہ سے زیادہ بہتر طور پر سمجھنے کے لیے عمل میں لایا جاتا ہے۔ اس میں سے بعض تحقیقات اس نوعیت کی ہوتی ہیں کہ ان کے نتائج کی روشنی میں وسیع تر بنیادیوں پر تصحیح کی جائے تاکہ نئے نظریات کی تشکیل ہو سکے۔ تمام نظریات اپنے اندر ایک نظامِ کے حامل ہوتے ہیں جن کے ذریعہ بعض لاینحل مسائل کی توضیح اور تفہیم ممکن ہو جاتی ہے۔ پھر یہ توضیح اور تفہیم بعض مسائل کے حل کا سبب بنتی ہے اور سماج کے لیے ترقی کا باعث بھی۔ تحقیق اپنے تمام تر مقاصد کے ساتھ حقائق تک رسائی، نوع انسان کی خدمت، نئے نظریات کی تشکیل کرتی ہے۔ تحقیق کا مقصد کسی نامعلوم کی تلاش یا معلوم کی تصدیق و تفتیش، حقائق کی توسیع اور معلوم اشیاء کی خامیوں کی تصحیح ہے۔ تحقیق کے نتائج کی صورت میں علم میں اضافہ ہوتا ہے اور علم میں اضافہ ہی انسانی ترقی کی ضامن ہے۔ تحقیق کی مندرجہ بالا توضیحات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک مشکل اور خشک کام ہے، اس میں وسیع مطالعہ، سچی لگن، سخت محنت، صبر آزما، استقلال اور بڑے حوصلے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں ہے۔ اس میں سستی، آرام طلبہ اور زود یقینی سے اجتناب کرنا ہوتا ہے۔ تحقیق ریت کو نچوڑ کر آب حیات برآمد کرنے کا فن ہے۔ اس میں جذبات اور قیاس آرائی کا ہرگز دخل نہیں ہوتا۔ اسی طرح محقق کے ذاتی خیالات و نظریات اور حمایت و مخالفت کا جذبہ یا پہلے سے قائم کیے گئے مفروضے کی تحقیق میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ محقق کا نقطۂ نگاہ اور طریقۂ کار معروضی ہونا چاہیے۔ تحقیق کی خصوصیات کے سلسلے میں درج ذیل امور سامنے آتے ہیں، جن کی نشاندہی عبدالرزاق قریشی نے کرافورڈ کے حوالے سے کی ہے:

اس کا مرکز کوئی مسئلہ ہوتا ہے۔
اس میں کوئی نئی بات کہی جاتی ہے
اس کا دارومدار جستجو، پسند، دل اور دماغی رجحان پر ہے
اس کے لیے کھلے دل ودماغ کی ضرورت ہے
اس کا انحصار اس مفروضے پر ہے کہ دنیا کی ہر چیز میں تبدیلی ممکن ہے۔
اس کا مقصد قوانین کا انکشاف کرنا اور پھر انھیں عام کرنا ہے۔
یہ سبب اور اثر کا مطالعہ ہے
اس کی بنیاد پیمانہ پر ہے
اس کے لیے ایک بیدار فنی طریقہ کار لازمی ہے
اس کے لیے ایک بیدار فنی طریقہ کار لازمی ہے (عبدالرزاق قریشی، مبادیات تحقیق، ص:4)

تحقیق کی ابتدا کسی مسئلے سے ہوتی ہے، اور محقق کا اصل مقصد اس مسئلے کا حل تلاش کرنا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں محقق تمام ممکنہ وسائل سے کام لے کر دلائل اور ثبوت کی روشنی میں اس کی تہہ تک جاتا ہے۔ اس دوران محقق کوئی نئی باتوں کا انکشاف ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو بات کہی جائے وہ بنیادی طور پر نئی ہے، بلکہ ایک بات جس کی تصدیق ماقبل میں ہو چکی ہے اس میں جدید معلومات کا اضافہ بھی تحقیق ہے۔ یہاں تک کہ زیر بحث موضوع میں نئے زاویے سے نکتے نکالنا بھی تحقیق ہے اور موجودہ تحقیق میں اگر کوئی خامی درپیش ہو تو اسے دور کرنا بھی تحقیق ہے۔

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

> ''تحقیق کے لغوی معنی کسی شے کی حقیقت کا اثبات ہے۔ اصطلاحاً یہ ایک ایسے طرز مطالعہ کا نام ہے جس میں موجود مواد کے صحیح یا غلط کو بعض مسلمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔''
> (ڈاکٹر سید عبداللہ، تحقیق وتنقید، مشمولہ ادبی ولسانی تحقیق، مرتبہ عبدالستار دلوی، بمبئی 1984، ص:117)

تحقیق میں یہ بات بہت اہمیت کی حامل ہے کہ اگر کسی شے کی حقیقت افشا اور ظاہر ہے تو اس کی اصل شکل کو دیکھنا تحقیق نہیں ہے، بلکہ اگر کسی امر کی اصل شکل مخفی اور پوشیدہ ہو تو اس کی اصل شکل کو دریافت کرنے کا عمل تحقیق ہے۔ تحقیق کو اگر معروضی شکل میں دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ:

(1) کسی مخصوص چیز یا شخص سے متعلق گہری محتاج تلاش کا عمل
(2) کسی حقیقت کے انکشاف کی غرض سے محتاط غور وفکر یا کسی مضمون کے مطالعے کے ذریعے تلاش یا چھان بین، ناقدانہ یا سائنسی سلسلۂ تلاش۔

(3) کسی مضمون کی چھان بین یا مسلسل مطالعہ

(4) دوسری بار یا بار بار کی تلاش

ہندی زبان میں تحقیق کے لیے کئی اصطلاحیں رائج ہیں، جن میں انوسندھان اور شودھ زیادہ معروف ومقبول ہیں۔ انوسندھان کا مادہ 'ودھا' ہے، جس کا مطلب برقرار رکھنے کے ہیں، جبکہ سندھان کے معنی نشانہ یا ہدف کے ہیں یعنی مقصود برقرار رکھنا یا نشانہ لگانا۔ انو کے معنی ہیں پیچھے یعنی انوسندھان کے معنی کسی مقصود یا نشانے کا پیچھا یا تعاقب کرنا۔ انوسندھان کا مادہ شودھ یعنی خالص ہے۔ شودھ کے معنی میل دور کرکے خالص کرنے یا صاف کرنے کے ہیں، جیسے کسی دھات کو صاف کیا جائے۔

تلاش وتفتیش کی مختلف صورتیں ہیں مثلاً سائنسی، ادبی، جغرافیائی، اقتصادی، معاشی وغیرہ۔ ان تحقیقات کا دائرہ عمل زندگی کے مختلف شعبوں میں عمل میں لایا جاتا ہے لیکن ادبی تحقیق سے مراد وہ تحقیق ہے جس میں کسی فن پارے کی صحت وعدم صحت، تعین زمانہ، مصنف اور منشائے مصنف کو جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ادب سے متعلق دوسری چیزیں بھی اس کے دائرہ عمل میں آجاتی ہیں، جیسے کسی فن پارے کا عہد اور اس کا معاصر ادب، یا فن کار کا عہد اور اس کے معاصرین وغیرہ۔ ادبی تحقیق ایک مستقل فن کی حیثیت رکھتی ہے اور اس میدان میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جاسکتے ہیں کہ اردو ادب کو عالمی سطح پر متعارف کرایا جاسکے۔ تحقیق کی تعریف کرتے ہوئے مولانا کلب عابد لکھتے ہیں:

> ''تحقیق کسی شے یا مسئلے کی حقیقت کو دریافت کرنے کا عمل ہے جس میں واقعے کو دلائل وشواہد کی بنیاد پر جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔'' (پروفیسر کلب عابد، عمادالتحقیق، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ 1978، ص:14)

3.4 آغاز وارتقا

اردو میں تحقیق کی ابتدا شعرائے اردو کے تذکروں سے ہوئی۔ یہ اٹھارہویں صدی کا عہد تھا جب فارسی کے تتبع میں اردو میں تذکرے تحریر کیے گئے۔ یہ تذکرے عموماً شعراء کی مختصر سوانح اور ان کے کلام کے انتخاب پر مشتمل ہوتے تھے۔ اردو میں تذکرہ نگاری کا باقاعدہ آغاز میر تقی میر کے تحریر کردہ تذکرہ ''نکات الشعراء'' سے ہوا، جس کا سلسلہ محمد حسین آزاد کی تصنیف ''آب حیات'' پر اختتام پذیر ہوا۔ ''آب حیات'' کو اس کی تمام تر تحقیقی خامیوں کے باوجود تحقیق وتنقید کی اہم تصنیف سمجھا جاتا ہے۔ اس دوران بہت سے تذکرے لکھے گئے جن پر آنکھ بند کرکے یقین نہیں کیا جاسکتا۔ اردو میں تحقیق کی باقاعدہ بنیاد انیسویں صدی کے نصف آخر میں سرسید نے رکھی۔ جن میں ان کی تاریخی تحقیق آثارالصنادید 1847 میں منظر عام پر آئی۔ آئین اکبری، تزک جہانگیری اور تاریخ فیروز شاہی سرسید کے تحقیقی کارنامے ہیں۔ سرسید کے ساتھ ساتھ ان کے رفقاء محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی وغیرہ نے اردو میں باقاعدہ تحقیق کی روایت کو مستحکم کیا۔ حالی نے تاریخی شخصیات کی سوانح لکھ کر تحقیق کے بے مثال نمونے یادگار چھوڑے، ان کی تصانیف ''یادگار غالب''، 'حیات سعدی' اور ''حیات جاوید'' میں تحقیق کے معیاری نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ شبلی نعمانی تحقیقی مزاج

کے مالک تھے۔انہیں اپنے معاصرین میں استناد کا درجہ حاصل ہوا۔شبلی کی تصانیف ''المامون''، ''سیرت النعمان''،'الفاروق''، ''الغزالی''، ''سوانح مولانا روم''وغیرہ تحقیق وتنقید کی سوانح عمریاں ہیں۔

سر سید احمد خاں

جام جم(1840)

سر سید احمد خاں نے باقاعدہ طور پر ادبی تحقیق کو لائحہ عمل نہیں بنایا پھر بھی ان کے اجتہادی فکر اور سائنسی نقطۂ نظر نے اردو میں تحقیق کی بنیاد رکھی اور ان کے تحقیقی کارناموں نے معاصرین کے لیے تحقیق کی راہ ہموار کی۔سر سید نے مختلف شعبہ ہائے میں کارہائے نمایاں انجام دیے، ساتھ ہی ادبی تحقیقات پر ان کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔سر سید کی تحقیقی بصیرت کا اندازہ ان کے ایک مختصر فارسی رسالہ' جام جم' سے ہوتا ہے، جو۱۸۴۰ء میں تحریر کیا گیا۔یہ رسالہ سر سید نے آگرہ میں ملازمت کے دوران وہاں کے کمشنر رابرٹ ہیملٹن(Robert Hamilton) کی فرمائش پر تحریر کیا۔یہ تاریخ کی کوئی مستقل کتاب نہیں ہے بلکہ ایک حوالہ جاتی نوعیت کی ہے۔اس میں امیر تیمور صاحب قرآن سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک تقریباً 43 مغل بادشاہوں کے حالات درج ہیں۔اس رسالے میں سر سید کی تحقیقی اور تاریخی بصیرت کے اعلیٰ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔انھوں نے رسالے کے آخر میں اپنے مآخذ کی فہرست بھی دی ہے جس میں 1 2 فارسی کی تاریخی کتابوں کے نام ہیں۔

آثار الصنادید(1847):

523 صفحات پر مشتمل سر سید کی مشہور کتاب' آثار الصنادید' میں بھی بڑی محنت اور عرق ریزی سے تحقیق بازیافت کی کارفرمائی دیکھنے کو ملتی ہے۔یہ تاریخی نوعیت کی تحقیقی کتاب ہے، تاریخی کتابوں میں تاریخ ضلع بجنور اور تاریخ سرکشی ضلع بجنور بھی قابل ذکر ہیں۔اس کتاب میں سر سید نے دہلی کی اہم عمارات کی تاریخ، ان کی پیمائش کی تفصیلات اور عمارتوں کے آرائشی کتبات کی نقلیں پیش کی ہیں۔جنہیں ہندوستان کی قدیم تہذیب اور شاندار ماضی کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔تحقیقی اعتبار سے یہ کتاب بہت اہمیت کی حامل ہے۔سر سید نے بہت محنت، لگن اور جانفشانی سے اس کام کی تکمیل کی۔دہلی کی اکثر عمارات جو کھنڈر بن چکی تھیں، سر سید نے ان کے طول وعرض کی پیمائش کی، ان کے نقشے بنوائے، اور عمارتوں پر کندہ ان کے بانیوں کے نام اور ان پر لگے ہوئے کتبوں کے عکس اتارے تاکہ یہ دریافت کیا جاسکے کہ یہ کس نے کب اور کس مقصد سے تعمیر کروائی تھیں۔جام جم کے مقابلے آثار الصنادید میں نہ تو مآخذ کے حوالے اور ان کی تلاش وتحقیق میں حسبِ ضرورت توجہ مرکوز کی گئی ہے اور نہ ہی روایت اور درایت کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔اس کتاب کا اندازِ بیان بھی استدلال کے بجائے داستانی ہے پھر بھی ان تمام خامیوں کے باوجود اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔کتاب کو چار ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔اس کے باب اول کا عنوان' عمارات شہر یاراں' ہے، جس میں دہلی شہر کے باہر کی 130 عمارتوں کا ذکر ہے۔دوسرا باب قلعۂ معلی کی عمارات کے احوال پر مشتمل ہے، اس میں 22 عمارات کے نقشے اور کتبے کے احوال بیان کیے گئے ہیں۔تیسرے باب میں شاہجہان آباد کا ذکر ہے، اس میں 70 حویلیوں، مسجدوں، مندروں، بازاروں، باؤلیوں اور کنوؤں کے ذکر کو محیط ہے، جبکہ چوتھا باب ان قلعوں اور شہروں کے بیان میں ہے جو سمبت 44 بکرمی سے لے

کر عہدِ سرسید تک دہلی میں آباد ہوئے تھے۔ اسی باب میں دہلی کی آب وہوا اور اردو زبان کی پیدائش وارتقا کے حوالے سے بعض تحقیقی مباحث شامل ہیں۔ اس میں دہلی کے مشاہیر مثلاً مشائخ، علماء، فقراء، اطبا، شعراء، خوش نویس، مصور، موسیقار وغیرہ کے احوال بھی درج کیے گئے ہیں۔

رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند (1858)

تحریکِ آزادی اور غدر کے اسباب وعوامل کا جائزہ لیتے ہوئے سرسید نے ایک رسالہ اسباب بغاوت ہند تحریر کیا، جس کا مقصد انگریزوں کے دلوں میں ہندوستانیوں، بالخصوص مسلمانوں کے تئیں درآنے والی بدگمانی کو دور کرنا نیز حکومت کو عوام کی مشکلات اور مصائب سے واقف کرانا تھا۔ یہ رسالہ اس وقت تحریر کیا گیا جب 1857 کے غدر کی ناکامی کے بعد اس کی تمام تر ذمہ داریاں مسلمانوں پر تھوپ دی گئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان سب سے زیادہ موردِ عتاب ٹھہرائے گئے۔ سرسید نے انگریزوں کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے یہ رسالہ تحریر کیا۔ اس رسالے میں 'سرکشی' کی تعریف، اقسام اور اسباب وغیرہ کو تحقیقی بنیادوں پر بیان کیا گیا ہے۔ اس میں سرسید نے بغاوت کے اسباب وعلل کی نشاندہی کرتے ہوئے نہ صرف واقعات کا تجزیہ کیا ہے بلکہ منطقی انداز میں واقعات کو ترتیب دے کر صحیح نتائج اخذ کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کی کوئی سازش نہیں تھی بلکہ غدر انگریزوں کی ہی غلط پالیسیوں کا نتیجہ تھا۔

خطباتِ احمدیہ (1870)

یہ سرسید کی خالص مذہبی تصنیف ہے، جو سر ولیم میور (William Moore) لیفٹننٹ گورنر صوبہ شمال مغربی کی 'لائف آف محمدؐ' نامی کتاب کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ سر ولیم میور نے اس کتاب میں رسول خداؐ کی سیرت کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے رسول خدا کی سیرت پر سخت اعتراضات نیز قسم قسم کی تہمتیں عائد کی تھیں، جس نے سرسید کو شدید زک پہنچائی۔ انھوں نے ولیم میور کے الزامات کی تردید اور اس کا جواب دینے کے لیے انگلینڈ کا سفر اختیار کیا اور وہاں برٹش میوزیم اور دوسری لائبریریوں سے استفادہ کرکے ولیم میور کے الزامات کا جواب دیا۔ اس کام کے لیے سرسید کو عربی، فارسی اور دیگر مشرقی زبانوں کی کتابوں سے تحقیق کرکے مواد حاصل کرنا پڑا۔ یہ کتاب محض سر ولیم کا جواب ہی نہیں بلکہ دیگر موضوعات پر بھی عالمانہ اور محققانہ بحثوں کا احاطہ کرتی ہے۔ کتاب بارہ حصوں میں منقسم ہے۔ اپنے تحقیقی معیار اور مذہبی نقطۂ نظر سے اس کتاب کی اہمیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ سرسید کی مذہبی تحقیقات کے حوالے سے محمود الٰہی لکھتے ہیں:

> ''تبئین الکلام' سے 'تفسیر القرآن' تک سرسید نے تحقیق کے اس حصے کو اپنایا جو تخلیق کا درجہ اختیار کرلیتا ہے۔ تقلید اور روایت پرستی کی گرفت سے آزاد ہونا، مآخذ کی چھان بین کرکے حقائق کا دریافت کرنا، واقعات کے اسباب کو ڈھونڈنا اور ان کو ایک سلسلے میں لانا اور رائے قائم کرنا، مسلمات کی نئی تعبیر اور اس کی بنیاد پر روشن مستقبل کی تاسیس سرسید کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ یہ ساری باتیں اس ماحول کے لیے نئی تھیں جہاں عربی کا احترام

کیا جاتا تھا۔ فارسی کی قدر و قیمت کا اندازہ تھا اور اردو بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ یہ باتیں سر سید کو متکلمین اسلام کے علم، عقائد اور مغرب کے جدید اصول تحقیق کے امتزاج کے نتیجے میں ملی تھیں، جن سے ان کے معاصرین نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔'' (ڈاکٹر سلطانہ بخش (مرتبہ) اردو میں اصول تحقیق، 2012، لاہور ص230)

آئینِ اکبری:

سرسید نے، ادب، مذہب، تاریخ اور عمرانیات غرض کہ ہر شعبہ ہائے علوم وفنون میں تحقیقی کارنامے انجام دیے ہیں۔ انھوں نے تاریخ کی کتاب 'آئین اکبری' (مصنفہ ابوالفضل) کی تحقیق و تدوین کا بھی فریضہ انجام دیا۔ فارسی زبان کی اس کتاب میں اکبر اعظم کے ذریعہ عائد کردہ قوانین وضوابط کی تفصیلات درج ہیں۔ اصلاً یہ کتاب پانچ دفتروں پر محیط تھی، لیکن سرسید نے اوّل، دوم، چہارم اور پنجم دفتر کو ہی اپنی تحقیق میں شامل کیا۔ اس کتاب کی زبان اور اسلوب نہایت مشکل تھے، اس میں جا بجا اعداد و شمار کے جدول اور نقشے بھی درج تھے، لیکن سرسید نے محنت شاقہ سے اس کے مشکل مطالب، اعداد و شمار اور نقشوں کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر قارئین کے لیے آسان کر دیا۔

تاریخ فیروز شاہی (1862)

سرسید نے ضیاالدین برنی کی تصنیف 'تاریخِ فیروز شاہی' کو ترتیب وتدوین کے بعد 1862 میں شائع کیا۔ اس کتاب میں غیاث الدین بلبن کے آغازِ حکومت (1265) سے فیروز شاہ تغلق تک کے سلاطین دہلی تک کی تاریخ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ سرسید کے سامنے اس کتاب کے چار نسخے تھے، جس میں اختلاف نسخ بھی پایا جاتا تھا۔ سرسید نے نسخوں کے اختلاف کے سلسلہ میں انتہائی تحقیق کی ہے، چونکہ نسخے ناقص تھے، جن کے سبب سرسید کی تحقیق میں کئی اغلاط راہ پا گئی ہیں۔ پھر بھی ان خامیوں کے باوجود تاریخ فیروز شاہی کی تحقیق وتدوین سرسید کا ایک علمی اور تاریخی کارنامہ ہے، جو سلاطین دہلی اور عہدِ فیروز شاہی سے متعلق معلومات کا مستند ماخذ ہے۔

توزک جہانگیری

دراصل یہ کتاب بادشاہ نورالدین جہانگیر (1605 تا1626) کی خود نوشت سوانح عمری اور ادبی اور تاریخی لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے۔ سرسید نے دہلی کالج کے سرپرست جان پٹن گبنش کی ایما اور مغل بادشاہوں کے کتب خانوں میں موجود مخطوطوں کی مدد سے تحقیق کے اصولوں کے مدنظر اس کتاب کی تدوین کا کام انجام دیا۔

خواجہ الطاف حسین حالی (1914-1837)

حیات سعدی (1886)

الطاف حسین حالی کی یہ تحقیقی کتاب شیخ سعدی کے حالات اور کلام پر محیط ہے، جو 1886 میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس کتاب کی تحقیق کے دوران حالی کے سامنے کوئی مستند مراجع اور منابع نہیں تھے، پھر بھی حالی نے سعدی سے متعلق دستیاب مواد کا تحقیقی جائزہ لے کر ان کی حیات سے متعلق اہم نتائج تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ تحقیق کے دوران حالی نے جن ثانوی ماخذ سے مدد لی ہے ان کی

نشاندہی بھی کردی ہے۔اس میں شبلی نے سعدی کی عمر، ان کے استاد کا سن وفات جیسے امور کی تحقیق کرنے کے ساتھ ہی سعدی سے متعلق ان غلط بیانیوں کو بھی مسترد کیا جو اس وقت مشہور تھیں۔اس سلسلہ میں حالی نے 'گلستاں' (نثری تصنیف) اور 'بوستاں' (شعری تصنیف) کی حکایات کی بنیاد پر سعدی کے حالات اخذ کیے ہیں۔اس کتاب میں حالی نے سعدی کے کلام پر ناقدانہ بحث کرتے ہوئے انہیں دوسرے شعراء سے تقابل کے میزان پر بھی پرکھا ہے۔

یادگارِ غالب (1897)

حالی کا دوسرا اہم تحقیقی کارنامہ ان کی تصنیف 'یادگارِ غالب' (1897) ہے جو نامی پریس کانپور سے شائع ہوئی۔اس کتاب کی تصنیف کا مقصد غالب کی شاعرانہ عظمت کا اظہار تھا، جس کے لیے حالی نے غالب کے حالات و واقعات، تصانیف، دوست احباب کے بیانات کو یکجا کر کے تحقیقی طریقۂ کار سے غالب کی عظمت کو طشت از بام کیا ہے۔اس طرح غالب کی ولادت، ان کے خاندان، مسکن، سفر، شاگرد، دوست، قلعہ سے متعلق معاملات، وظیفہ، اخلاق، تعلیم، مرض اور وفات سے متعلق معلومات کی تحقیق کی گئی ہے۔حالی نے غالب کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کی عظمت کو قارئین تک پہنچانے کے لیے غالب کے کلام کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے، جس میں غالب کے کلام اور ان کی فنی صلاحیتوں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔غالب کی نثر و نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے دیگر شعراء سے ان کے رتبہ کو اعلیٰ و ارفع بتایا ہے۔

حیاتِ جاوید (1903)

حالی کی یہ تصنیف انیسویں صدی کی ہمہ جہت، مختلف الجہت اور عبقری شخصیت سرسید احمد خاں کی سوانح کا احاطہ کرتی ہے۔اس کتاب میں حالی نے سرسید کی حیات اور ان کے مختلف علمی و ادبی، تحقیقی و تنقیدی اور عوامی وفلاحی کارناموں کو حیطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے۔اس کے علاوہ علی گڑھ تحریک اور اس عہد کی سیاسی و سماجی تاریخ کا ایک دستاویز بھی ہے۔کتاب تصنیف کرتے وقت حالی کی پوری توجہ متن پر مرکوز رہی۔اس سلسلہ میں حالی نے سرسید کی تصانیف، مکتوبات اور تحریر و تقریر سرسید کے دوستوں، اعزا و اقربا کے بیانات کو اہم اور بنیادی ماخذ کے طور پر برتا نیز اپنی علمی اور تحقیقی معلومات کی بنا پر سرسید کی مفصل اور مکمل سوانح عمری ترتیب دی۔ایک ہزار صفحات پر مشتمل اس کتاب کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔حصۂ اول میں سرسید کے بچپن سے لے کر وفات تک کے واقعات کو تاریخی سنین کے ساتھ درج ہیں، حصہ دوم میں سرسید کی سیاسی، ملکی، قومی اور مذہبی خدمات کا تفصیلی بیان ہے۔

علامہ شبلی نعمانی (1914-1857)

المامون (1887)

دولتِ عباسیہ کے مشہور خلیفہ مامون الرشید کے سوانحی حالات اور ان کے عہد کی تہذیبی و تمدنی تاریخ پر مشتمل 'المامون' (1887) شبلی کی اولین تصنیف ہے، جو تحقیق کی بنیادوں پر ماخذات کی نشاندہی کرتی ہے۔اس کو دو حصوں میں بانٹا گیا ہے۔اس کے پہلے حصہ میں اسلام میں خلافت کی ابتدا اور اسباب و علل اور خاندانِ بنوامیہ سے خاندان بنوعباس تک کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔جبکہ دوسرے حصہ میں مامون الرشید کے عہد میں سلطنت کے امور و انتظامات، مملکت کی آمدنی، فوجی انتظامات، عدل

وانصاف اوراس سے متعلقات کا بیان ہے۔اس حصّے میں مامون الرشید کے حالاتِ زندگی،اس کے عادات واطوار اوراس کے مشاغل ومصروفیات کے ساتھ ساتھ اس کے عہد کی تصویر کھینچی گئی ہے۔

سیرۃ النعمان(1891)

یہ کتاب دراصل امام ابوحنیفہ کی حالات زندگی پر مشتمل ہے، جو(1891) لکھی گئی۔مولانا شبلی کو امام ابوحنیفہ سے بہت عقیدت تھی،اور مسلکی مسائل میں انہی کا تتبع کرتے تھے۔یہ کتاب بھی دوحصوں میں ہے۔پہلے حصہ میں امام ابوحنیفہ کے سوانحی حالات زندگی،جبکہ دوسرے حصہ میں علم عقائد،حدیث،اصول حدیث،فقہ اور اصول فقہ کے اصول ونظریات بیان کیے گئے ہیں۔

الفاروق(1899)

'الفاروق' 1899 میں منظر عام پر آئی،اس میں خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کی حیات مبارکہ کا جامع،مستند اور تحقیقی بیان ہے۔کتاب کے پہلے حصہ میں حضرت عمرؓ کے حسب نسب،ولادت،سن رشد،قبولِ اسلام اور ہجرت سے لے کر خلافتِ اسلامیہ اوران کے ذریعہ کی گئیں فتوحات کا ذکر ہے۔جبکہ دوسرے حصہ میں حضرت عمر فاروق کے عہد کی فتوحات کا تذکرہ ہے۔اس حصہ میں نظامِ حکومت اور جمہوریت کے اصول وضوابط اوراغراض پر روشنی ڈالی گئی ہے۔عہد فاروقی کے محکمات جیسے محاصل،عدالت،فوج ، پولیس،مالیات وغیرہ کی تفصیلات درج ہیں۔آخر میں شبلی نعمانی نے حضرت عمر فاروق کے تقویٰ،پرہیزگاری،عادات وخصائل کے ذکر میں تحقیقی طریق کار اپنا کر نتائج کا استنباط کیا ہے۔

'الغزالی'(1901)

شبلی نے یہ کتاب حیدرآباد کے دورانِ قیام تصنیف کی۔شبلی کی کتاب 'علم الکلام' کے تیسرے باب میں جن ائمہ علم کلام کی سوانح عمریاں لکھی گئی تھیں،طوالت کے خوف سے انہیں 'الغزالی' میں جمع کر دیا گیا ہے۔ائمہ کلام کی سوانح عمریوں کے علاوہ اس میں امام غزالی کی سوانح عمری کو بھی تحقیق کے جدید اصولوں کے تحت مستند ماخذ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

'سوانح مولانا روم'(1906)

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ اس میں سوانح مولانا روم کو پیش کیا گیا ہے۔حالانکہ اس میں مولانا روم کے سوانحی عناصر بہت کم ہیں البتہ مثنوی مولانا روم سے مستخرج ہونے والے کلامی مسائل پر تحقیقی انداز میں بحث کی گئی ہے۔

سیرۃ النبی(1918)

1918 میں شائع ہونے والی شبلی کی یہ آخری تصنیف ہے، جو چھ جلدوں پر مشتمل ہے۔اس میں حضرت محمدؐ کی حیات مبارکہ کے روشن پہلوؤں کو پیش کر کے یوروپین مصنفین کے اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔یہ کتاب تحقیقی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔شبلی کے سامنے ان مغربی مصنفین کی کتابیں تھیں،جن سے اہل اسلام خوفزدہ اور شکوک کے دائرے میں تھے،ان کا ایمان رفتہ رفتہ کمزور ہوتا جارہا تھا،اس لیے شبلی نے ایک عظیم مقصد کے تحت یہ کتاب لکھی،تاکہ مسلمانوں کے شکوک وشبہات کو دور کیا جا سکے۔چونکہ مغربی مصنفین کے اشکال کو بھی دور کرنا تھا یہی وجہ ہے کہ شبلی نے مغربی تحقیق کے اصولوں کے تحت یہ کتاب تصنیف

کی۔

شعرالعجم (1907)

یہ فارسی شاعری کی پہلی مبسوط اور تحقیق پر مبنی تاریخی کتاب ہے۔شبلی کتاب سے پہلے اس کے ماخذ و مصادر سے بحث کرتے ہوئے شعرالعجم کے ماخذ کی ایک فہرست پیش کی ہے،جس میں کتاب کا نام،مصنف اور مولفین کا تعارف پیش کرتے ہوئے ان پر تبصرہ کیا ہے۔اس کے بعد فارسی کے شعر وادب پر یورپی مولفین و محققین کی تصنیفات کا ذکر کیا ہے۔گویا یہ کتاب تحقیقی اور تنقیدی مباحث پر مشتمل ہے۔اس کے پہلے حصہ میں حقیقتِ شعر پر بحث کے بعد خاندانِ سامانیہ کے شعراء رودکی اور دقیقی پھر عہدِ غزنوی کے شعراء عنصری،فرخی،فردوسی،اسدی طوطی اور منوچہری کے حالات اوران کے کلام پر تنقیدی تجزیہ کیا ہے۔اس کے بعد سنائی،عمر خیام،انوری اور نظامی گنجوی کے حالات ہیں۔دوسری جلد میں دورِ متوسطین کی شاعری کی خصوصیات پھر فریدالدین عطار،کمال اسماعیل،شیخ سعدی،امیر خسرو،سلمان ساوجی،حافظ شیرازی اور ابن یمین کے حالات زندگی اور شاعرانہ خصوصیات سے بحث کی ہے۔تیسری جلد میں حسب سابق پہلے عہد متاخرین کے شعراء کی خصوصیات اس کے بعد فغانی شیرازی،فیضی،عرفی،نظیری،طالب آملی،مرزا صائب اصفہانی اور ابو طالب کلیم کے احوال وآثار پر روشنی ڈالی ہے۔چوتھی جلد کے باب اول میں حقیقت شعر سے بحث کی گئی ہے،جبکہ دوسرے باب میں 'ایران میں شاعری کیوں کر پیدا ہوئی؟' 'شاعری کی تدریجی رفتار'،'عربی شاعری کا اثر فارسی شاعری پر'،'شخصی اور خودمختارانہ حکومت کا اثر'،'نظام حکومت کا اثر شاعری پر'،'فوجی زندگی کا اثر'،'اختلاف معاشرت کا اثر'،'آب وہوا اور مناظرِ قدرت کا اثر' جیسے موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔

محمد حسین آزاد(1830-1910)

آب حیات(1880,1883)

'آبِ حیات' کا شمار شعرائے اردو کے تذکروں میں ہوتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ یہ تذکروں کے سلسلہ کی آخری کڑی ہے۔ تذکروں میں تحقیقی عناصر پائے جاتے تھے یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کی اہمیت مسلم ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1880 میں شائع ہوئی۔آزاد نے اس کتاب کی ترتیب وتنظیم کے سلسلہ میں نہایت احتیاط برتی ہے۔انھوں نے سب سے پہلے اردو زبان کی پیدائش ،اس کی تاریخ اور اردو پر دوسری زبانوں کے اثرات سے بحث کی ہے۔اس کے بعد اردو نظم نگاری کے ارتقا کو مختلف ادوار میں تقسیم کرکے منتخب شعراء کے احوال اور منتخب کلام کو بالترتیب پیش کیا ہے۔آزاد کی یہ خصوصیت ہے کہ انھوں نے ماقبل میں لکھے گئے تذکروں سے جداگانہ انداز اختیار کیا۔ماقبل کے تذکروں میں شعرائے اردو کے حالات مختلف منتشر حالت میں ملتے تھے لیکن آزاد نے ان کو یکجا کرکے تفصیل کے ساتھ نقل کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔

تحقیقی اعتبار سے آبِ حیات ایک کمزور تصنیف ہے کیونکہ آزاد نے بغیر تحقیق کے معتبر اور غیر معتبر تمام روایات کو اپنے تخیل کی مدد سے داستانی انداز میں پیش کردیا ہے جس کے سبب ان کے پیش کردہ حقائق اور نتائج مسخ ہوگئے ہیں۔آزاد کے تسامحات میں بہت سی ایسی غلطیاں ہیں جو تحقیقی اصول کے منافی ہیں،مثلاً آزاد نے میر کو اردو میں واسوخت کا موجد قرار دیا ہے جب کہ میر کے

علاوہ آبرو، ناجی، تاباں اور سودا کے واسوخت بھی ملتے ہیں اور یہ شعراء عمر میں میر سے بڑے ہیں، پھر یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ میر ہی واسوخت کے موجد ہیں، جبکہ آزاد نے اپنے بیان میں کسی شواہد سے کام نہیں لیا ہے۔ اسی طرح آزاد نے غالب کے دیوانِ اردو کا سن اشاعت 1849 لکھا ہے جب کہ اردو دیوان پہلی بار سید محمد خاں کے مطبع سے 1257ھ مطابق 1841ء میں شائع ہو چکا تھا۔ یہ اور اسی طرح کی بہت سی ایسی باتیں آزاد نے لکھ دی ہیں جنہیں تحقیق کی کسوٹی پر نہیں پرکھا ہے اور نہ ہی اپنی بات کے ثبوت میں شواہد و براہین سے کام لیا ہے۔ پھر بھی چند خامیوں کے باوجود آبِ حیات کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ ظاہر ہے کہ آزاد کے سامنے ادبی تاریخ یا تحقیق کا کوئی باقاعدہ نمونہ نہیں تھا۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ آزاد نے آبِ حیات لکھ کر ادبی تاریخ نویسی اور تحقیق مباحث کا راستہ ہموار کیا۔

سخن دان فارس (1907)

آزاد نے اپنے خطبات کو جو لاہور ٹریننگ کالج میں دیے تھے، جمع کر کے 'سخن دانِ فارس' کی شکل میں (1907) میں شائع کیا۔ اس میں فارسی زبان کی تحقیق و تاریخ کے ساتھ فارسی کے صوت، صرف، نحو اور معنی کی تعمیر و تشکیل جیسے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں، حصہ اول میں دو خطبے تقابلی لسانیات پر ہیں، جس میں زبان کی پیدائش کے اسباب اور اس کے ارتقا پر بحث کی گئی ہے، جبکہ دوسرے حصہ میں قدیم فارس کی تاریخ، فارسی سے قبل زبانوں کی تاریخ، فارسی زبان و ادب اور وہاں کے تہذیب و تمدن جیسے مباحث شامل ہیں۔ اس کے علاوہ آزاد نے دیوانِ ذوق کی تدوین کا کام بھی انجام دے کر 1890 میں شائع کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ذوق کے قلمی مسودوں، مختلف بیاضوں اور احباب کے بیانات سے استفادہ کیا۔ انھوں نے ذوق کے سوانحی حالات کی تحقیق کر کے ان کی غزلوں اور قصائد پر حاشیہ نگاری کا کام کیا۔

محسن الملک (1817-1907)

محسن الملک سرسید کے خاص رفقاء میں سے تھے۔ انھوں نے سرسید کی علمی، ادبی، اور فلاحی کاموں کے ساتھ سرسید کے مشن میں ساتھ دیا۔ انھوں نے باقاعدہ طور پر تحقیق کی کوئی کتاب تصنیف نہیں کی، البتہ سرسید نے جن مباحث کو اٹھایا محسن الملک نے اپنے معتدل اور متوازن طرزِ فکر سے ان کو نئی سمت عطا کی۔ وہ ایک تحقیقی ذہن کے مالک تھے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے سرسید کے پیش کردہ نتائج کو من و عن قبول نہیں کیا بلکہ حقائق کی بازیافت کے بعد نئے نظریات کی تشکیل کی۔ محسن الملک کی تحقیقی اور تخلیقی صلاحیت ان کے مضامین میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان کے یہ مضامین تہذیب الاخلاق میں شائع ہوتے تھے مثلاً 'تقلید اور عمل بالحدیث'، 'تفسیر بالرائے'، 'تطبیق منقول'، 'مقدمہ تاریخ ابن خلدون' اور 'مسلمانوں کی ملکی اور علمی ترقیوں کی تاریخ' (لیکچر) وغیرہ مضامین میں تحقیقی عناصر دیکھے جاسکتے ہیں۔

مولوی ذکاءاللہ (1832-1910)

سرسید کے رفقاء میں مولوی ذکاءاللہ سرسید کی علمی اور فلاحی کاموں میں پیش پیش رہے۔ کثیر التصانیف واقع تھے۔ انھوں نے بہت سی تخلیق کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں کی کتابوں کے تراجم کر کے اردو کو علمی زبان ثابت کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ انھوں

نے ریاضیات، تاریخ، سائنس، فلسفہ، جغرافیہ اور دیگر اہم علوم وفنون پر متعدد کتابیں لکھیں۔'تاریخ ہندوستان' ان کی معرکۃ الآرا اور انتہائی ضخیم کتاب ہے جو 18 جلدوں میں ہے۔ اس میں عہدِ قدیم سے لے کر عہدِ وسطیٰ کی حکومت اور انگریزوں کے عہد کی تاریخ درج کی گئی ہے۔ انھوں نے ملکہ معظّمہ وکٹوریا اور سمیع اللہ خاں سابق جج رئیس دہلی کی سوانح عمریاں بھی مرتب کیں۔

ڈپٹی نذیر احمد (1836-1910)

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی تصانیف اور لیکچروں کے ذریعے سرسید کی تحریکات کو تقویت پہنچائی۔ انھوں نے ناول نگاری کے ساتھ قانون کی کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔ ریاضی اور علوم دینوی کے ساتھ مذہبی موضوعات پر بھی ان کی تصانیف۔ اخلاقی موضوعات پر 'ترجمہ قرآن شریف'، 'حقوق الفرائض'، 'الاجتہاد عقائد اسلامی کا عقلی ثبوت' اور 'امہات الامہ' وغیرہ تصنیفات میں تحقیق کی بازیافت کا عمل سرگرداں دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح کے تحقیقی کارناموں میں 'ادعیۃ القرآن' میں دعاؤں کو یکجا کر کے ان پر مفید حاشیے لکھے ہیں۔ 'رسالہ مبادی الحکمت' میں علم منطق کی تعلیم کے جدید طریقے، 'ما ینفک فی الصرف' میں علم صرف کے مشکل مسائل کو جدید انداز میں ترتیب دے کر آسان بنا دیا ہے۔

گارساں دتاسی (1794–1878)

اردو ادب کے فروغ، ترویج اور ترقی میں گارساں دتاسی کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے اردو ادب سے متعلق سنجیدہ تحقیقات کا سلسلہ شروع کیا۔ گارساں نے 1825 میں میر تقی میر کی مثنوی ''تنبیہ الخیال' کو تحقیق کے جدید اصولوں کے مطابق ترتیب دیا۔ 1833 میں ولی کے کلام کو مدون کر کے شاہی پریس سے شائع کیا۔ اس کے علاوہ اردو شعراء کے کلام کی ترتیب و تدوین کا کام انجام دیا۔ تاریخ ادبیات ہندوی گارساں دتاسی کا اہم کارنامہ ہے، جو دو جلدوں میں ہے اور 1839 اور 1847 میں بالترتیب شائع ہوئی۔ اس میں 738/ اردو اور ہندی شعراء کے احوال اور تصنیفات کے احوال درج ہیں۔ یہ ادب کی تحقیق و تدوین میں دتاسی کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔ جس پر اس نے اپنی زندگی کے کئی سال صرف کیے اور مواد کی فراہمی تحقیق و تدوین میں صرف تذکروں پر قناعت کرنے کے بجائے خطوط مضامین و رسائل مختلف فہرستوں قلمی نسخوں اور گرامر کی کتابوں سے بھی استفادہ کیا۔ تحقیق و تدوین کے میدان میں گارساں دتاسی کا مرتبہ اس لیے اور بڑھ جاتا ہے کہ اس نے فرانس میں رہ کر ہندوستان کی ادبی تاریخ پر اس درجہ توجہ کی اور اپنی اس سرگرمی میں ایسی جاں فشانی دکھائی کہ وہ ہندوستان میں رہنے والے ادب کے طالب علموں کے لیے مستند حوالہ بن گئے۔ کتاب کی معنویت اس طرح اور بڑھ جاتی ہے کہ آخر میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔ مذکورہ کتابوں کے علاوہ مختلف ادبی موضوعات پر اس نے مقالے بھی تحریر کیے۔ دتاسی کو اردو ہندی زبان و ادب سے بہت دلچسپی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان زبانوں کے متعلق مختلف موضوعات مثلاً قواعد، تنقید و تاریخ ادبیات پر اس نے مقالے اور کتابیں لکھیں نیز شاعروں اور نثر نگاروں کی تخلیقات کا انتخاب بھی پیش کیا۔

3.5 آپ نے کیا سیکھا

- تمام علوم وفنون کا ارتقا اور اس کی ترقی تحقیق کی ہی رہین منت ہے۔

- تحقیق کا مطلب صرف حقائق کا دریافت کرنا نہیں ہے یا حقائق کو جمع کر دینا ہی تحقیق نہیں ہے بلکہ تحقیق کا صحیح مقصد یہ ہے کہ حقائق کا از سرِ نو جائزہ لے کر نئے نتائج تک پہنچنے کی سعی کی جائے۔
- اردو میں تحقیق کی ابتدا شعرائے اردو کے تذکروں سے ہوئی۔
- اردو میں تذکرہ نگاری کا با قاعدہ آغاز میر تقی میر کے تحریر کردہ تذکرہ ''نکات الشعراء'' سے ہوا، جس کا سلسلہ محمد حسین آزاد کی تصنیف ''آب حیات'' پر اختتام پذیر ہوا۔
- اردو میں تحقیق کی با قاعدہ بنیاد انیسویں صدی کے نصف آخر میں سر سید نے رکھی۔
- تاریخی تحقیق آثار الصنادید 1847 میں منظر عام پر آئی۔
- الطاف حسین حالی کی تحقیقی کتاب ''حیات سعدی'' شیخ سعدی کے حالات اور کلام پر محیط ہے، جو 1886 میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔
- علامہ شبلی نعمانی کی ''شعر العجم'' فارسی شاعری کی پہلی مبسوط اور تحقیق پر مبنی تاریخی کتاب ہے۔
- محمد حسین آزاد نے آبِ حیات لکھ کر ادبی تاریخ نویسی اور تحقیق مباحث کا راستہ ہموار کیا۔
- اردو ادب کے فروغ، ترویج اور ترقی میں گارساں دتاسی اور اس کی تحقیقی کتابیں اہمیت کی حامل ہیں۔

3.6 اپنا امتحان خود لیجیے

سوال 1: اردو میں تحقیق کی ابتدا کب ہوئی؟

سوال 2: 'آب حیات' پر ایک نوٹ لکھیے۔

سوال 3: سر سید کی کسی تحقیقی کتاب کا نام اور اس کی خصوصیات بتائیے؟

سوال 4: خطبات احمدیہ کس موضوع پر ہے؟

سوال 5: کسی مستشرق محقق کا نام اور اس کے کارنامے بتائیے؟

3.7 سوالات کے جوابات

جواب 1: اردو میں تحقیق کی ابتدا شعرائے اردو کے تذکروں سے ہوئی۔ یہ تذکرے عموماً شعراء کی مختصر سوانح اور ان کے کلام کے انتخاب پر مشتمل ہوتے تھے۔ اردو میں تذکرہ نگاری کا با قاعدہ آغاز میر تقی میر کے تحریر کردہ تذکرہ ''نکات الشعراء'' سے ہوا، جس کا سلسلہ محمد حسین آزاد کی تصنیف ''آب حیات'' پر اختتام پذیر ہوا۔ ''آب حیات'' کو اس کی تمام تر تحقیقی خامیوں کے باوجود تحقیق وتنقید کی اہم تصنیف سمجھا جاتا ہے۔ اس دوران بہت سے تذکرے لکھے گئے جن پر آنکھ بند کر کے یقین نہیں کیا جا سکتا۔ اردو میں تحقیق کی با قاعدہ بنیاد انیسویں صدی کے نصف آخر میں سر سید نے رکھی۔ جن میں ان کی تاریخی تحقیق آثار الصنادید 1847 میں منظر عام پر آئی۔ آئین اکبری، تزک جہانگیری اور تاریخ فیروز شاہی سر سید کے تحقیقی کارنامے ہیں۔ سر سید کے ساتھ ساتھ ان کے رفقاء محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی وغیرہ نے اردو میں با قاعدہ تحقیق کی

روایت کو مستحکم کیا۔حالی نے تاریخی شخصیات کی سوانح لکھ کر تحقیق کے بے مثال نمونے یادگار چھوڑے، ان کی تصانیف ''یادگار غالب''، 'حیات سعدی' اور ''حیات جاوید'' میں تحقیق کے معیاری نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔شبلی نعمانی تحقیقی مزاج کے مالک تھے۔انہیں اپنے معاصرین میں استناد کا درجہ حاصل ہوا۔شبلی کی تصانیف ''المامون''، ''سیرت النعمان''، 'الفاروق''، ''الغزالی''، ''سوانح مولانا روم' وغیرہ تحقیق وتنقید کی سوانح عمریاں ہیں۔

جواب 2: محمد حسین آزاد کی تصنیف 'آب حیات' تحقیقی اور تنقیدی دونوں حیثیت رکھتی ہے۔اس میں محمد حسین آزاد نے سب سے پہلے اردو زبان کی پیدائش، اس کی تاریخ اور اردو پر دوسری زبانوں کے اثرات کے سلسلے میں تحقیقی وتنقیدی بحث کی ہے۔اس کے بعد انھوں نے اردو نظم نگاری کے ارتقا کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے منتخب شعراء کے احوال اور منتخب کلام کو بالترتیب پیش کیا ہے۔آزاد کی یہ خصوصیت ہے کہ انھوں نے ماقبل میں لکھے گئے تذکروں سے جداگانہ انداز اختیار کیا۔ماقبل کے تذکروں میں شعرائے اردو کے حالات مختلف منتشر حالت میں ملتے تھے لیکن آزاد نے ان کو یکجا کر کے تفصیل کے ساتھ نقل کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔

آب حیات میں آزاد سے بعض تسامحات بھی ہوئے جو تحقیقی اصول کے منافی ہیں، مثلاً آزاد نے میر کو اردو میں واسوخت کا موجد قرار دیا ہے جب کہ میر کے علاوہ آبرو، ناجی، تاباں اور سودا کے واسوخت بھی ملتے ہیں اور یہ شعراء عمر میں میر سے بڑے ہیں، پھر یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ میر ہی واسوخت کے موجد ہیں، جبکہ آزاد نے اپنے بیان میں کسی شواہد سے کام نہیں لیا ہے۔اسی طرح آزاد نے غالب کے دیوانِ اردو کا سن اشاعت 1849 لکھا ہے جب کہ اردو دیوان پہلی بار سید محمد خاں کے مطبع سے 1257ھ مطابق 1841ء میں شائع ہو چکا تھا۔یہ اور اسی طرح کی بہت سی ایسی باتیں آزاد نے لکھ دی ہیں جنہیں تحقیق کی کسوٹی پر نہیں پرکھا ہے اور نہ ہی اپنی بات کے ثبوت میں شواہد و براہین سے کام لیا ہے۔پھر بھی چند خامیوں کے باوجود آبِ حیات کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ظاہر ہے کہ آزاد کے سامنے ادبی تاریخ یا تحقیق کا کوئی باقاعدہ نمونہ نہیں تھا۔لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ آزاد نے آبِ حیات لکھ کر ادبی تاریخ نویسی اور تحقیق مباحث کا راستہ ہموار کیا۔

جواب 3: سرسید کی تصنیف آثارالصنادید تاریخی نوعیت کی تحقیقی کتاب ہے۔اس میں سرسید نے دہلی کی اہم عمارات کی تاریخ، ان کی پیمائش کی تفصیلات اور عمارتوں کے آرائشی کتبات کی نقلیں پیش کی ہیں۔جنہیں ہندوستان کی قدیم تہذیب اور شاندار ماضی کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔تحقیقی اعتبار سے یہ کتاب بہت اہمیت کی حامل ہے۔سرسید نے بہت محنت، لگن اور جانفشانی سے اس کام کی تکمیل کی۔دہلی کی اکثر عمارات جو کھنڈر بن چکی تھیں، سرسید نے ان کے طول وعرض کی پیمائش کی، ان کے نقشے بنوائے، اور عمارتوں پر کندہ ان کے بانیوں کے نام اور ان پر لگے ہوئے کتبوں کے عکس اتارے تاکہ یہ دریافت کیا جاسکے کہ یہ کس نے کب اور کس مقصد سے تعمیر کروائی تھیں۔

آثارالصنادید کا اندازِ بیان استدلال کے بجائے داستانی ہے پھر بھی ان تمام خامیوں کے باوجود اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔کتاب کو چار ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔اس کے باب اول کا عنوان 'عماراتِ شہر یاراں' ہے، جس میں دہلی شہر کے

باہر کی 130 عمارتوں کا ذکر ہے۔ دوسرا باب قلعۂ معلیٰ کی عمارات کے احوال پر مشتمل ہے، اس میں 22 عمارات کے نقشے اور کتبے کے احوال بیان کیے گئے ہیں۔ تیسرے باب میں شاہجہان آباد کا ذکر ہے، اس میں 70 حویلیوں، مسجدوں، مندروں، بازاروں، باؤلیوں اور کنوؤں کے ذکر کو محیط ہے، جبکہ چوتھا باب ان قلعوں اور شہروں کے بیان میں ہے جو سمبت 44 بکرمی سے لے کر عہدِ سرسید تک دہلی میں آباد ہوئے تھے۔ اسی باب میں دہلی کی آب و ہوا اور اردو زبان کی پیدائش وارتقا کے حوالے سے بعض تحقیقی مباحث شامل ہیں۔ اس میں دہلی کے مشاہیر مثلاً مشائخ، علماء، فقراء، اطبا، شعراء، خوش نویس، مصور، موسیقار وغیرہ کے احوال بھی درج کیے گئے ہیں۔

جواب4: خطبات احمدیہ سرسید کی خالص مذہبی تصنیف ہے، جو سر ولیم میور (William Moore) لیفٹننٹ گورنر صوبہ شمال مغربی کی 'لائف آف محمدؐ' نامی کتاب کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ سر ولیم میور نے اس کتاب میں رسول خداؐ کی سیرت کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے رسول خدا کی سیرت پر سخت اعتراضات نیز قسم قسم کی تہمتیں عائد کی تھیں، جس نے سرسید کو شدید زک پہنچائی۔ انھوں نے ولیم میور کے الزامات کی تردید اور اس کا جواب دینے کے لیے انگلینڈ کا سفر اختیار کیا اور وہاں برٹش میوزیم اور دوسری لائبریریوں سے استفادہ کر کے ولیم میور کے الزامات کا جواب دیا۔ اس کام کے لیے سرسید کو عربی، فارسی اور دیگر مشرقی زبانوں کی کتابوں سے تحقیق کر کے مواد حاصل کرنا پڑا۔ یہ کتاب محض سر ولیم کا جواب ہی نہیں بلکہ دیگر موضوعات پر بھی عالمانہ اور محققانہ بحثوں کا احاطہ کرتی ہے۔ کتاب بارہ حصوں میں منقسم ہے۔ اپنے تحقیقی معیار اور مذہبی نقطۂ نظر سے اس کتاب کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

جواب5: گارساں دتاسی۔ اردو ادب کے فروغ، ترویج اور ترقی میں گارساں دتاسی کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے اردو ادب سے متعلق سنجیدہ تحقیقات کا سلسلہ شروع کیا۔ متعدد کتابوں کے علاوہ مختلف ادبی موضوعات پر بھی انھوں نے مقالے تحریر کیے۔ دتاسی کو اردو ہندی زبان و ادب سے بہت دلچسپی تھی۔

گارساں نے 1825 میں میر تقی میر کی مثنوی ''تنبیہ الخیال' کو تحقیق کے جدید اصولوں کے مطابق ترتیب دیا۔ 1833 میں ولی کے کلام کو مدون کر کے شاہی پریس سے شائع کیا۔ اس کے علاوہ اردو شعراء کے کلام کی ترتیب و تدوین کا کام انجام دیا۔ تاریخ ادبیات ہندوی گارساں دتاسی کا اہم کارنامہ ہے، جو دو جلدوں میں ہے اور 1839 اور 1847 میں بالترتیب شائع ہوئی۔ اس میں 738 / اردو اور ہندی شعراء کے احوال اور تصنیفات کے احوال درج ہیں۔ یہ ادب کی تحقیق و تدوین میں دتاسی کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔ جس پر اس نے اپنی زندگی کے کئی سال صرف کیے اور مواد کی فراہمی تحقیق و تدوین میں صرف تذکروں پر قناعت کرنے کے بجائے خطوط مضامین ورسائل مختلف فہرستوں قلمی نسخوں اور گرامر کی کتابوں سے بھی استفادہ کیا۔ تحقیق و تدوین کے میدان میں گارساں دتاسی کا مرتبہ اس لیے اور بڑھ جاتا ہے کہ اس نے فرانس میں رہ کر ہندوستان کی ادبی تاریخ پر اس درجہ توجہ کی اور اپنی اس سرگرمی میں ایسی جاں فشانی دکھائی کہ وہ ہندوستان میں رہنے والے ادب کے طالب علموں کے لیے مستند حوالہ بن گئے۔ کتاب کی معنویت اس طرح اور بڑھ جاتی ہے کہ آخر میں اشاریہ بھی دیا

گیا ہے۔

3.8 فرہنگ

الفاظ	معانی
عہد آفرینش	دنیا پیدا ہونے کا سال، عدم سے وجود میں آنے کا زمانہ، جو کچھ خدا نے پیدا کیا وہ وقت
ابطال	جھوٹا کرنا، باطل کرنا، غلط کرنا، کسی چیز کی صداقت یا وجود کو غلط ثابت کرنا
اجتہادی	اجتہاد سے متعلق، نئے مسائل کی کھوج کرنا، مسائل میں قیاس کرنا
ضامن	کسی کو اپنا کفیل یا ذمہ دار بنا کر پیش کرنا، بیچ میں پڑنے والا
مفروضے	مفروضہ کی جمع، فرض کیا ہوا، تسلیم کیا ہوا
لائحہ عمل	ہدف، نشانہ، منصوبہ
کتبوں	کتبہ کی جمع، وہ عبارت جو کسی عمارت یا قبر پر بطور یادگار تحریر یا کندہ ہو
اسباب	سبب کی جمع، وجہ، علت، موجب، واسطہ، وسیلہ، ذریعہ
علل	علت کی جمع، وہ چیز جو کسی دوسری چیز کے وجود کا سبب ہو، وجہ، سبب
طشت از بام	ظاہر، کھلا ہوا، مشہور، افشائے راز
مبسوط	پھیلانا، پھیلا ہوا، کشادہ

3.9 کتب برائے مطالعہ

1.	تحقیق کا فن	گیان چند جین	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ	2009
2.	ادبی تحقیق	جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	1996
3.	تحقیق و تعارف	حنیف نقوی	قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی	2013
4.	تحقیق شناسی	رفاقت علی شاہد	القمر انٹر پرائزز، لاہور	2003
5.	اردو میں ادبی تحقیق	ڈاکٹر سلطانہ بخش	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	1986

اکائی:4 تحقیق کے اصول اور طریقِ کار

4.1 اغراض ومقاصد
4.2 تمہید
4.3 تحقیق کے اصول
4.4 تحقیق کے طریقۂ کار
4.5 آپ نے کیا سیکھا
4.6 اپنا امتحان خود لیجئے
4.7 سوالات کے جوابات
4.8 فرہنگ
4.9 کتب برائے مطالعہ

4.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- تحقیق کے اصول وضوابط سے واقفیت ہو جائے گی۔
- تحقیق میں آنے والی مشکلات کو سمجھ سکیں گے۔
- تحقیق کے طریقوں کو جان سکیں گے۔
- تحقیق میں موضوع کی اہمیت کی جانکاری ہو جائے گی۔
- تحقیق کی منصوبہ بندی سے متعلق آ گاہی ہو جائے گی۔
- دوران تحقیق نظم وترتیب کو سمجھ سکیں گے۔

4.2 تمہید

اصول وضوابط' صرف تحقیق کے لیے مخصوص نہیں ہیں بلکہ تمام اہم کاموں کے لیے بعض اصول متعین ہوتے ہیں، جن کی پیروی کر کے کام کو آسانی اور کم وقت میں بہتر انداز سے کیا جا سکتا ہے۔ ہر وہ عمل جو کسی طریق کار یا اصول کے تحت تجربات اور کامیابیوں کے ہمراہ کیا جاتا ہے، اس میں افادیت کا عنصر یقین کی حد تک پایا جاتا ہے۔ تحقیقی کام بہت ذمہ داریوں سے بھرا ہوا ہے۔ یہ کام دیگر مصنفین کے مقابلے میں زیادہ پیچیدہ اور کثیر الجہات ہوتا ہے۔ تحقیق میں محض منطقی اور نظریاتی دلائل سے قاری کو مرعوب یا متاثر نہیں کیا جا سکتا۔ تحقیق کا مقصد مضبوط اور مستند دلائل پیش کر کے حقائق کو اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ تحقیق پوری معروضیت کے ساتھ حقائق کی بازیافت اور معروضیت پر منحصر ہوتی ہے۔ تحقیق کے لیے وضع کردہ اصولوں پر عمل پیرا ہو کر تجربات اور مہارتوں کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔

اصولوں کی مدد سے مقاصد کا حصول بھی آسان ہو جاتا ہے اور تحقیقی عمل میں آسانیاں پیدا ہو جاتی ہے۔ اصولوں پر عمل کر کے قلیل وقت اور کم محنت سے زیادہ نتائج حاصل ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر کام کی طرح تحقیق کے بھی بعض اصول اور طریقہ کار ہوتے ہیں، جن پر عمل کرتے ہوئے اچھے نتائج بر آمد کیے جا سکتے ہیں۔

4.3 تحقیق کے اصول

ہر کام کے لیے بعض اصول ہوتے ہیں، جن پر عمل پیرا ہو کر زیرِ نظر کام کو آسان بنایا جا سکتا ہے۔ تحقیق اپنی اہمیت وافادیت کے پیش نظر بہت سے کاموں میں اولیت حاصل کر چکی ہیں، چنانچہ تحقیق کے لیے بھی بعض اصول وطرائق وضع کیے گئے ہیں تاکہ تحقیق کے اچھے نتائج بر آمد ہو سکیں۔ چونکہ تحقیق کا مقصد کسی شے کی اصل حقیقت کا سراغ لگانا ہوتا ہے، اس لیے تحقیق کے میدان میں انتہائی احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔ تحقیق میں لگن، محنت اور دلچسپی بھی ناگزیر ہوتی ہے کیونکہ ذرا سی بے احتیاطی حقیقت کے چہرے کو مسخ کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے بعض اصول وضوابط متعین کر دیے گئے ہیں تاکہ انہیں اصولوں پر کار فرما ہو کر تحقیق کی دشوار گزار راستوں سے گزرا جائے۔ اس طرح تحقیق کا کام کرنے والوں کے لیے آسانیاں بھی پیدا ہوئی ہیں اور انہیں دشواریوں سے بھی نجات ملی ہے۔ تحقیق کے سلسلے میں سب سے مقدم امر یہ ہے کہ جو مواد پیش کیا گیا ہے وہ کتنا معتبر اور مستند ہے۔ کسی متن کے اعتبار کو جانچنے کا سب سے بہتر آلہ اس متن کے ماخذات اور مراجع ہیں، کہ مصنف نے وہ متن کہاں سے پیش کیا۔ اگر مشکوک ماخذ سے کام لیا گیا ہے تو تحقیق بھی مشکوک قرار پائے گی۔ اس سلسلے میں رشید حسن خاں فرماتے ہیں:

> ''جن امور پر استدلال کی بنیاد رکھی جائے، وہ اس وقت تک کی معلومات کے مطابق، بظاہر حالات شک سے بری ہوں اور جن ماخذ سے کام لیا جائے وہ قابلِ اعتماد ہوں۔ غیر متعین شکوک اور قیاس پر مبنی خیالات کا مصرف جو بھی ہو ان کی بنیاد پر تحقیقی نقطۂ نظر سے قابلِ قبول نتائج نہیں نکالے جا سکتے۔'' (ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، رشید حسن خاں، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1978، ص:16)

رشید حسن خاں نے اس بات کی صراحت کر دی ہے کہ تحقیق کی بنیاد جن امور پر رکھی جائے وہ امور شکوک کے دائرہ سے باہر ہوں اور قابلِ اعتماد ہوں۔ ان کے نزدیک قیاس پر مبنی خیالات پر تحقیق کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی اور نہ ہی کوئی نتیجہ بر آمد کیا جا سکتا ہے۔ رشید حسن خاں نے معتبر اور غیر معتبر ماخذ کے درمیان خط امتیاز بھی کھینچ دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''حوالے کا قابلِ قبول ہونا متعدد باتوں پر منحصر ہے، مثلاً یہ کہ واقعے اور روایت کے درمیان ایسا زمانی فصل نہ ہو کہ روایت کا تسلسل ٹوٹ جائے۔ روایت اگر ذاتی معلومات پر مبنی ہے اور راوی غیر معتبر بھی نہیں اس صورت میں امکان کی حد تک یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ غلط فہمی، جانب داری یا ایسے ہی محرک کے اثرات تو کار فرما نہیں رہے ہیں۔ راوی

اگر موخر ہے تو ضروری ہے کہ روایت ایسے ماخذ پر مبنی ہو جس کو اولین ماخذ کہا جا سکے۔"
(ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، رشید حسن خاں، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1989،ص:8)

اس سلسلے میں بعض امور درج ذیل ہیں:

1- تحقیق کے لیے سب سے اولین شرط طبعی مناسبت، لگن اور دلچسپی ہے۔ اگر کسی شخص کا تحقیق سے لگاؤ نہیں تو اس میں شوق اور تجسس پیدا نہیں ہوگا اور ایسی صورت میں وہ تحقیقی جدوجہد جاری نہیں رکھ سکے گا۔ تحقیق اپنے عمل میں علوم وفنون کا وسیع مطالعہ چاہتی ہے، محقق کو اپنے زیر نظر تحقیقی موضوع سے متعلق کافی مطالعہ کا تقاضہ کرتی ہے، ساتھ ہی دوسرے علوم وفنون کا مطالعہ بھی تحقیق کے لیے ناگزیر ہے خصوصاً ادب کی تحقیق کے لیے اس عہد کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی تاریخ سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ ایک اچھی تحقیق کے لیے معلومات عامہ کے ساتھ اہم ایجادات اور دریافتوں سے بھی آگاہی ضروری ہے۔ اردو ادب میں تحقیق کرنے والوں کے لیے عربی، فارسی اور علوم متداولہ کا جاننا بھی بہت ضروری ہے کیونکہ اردو زبان کا ماخذ عربی اور فارسی ہے، یہی وجہ ہے کہ اردو کی بہت سے قدیم کتابیں عربی اور فارسی میں ہیں۔ اردو ادب کی تحقیق کے میں مغربی ادبیات سے واقفیت بہت ضروری ہے۔

2- تحقیق کے لیے مطالعہ کا وسیع ہونا ضروری ہے۔ اسے زیر موضوع مضمون کے علاوہ دیگر علوم کا بھی ماہر ہونا چاہیے۔ ادبی محقق کے لیے ضروری ہے کہ وہ متعلقہ عہد کی سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور تمدنی تاریخ سے بھی بہرہ ور ہو۔

3- تحقیق کرنے والوں کو کئی زبانوں کا علم بھی ضروری ہے، کیونکہ بیشتر وہ کتابیں جسے محقق ماخذ ومصادر کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے، ہوسکتا ہے وہ کسی دیگر زبان میں ہوں۔ اردو ادب میں تحقیق کرنے والوں کو عربی اور فارسی کا جاننا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ قدیم متون عربی اور فارسی ہی میں دستیاب ہیں۔ عہد جدید کے کسی عنوان پر محقق کو انگریزی اور دیگر مغربی علوم وادب سے واقفیت ضروری ہے۔ اسی طرح ہندی کا جاننا بھی ایک محقق کے لیے ضروری ہے۔

4- تحقیق کے دوران قوت حافظہ بہت حد تک ممد ومعاون ثابت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محقق کو اچھے قوت حافظہ کا مالک ہونا چاہیے۔

5- تحقیق کے لیے تحقیقی شعور کے ساتھ تنقیدی لیاقت بھی ضروری جزو ہے تاکہ تحقیقی مواد کو تنقید کی کسوٹی پر بھی پرکھا جا سکے۔ تنقید سے عدم واقفیت کے سبب بسا اوقات ایسی چیزیں وجود میں آجاتی ہیں، جن کا تحقیق سے کوئی واسطہ نہیں اور نہ ہی وہ قارئین کے لیے کارآمد ہوتی ہیں۔

6- تحقیق میں سائنسی اور معروضی طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس طریقہ کار میں ثبوت اور براہین کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے، اس میں جذبات اور قیاس آرائی کو دخل نہیں ہوتا۔ سائنس کا ہر عمل تفتیش اور تجربے سے ثابت کیا جاتا ہے، اس لیے اس طریقہ کار کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اس طرح نامعلوم کو معلوم اور شک کو دور کیا جا سکتا ہے، جو تحقیق کے لیے بے حد ضروری ہے۔

7- تحقیق میں مسلمات کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ بسا اوقات ایک محقق اور ناقد جن بنیادوں پر تحقیق کی عمارت کھڑی کر رہا ہوتا ہے، وہ مستحکم نہیں ہوتی ہیں اور اصل حقائق پردۂ خفا میں چلے جاتے ہیں نیز غلط تاویلات اور تعبیرات کی راہیں کھلتی جاتی ہیں۔ ایسے امور سے اجتناب لازمی ہے۔

8- تحقیق میں بلاشبہ تخیل کی مدد سے علوم وفنون میں نئی نئی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ لیکن تخیل کی کارفرمائی اور اس کی ضرورت شدید احتیاط کی متقاضی ہوتی ہے۔ عبدالرزاق قریشی بجا طور پر کہتے ہیں:

> ''تحقیق میں قیاس آرائی کو تو دخل نہیں لیکن تخیل کی کارفرمائی ضروری ہوتی ہے۔ تخیل محققین کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ شاعر کے لیے۔ اسی کی مدد سے وہ نئی۔ نئی باتیں سوچ سکتا ہے۔ یہاں تک کہ مستقبل کو بھی دیکھ سکتا ہے لیکن یہ تخیل منظّم ہوتا چاہئے۔'' (مبادیات تحقیق از عبدالرزاق قریشی، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئ، ص 20)

9- تحقیق میں واقعات کا چھوٹا یا بڑا ہونا، اہم یا غیر اہم ہونا تحقیق میں اہمیت نہیں رکھتا بلکہ اس کے پایۂ استناد تک پہنچنا اہمیت رکھتا ہے۔ تحقیق میں ہر وہ واقعہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے جو اس زیر نظر تحقیق میں استناد کا درجہ رکھتا ہو۔ قاضی عبدالودود کا کہنا ہے:

> ''ہر بات یکساں اہمیت نہیں رکھتی، لیکن بات اہم ہو یا غیر اہم محقق کو حق تحقیق ادا کرنا چاہئے۔ بعض اوقات کوئی بات جو جزوی معلوم ہوتی ہے، غیر معمولی اہمیت اختیار کرتی ہے۔ مزید یہ کہ اگر بے احتیاطی عادت بن گئی تو ان امور میں بھی جو خود لکھنے والے کی نظر میں اہم ہیں، اس سے گریز نہیں۔'' (بحوالہ تحقیق وتدوین از سید محمد ہاشم، مکتبہ جامعہ لیمیٹیڈ، نئی دہلی، ص 37)

10- ذاتی دلچسپی اور شوق وذوق کے باعث انسان اہم ترین کارنامے انجام دے سکتا ہے۔ کسی بھی کام کو اچھے ڈھنگ سے کرنے کے لیے ذاتی دلچسپی کا ہونا ضروری ہے، تحقیق بھی اس کی متقاضی ہوتی ہے۔ اسی ساتھ تحقیقی کام ایماندارانہ محنت کا مطالبہ کرتی ہے۔ تحقیق کا فن ''بے پایاں خلوص'' کا متقاضی ہوتا ہے۔ جب تحقیقی عمل میں ایماندارانہ اور مخلصانہ جذبے کی کمی واقع ہو جاتی ہے تو جعلی نسخے کی شناخت، الحاقی متن، تحریف کلام، مستند اور غیر مستند نیز مختلف فیہ علمائے تحقیق کے راویوں کے مابین، اصل متن کے یقین کا مسئلہ گنجلک ہو جاتا ہے۔ تحقیق میں ذاتی دلچسپی کے ساتھ ساتھ محنت ومشقت بھی درکار ہوتی ہے، تبھی صحیح نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ مواد کی گرد آوری میں نہ صرف کتابوں، مخطوطوں وغیرہ کے اوراق الٹنا ہوتے ہیں بلکہ ہر قسم کی راحت کو قربان کرنا ہوتا ہے۔

11- تحقیق میں آخذ بنیادی اہمیت رکھتے ہیں جو غیر متعین مشکوک اور قیاس پر مبنی نہ ہوں بلکہ اب تک کی معلومات کے مطابق ثقہ اور قابلِ اعتماد ہوں۔ ظاہر ہے تحقیق کا عمل درست نتائج تک پہنچنے کے لئے ہوتا ہے اگر تحقیق میں پیش گئی شہادتیں مدلل نہ

ہوں اور معلومات کا ذخیرہ صداقت پر مبنی نہ ہوتو تحقیقی امر کی صحیح دریافت ممکن نہیں۔

12۔ تحقیق کسی شخص کے بارے میں دیے گئے اس کے بیانات پر یقین نہیں کیا جاتا اور نہ ہی اسے بنا کسی ردوقدح کے قبول کیا جاتا ہے۔ تحقیق میں ایسی بے احتیاطی معیوب سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے جب ہم ایسے بیانات کو موضوع تحقیق بنائیں تو محقق کے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ تفتیش کے بعد ہی بیانات کو قابل قبول سمجھے۔ حنیف نقوی اس امر کی جانب نشاندہی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''مرزا حاتم علی بیگ مہر کا یہ دعویٰ ہی کہ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ ایک مختصر مثنوی کے ایک مصرعے میں انھوں نے واضح طور پر یہ اعلان کیا ہے کہ ''مولد مرا شہر لکھنو ہے''۔ لیکن یہ بات سراسر خلاف واقعہ ہے۔ ان کے اپنے پوتے قاسم حسین مرزا کے بیان کے مطابق ان کی ولادت علی گڑھ میں ہوئی تھی، جہاں ان کے والد بحیثیت تحصیلدار مامور تھے، جب کہ ان کے سب سے چھوٹے بھائی مرزا رعائت علی بیگ کی ایک تحریر اور بعض دوسرے شواہد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا اصل وطن فرخ آباد تھا۔'' (مبادیات تحقیق از عبدالرزاق قریشی، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی، ص 16)

13- تحقیق میں اول ماخذ ہی استناد کا درجہ رکھتا ہے۔ ثانوی مآخذ کے ذریعے تحقیق میں بے حد غلط بیانیاں داخل ہوجاتی ہیں۔ بعض اوقات محقق ثانوی ذرائع سے کام لے کر اسے اصل مآخذ کا حوالہ دے دیتا ہے، جس سے حقائق دب جاتے ہیں۔ حنیف نقوی لکھتے ہیں:

> ''بعض مستثنیٰ صورتوں میں مثلاً جبکہ اصل مراجع تک رسائی کی کوئی صورت نہ ہو یا اخذ کردہ مواد کو کسی قطعی فیصلے کی بنیاد بنانا مقصود نہ ہو، ثانوی ذرائع سے مدد لی جاسکتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ لازم ہوگا کہ ایسی مآخذ کا حوالہ بالواسطہ یعنی ثانوی مآخذ کی وساطت سے دیا جائے۔ اصل مآخذ کو نظر انداز کردینے یا ثانوی ذرائع سے کام لے کر اصل مآخذ کا حوالہ دینے سے جو پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں، وہ بعض اوقات گمراہیوں کے ایک لامتناہی سلسلے کا نقطہ آغاز بن جاتی ہیں۔'' (تحقیق و تدوین مسائل و مباحث از حنیف نقوی، اسکرین پلے، تل بھانڈیشور، وارانسی، 2010، ص 17)

14- تحقیق میں تعصب اور جانبداری کا عمل دخل نہیں ہوتا۔ اس لیے اپنی پسند کی چیزوں اور محبوب اشخاص سے متعلق غیر جانبدار ہوکر تحقیق کا عمل انجام دینا چاہیے۔

4.4 تحقیق کے طریقۂ کار

تحقیق کے لیے بعض طریقے درکار ہوتے ہیں، جن پر عمل پیرا ہو کر تحقیق کو اچھے ڈھنگ سے کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے درج ذیل امور ضروری ہیں:

1۔ موضوع کا انتخاب اور اس کی حد بندی۔

2۔ ماخذوں کا تعین اور ان کی فہرست مرتب کرنا۔

3۔ مقالے کا خاکہ تیار کرنا۔

4۔ مآخذ کا مطالعہ اور ان سے مفید مطلب مواد کا انتخاب۔

1-موضوع کا تعین:

موضوع کے انتخاب اور اس کے صحیح تعین کو ''نصف کامیابی'' کہا جاتا ہے۔ موضوع منتخب کرتے وقت محقق کو رہنمائی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ موضوع کا انتخاب ایسے شخص کی صلاح سے کیا جائے جو تحقیق کی اہمیت، اس کی معنویت اور معیاری تحقیق کی ممکنہ خصوصیات سے واقفیت رکھتا ہو تاکہ موضوع محقق کی دلچسپی کے مطابق ہو سکے۔ ایک اچھی تحقیق کے لیے ضروری ہے کہ ایسے موضوع کا انتخاب کیا جائے جس کی طرف طبعی میلان۔ تحقیق کا عمل شروع کرنے سے قبل محقق کو اس بات کا علم ہونا ضروری ہے کہ وہ کس موضوع پر تحقیق کرنا چاہتا ہے۔ اس کی تحقیق کا موضوع کیا ہے، اس کے حدود کیا ہیں اور اس کے مقاصد کیا ہیں؟ چنانچہ ان باتوں کو طے کرتے وقت درج ذیل امور کا خیال رکھنا محقق کی ذمہ داری ہے:

الف: اسے اپنا محاسبہ کرنا چاہیے کہ موضوع سے اس کی دلچسپی، تعلق اور لگاؤ کتنا اور کس حد تک ہے۔ چنانچہ موضوع سے واقفیت اور اس پر عبور حاصل ہونا بہت ضروری ہے۔

ب: کیا وہ موضوع کا حق ادا کر پائے گا یا نہیں؟ اس کے اندر اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی صلاحیت اور قوت ہے یا نہیں؟

ج: معاشرے کی ضروریات کی تکمیل میں اس کی تحقیق کا کردار کتنا مثبت ہوگا؟ کیا اس طرح کی تحقیقات اور اس کے منتخبہ موضوعات سے معاشرہ استفادہ کر سکتا ہے؟

د: کیا اس موضوع پر تحقیق کی ضرورت ہے؟ ایسے موضوعات کا انتخاب نہیں کرنا چاہیے جن پر اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ اضافے کی گنجائش بہت کم ہو۔

ہ: اگر محقق تحقیق کے میدان میں مبتدی ہے تو موضوع کا دائرہ مختصر اور محدود ہو۔

2-مواد کی فراہمی

موضوع کے تعین کے بعد زیر نظر موضوع سلسلہ میں یہ پتا لگایا جائے کہ موضوع کے متعلقات، لوازمات اور دیگر مواد آسانی سے دستیاب ہو جائے گا یا نہیں؟ ایسا تو نہیں کہ مواد کی عدم دستیابی کے سبب تحقیقی کام نامکمل رہ جائے۔ محقق کو ممکنہ ذرائع سے کام لے کر زیادہ سے زیادہ مواد یکجا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر کسی محقق نے اپنا موضوع کسی شخصیت کو منتخب کیا ہے تو اسے فن کار کے لکھے ہوئے ہاتھ کے نسخے، اس کی یادداشتیں اور روزنامچے، خطوط، خودنوشت سوانح حیات، اس کے اہل خانہ، احباب اور شاگردوں کی

تحریریں، قانونی دستاویزات، معاصرین کی تحریریں اور خطوط، اس عہد کی ادبی تاریخیں جیسے اردو میں تذکرے وغیرہ یکجا کر لینے چاہیں۔

مواد کی فراہمی کے بعد حقائق کی تلاش یا مروجہ حقائق کی تردید کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے۔ اس مواد کی تفہیم و تعبیر اور تشریح کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ضروری ہے کہ دستیاب مواد کی صحت یا عدم صحت کی جانچ کی جائے۔ اس عمل میں بہت محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ جن ماخذات کے حوالے دیے جائیں وہ مسلم الثبوت ہوں۔ اگر حوالے مستند نہیں ہوں گے تو تحقیق کے نتائج بھی قابل اعتماد نہ ہوں گے۔

3-موضوع کی تقسیم:

موضوع کے انتخاب کے عمل سے گزرنے کے بعد ضروری ہے کہ متعلقہ مواد کا بغائر مطالعہ کیا جائے تا کہ اس کے ضمنی اور ذیلی فصول، ابواب اور مرکزی عنوانات قائم کر کے ایک خاکہ تیار کیا جا سکے۔ اس طرح زیرِ نظر موضوع کی تحقیق کے مراحل آسان ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ابواب بندی سے تحقیق کے موضوع میں اتنی کشادگی ہو جاتی ہے کہ عمیق مطالعہ اور ٹھوس معلومات کے بعد برآمد ہونے والے اضافہ جات اور ترامیم اس کے اندر آسانی سے درج کیے جا سکتے ہیں۔ محقق کو چاہیے کہ وہ زیرِ نظر موضوع کو اس کی خارجی اور داخلی ہیئتوں نیز اس کی مختلف نوعیّتوں کے اعتبار سے اسے ذیلی عناوین اور مختصر اجزا اور چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دے۔ اس طرح تحقیق کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ بلکہ زیرِ تحقیق موضوع کے جتنی ذیلی عناوین ممکن ہوں' بنا دیے جائیں، اس سے تحقیق کے دوران زیادہ آسانی میسر ہوگی اور اس موضوع کی تمام جہات کی تفہیم و تعبیر میں سہولت پیدا ہو جائے گی۔

4۔منصوبہ بندی:

تحقیقی کام شروع کرنے سے پہلے اس کی مکمل منصوبہ بندی بہت ضروری ہے یعنی تحقیق کی کیفیت کیا ہوگی، اس کے کام کا دائرہ کار اور طریق کار کیا ہوگا، تحقیق کہاں سے شروع ہو کر کہاں اختتام پذیر ہوگی اور کن کن مقاصد اور نتائج کا استخراج ہو سکے گا۔ تحقیق مطلوبہ نتائج کے مدنظر اس کی ابتدا میں منصوبہ بندی بہت ضروری ہے کہ کس طرح اور کن مراحل سے گزر کر مطلوبہ نتیجہ تک پہنچا جائے۔ اس کے لیے درج ذیل طریقہ کار اختیار کیے جاتے ہیں:

1۔ موضوع سے متعلق ہر طرح کے مواد کا بغور مطالعہ کیا جائے۔

2۔ مواد جمع کرنے کی ابتدا بنیادی آماخذ سے کرنی چاہیے لیکن ثانوی ماخذ اور وہ کتابیں جو اہم معلومات سے پُر ہیں ان کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

3۔ مواد جمع کرتے وقت ہر کتاب کی کتابیات پر بھی نظر رکھنی چاہیے تا کہ اس سے دیگر آماخذات کی نشاندہی ہو سکے اور دوسرے وہ مراجع بھی سامنے آ جائیں جن سے تحقیق میں مدد مل سکتی ہے۔

4۔ تحقیق سے متعلق مضامین کو پورے غور و خوض سے اس طرح پڑھنا چاہیے تا کہ غیر متعلقہ اجزاء بھی گرفت میں آ جائیں۔ اس کے لیے محقق کو حواشی اور بین السطور میں درج عبارتوں کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے۔

5۔ متعلقہ مواد کے مطالعہ کے وقت محقق کو ضروری نکات کی فہرست بناتے رہنا چاہیے۔ یہ فہرست اس وقت کافی کام آئے گی جب وہ برآمد نتائج کو ترتیب دے رہا ہوگا۔

6۔ تحقیق میں سیاسی، تہذیبی، سماجی اور ارد گرد کے حالات بھی کارآمد ہو سکتے ہیں، اس لیے دورانِ تحقیق ہر طرف نظریں مرکوز رکھنی چاہئیں اور یومیہ واقعات سے اگر کوئی چیز کارآمد ہو تو اسے نوٹ کر لینا چاہیے۔ اس کے لیے محقق کو اپنے ساتھ ڈائری رکھنا ہوتا ہے تاکہ جہاں ضرورت پڑے، اس ڈائری میں نوٹ کر لے۔

7۔ مطالعہ کے دوران بنائے گئے نوٹس کو اکثر و بیشتر پڑھ لینا چاہیے تاکہ گذشتہ کیے گئے کام کا موازنہ ہو سکے اور تکرار سے بچا جا سکے۔

5-گذشتہ کاموں سے آگاہی:

زیرِ نظر تحقیقی موضوع سے متعلق ماضی میں انجام پا چکے امور سے محقق کا آگاہ ہونا بے حد ضروری ہے کیونکہ اگر ماضی میں ایسی کوئی تحقیق ہو چکی ہے تو موجودہ تحقیق بے معنی ثابت ہو جائے گی۔ البتہ اگر محقق بعض نئے نتائج اخذ کرنا چاہتا ہے تو ماضی میں ہونے والی تحقیق سے محقق کو مدد ملے گی، نیز تکرار سے بھی بچ جائے گا اور اب جو نتیجہ سامنے آئے گا وہ زیادہ پختہ، مستند اور مستحکم ثابت ہوگا۔ محقق کو اسلاف کے تجربات اور اس کے مقررہ کردہ اصولوں سے مدد پہنچے گی۔ البتہ وہ تحقیقی امور جس پر اب تک کوئی تحقیق نہ ہوئی ہو اور نہ اس کی کوئی مثال یا نمونہ موجود ہو، اس کے لیے اس جیسے پچھلے کاموں سے سہارا لینا کوئی ضروری نہیں ہے۔

6-مآخذ سے واقفیت:

سبھی شعبہ ہائے علوم فنون میں ہر موضوع سے متعلق تقریباً اہم منابع و مصادر اور جامع و مانع مآخذات موجود ہیں، جن سے معتبر، مستند اور صحیح معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ ایک محقق کی ذمہ داری ہے کہ متعلقہ تحقیقی موضوع کے سلسلے میں ان منابع و مآخذ سے آشنا ہو اور رسائی حاصل کرے۔ یہ منابع و مصادر قدیم بھی ہو سکتے ہیں اور جدید بھی۔ ایسی کتابوں میں مخطوطات، دستاویزات، انسائیکلو پیڈیا، سالانہ رپورٹیں، فہرستیں اور لغات وغیرہ خاص اسی مقصد سے تحریر کی جاتی ہیں جبکہ بعض کتابیں اصل منابع تک رسائی کا فریضہ انجام دیتی ہیں، جیسے رسائل و جرائد اور اشاریہ وغیرہ۔ مآخذ کے سلسلے میں محقق کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کی ترجیحی بنیاد پر ایک فہرست اس طرح تیار کر لے کہ ان میں جو ماخذ زیادہ اہمیت کے حامل ہیں، انہیں سرفہرست رکھے اور کم اہمیت والے ماخذ کو دوسرے نمبر پر۔

7-مربوط موضوعات کا علم:

زیرِ تحقیق موضوع سے متعلق دیگر زبانوں میں جو علمی و فکری سرمایہ ہے، اس کے متعلق یہ پتا لگایا جائے کہ کس فن کی کتابیں اس کی تحقیق کے عنوان سے ربط و ضبط رکھتی ہیں۔ علوم و فنون کے بہت سے ایسے شعبے ہیں جن میں زیرِ نظر تحقیق سے متعلق مواد موجود ہے، وہاں تک رسائی بھی محقق کی رہنمائی کرے گا۔

8-غور و فکر:

اشیاء کے سلسلے میں غور وفکر اور تفتیش کرنا تحقیق کا ایک اہم سرچشمہ ہے۔ انسان کے اپنے افکار وخیالات، حافظے اور غور وفکر سے حاصل ہونے والے نتائج تحقیق میں کافی مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ تحقیق میں صرف مطالعہ پر انحصار نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کے لیے غور وفکر کا مادہ بھی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ انسان کے افکار وخیالات بھی ایسے کارآمد ہوتے ہیں جو مختلف اور متعدد مسائل کا سرچشمہ بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور جتنا ان سے استفادہ کیا جائے گا اور ان کا استعمال کر کے انھیں مسلسل مصروف عمل رکھا جائے گا، اتنا ہی ان سے فائدہ ہوگا اور نتائج ومعلومات کا دائرہ بڑھتا جائے گا۔

9- **یادداشت:**

محقق کی قوت یادداشت اور قوی حافظہ کا عمل دخل اچھی اور مستند تحقیق میں کافی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ زیر تحقیق عنوان سے متعلق اسناد ومنابع، مصادر وماخذ کی کتب اور دوران تحقیق معاشرہ میں وقوع پذیر ہونے والے حالات وحادثات اور محسوس اشیاء کی نقل، یا کوئی اطلاع یا خبر تیار کرنے یا واقعات ومشاہدات تحریر کرتے وقت جو مطالب دستیاب ہوتے جائیں انہیں یاد رکھنا محقق کے لیے بہت ضروری ہیں۔ اس سلسلے میں اگر یادداشت یا حافظہ پر تکیہ نہ کیا جائے اور انہیں نوٹ کر لیا جائے تو بہتر ہے۔ ورنہ اس سلسلہ میں مختصر علامات اور اشارات کا بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ درج کردہ نوٹس کو یاد رکھنا بھی ایک اہم اور ضروری عمل ہے۔ بہت ممکن ہے کہ محقق کے پاس سیکڑوں اور ہزاروں اوراق نوٹس بک کی شکل میں موجود ہوں جو الگ الگ اہداف ومقاصد اور جدا جدا موضوعات کے اعتبار سے تیار کیے گئے ہوں، ان معلومات، اطلاعات اور نوٹس کو تحقیق کے دوران یاد رکھنا بہت ضروری ہے۔

10- **نظم وترتیب:**

یہ تحقیق کا آخری مرحلہ ہے، اس میں جمع شدہ حقائق اور مکمل مطالب کو حتمی صورت دینے کے لیے ایک خاص ترتیب وتنظیم کا لحاظ رکھا جانا چاہیے۔ یہ اس وقت کیا جاتا ہے جب اس امر کا یقین ہو جائے کہ بقدر ضرورت معلومات کا ذخیرہ جمع ہو چکا ہے اور ممکنہ حوالہ جات سے حقائق یکجا کیے جا چکے ہیں نیز ان کا مطالعہ کر کے نتائج اخذ کیے جا چکے ہیں۔ اس کے بعد مسودہ لکھنا شروع کر دینا چاہیے۔ مسودہ لکھتے وقت درج ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

1۔ اطلاعات ومعلومات کو مختلف گروہوں اور حصوں میں تقسیم کر لیں۔

2۔ ہر حقائق اور نکتے کو مناسب جگہ پر درج کریں۔

3۔ غیر ضروری یا غیر مربوط معلومات اور اطلاعات بہم کرنے کے لیے الگ سے کوئی فضیلت کا باب قائم نہ کیا جائے۔

4۔ اگر مطالب کی گروہ بندی نہ کی جائے اور انھیں مختلف حصوں میں تقسیم نہ کیا جائے اور آپس میں سب خلط ملط ہو جائیں تو محققین اور قارئین کے لیے الجھن کا سبب بن جاتا ہے۔ اور مطالب کو بے جا استعمال کرنے سے بھی اس کی اہمیت وافادیت اور قدر وقیمت میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔

5۔ غیر ضروری اور غیر مربوط مطالب کے بیان اور نقل میں زبردستی کے اضافہ سے صرف کتاب یا تحریر کا حجم زیادہ ہو جاتا ہے جس سے کشش میں کمی واقع ہوتی ہے اور کوئی مفید نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔

6۔ جمع شدہ مواد کو مقدمہ، متن، اصل موضوع اور نتیجہ کے تحت درج کیا جائے۔

آخر میں اپنے موضوع کی تلخیص یا اختصار پیش کرنا چاہیے اس سے محقق کی مراد سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔

11-تحقیق کی زبان

''تحریر و نگارش'' کا مسئلہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔ چنانچہ تحقیق کی زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہونی چاہیے۔ مبالغہ، ایہام، استعارات و کنایات تحقیق کی زبان کو عام فہم بنانے میں قاصر رہتے ہیں۔ اسی طرح ایک اچھے محقق کو خطابیہ انداز تحریر سے بچنا چاہیے۔ اسما کے ساتھ صفات کا استعمال اسی وقت کرنا چاہیے جب کوئی 'صفت' لکھنے والے کی اصل رائے کو نمایاں کرتی ہو۔ اسی طرح تناقضات اور کمزور دلائل و براہین سے اجتناب برتنا چاہیے۔ محقق کا دھیان اس بات پر مرکوز ہونا چاہیے کہ کم سے کم الفاظ میں قاری پر اس کے پیغام کی رسائی ہو جائے۔

تحقیقی امور میں پیش کی جانے والے مواد میں ایسی زبان سے اجتناب کرنا چاہیے جن سے محقق کی ذات کے اظہار کا پتہ چلے جیسے ''میرا خیال یہ ہے'' یا ''میں اس نتیجے پر پہنچا'' اس قسم کے جملوں سے اجتناب برتنا چاہیے۔ تحقیق میں فخر و غرور کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں یا ایسی عبارت نہیں لکھنا چاہیے جس سے محقق کے عمل، ذات، محنت اور تحقیق کی راہ میں جدو جہد کے بارے میں فخریہ بیان یا مبالغہ آرائی ذکر ہو، جیسے ''مجھ پر یہ بات منکشف ہوئی'' یا ''میں پہلے جو کچھ ذکر کر چکا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔'' وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح تحقیق میں اگر کسی شخصیات کا حوالہ دیا گیا ہے تو ان کے علمی القاب و آداب اور عہدے و خطابات کا ذکر نہ کیا جائے۔ تحقیقی عبارت میں بے جا طوالت سے بچنا چاہیے، اس سے قاری صحیح مطالب تک پہنچنے کے بجائے بوریت کا شکار ہونے لگتا ہے۔ کم سے کم الفاظ اور زیادہ سے زیادہ مطالب والی عبارت کا استعمال کرنا چاہیے۔ اگر کوئی مفہوم پانچ الفاظ میں بیان ہو سکے تو اسے چھ یا اس سے زائد میں بیان کرنے سے پرہیز کیا جائے۔ اگر کسی نکتہ کو ایک سطر میں بیان کیا جا سکتا ہے تو اس کے لیے کئی سطروں میں لکھ کر وقت کی تضیع نہیں کرنا چاہیے۔ اسی طرح فعل، فاعل، مبتدا، خبر، شرط اور جزاء میں طویل فاصلے سے بچنا چاہیے۔ پروفیسر محمد حسن تحقیقی زبان اور اسلوب کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

> ''محقق کی زبان افسانوی ادب کی زبان سے یقیناً مختلف ہوگی، اس میں تخیل سے زیادہ واقعیت، ابہام سے زیادہ قطعیت اور کیفیت سے زیادہ حقیقت کے بے کم و کاست بیان پر زور دیا جائے گا۔ رنگینی اس کا حسن نہیں عیب ہو سکتی ہے۔ اس کا مقصد کیفیت نہیں معلومات کی ترسیل اور استنباط نتائج ہوتا ہے، اس لیے اس کا حسن، اس کی قطعیت، ربط، استقلال اور ترتیب کے مقدمات اور نتائج کی معقولیت اور توازن میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس کا رخ آرٹ سے زیادہ سائنس اور فلسفے کی طرف ہوتا ہے، جہاں الفاظ حتی الامکان پوری احتیاط اور تعین معنی کے ساتھ استعمال کیے جانے چاہئیں۔'' (ڈاکٹر سلطانہ بخش (مرتبہ)، اردو میں اصول تحقیق، 2012، ص245)

12-اقتباسات اور حواشی

تحقیقی کام میں دلائل کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ چنانچہ تحقیق کو ثابت کرنے کے لیے دلائل و براہین سے کام لیا جاتا ہے اور اس کے لیے دوسروں کے اقوال، آراء اور خیالات و نظریات کو اقتباسات کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اپنی بات کے ثبوت میں انہی اقتباسات کو نقل کرنا چاہیے جو محقق کے مفروضوں اور دعوؤں کو بالواسطہ طور پر ثابت کرتے ہوں۔ پھر جن کتابوں، مخطوطوں اور دستاویزات سے وہ اقتباسات نقل کیے گئے ہیں، انہیں حواشی میں درج کرنا بھی ضروری ہے تاکہ قارئین اصل حقائق تک پہنچ سکیں۔

13-کتابیات

تحقیقی امور میں جن کتابوں، رسائل و جرائد سے استفادہ کیا گیا ہے یا جن مفکرین کی آراء اور خیالات کو دلیل کے طور پیش کیا گیا ہے، ان سب کے نام اور سن اشاعت درج کرنا لازمی ہے۔ اس طرح تحقیقی کام کو استناد کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ کتابیات کی تیاری بھی حواشی اور حوالہ جات کی طرز پر ہوتی ہے البتہ کتابیات میں مخطوطات کی فہرست مطبوعات سے علاحدہ ہونی چاہیے۔ اس کے بعد رسائل و جرائد۔ اگر محقق نے دلائل کے طور پر ذاتی خطوط سے مدد لی ہے تو کتابیات میں وہ بھی درج کر دینے چاہئیں، اسی طرح سوالنامے اور انٹرویوز وغیرہ کا بھی اندراج ضروری ہے۔ کتابیات کی طرح اشاریہ سازی کا عمل بھی تحقیق کو اہم بنا دیتا ہے۔ اشاریہ سازی سے قاری پوری کتاب کی ورق گردانی سے محفوظ ہو جاتا ہے اور جو اشخاص، مقامات، کتب اور ادارے کی اس کو ضرورت ہوتی ہے، وہ فوری طور پر پہنچ جاتا ہے۔

14-عنوان سازی

تحقیقی مواد کا عنوان منتخب کرتے وقت درج ذیل امور ذہن نشین رہنے چاہئیں:

(الف) تحقیق کا عنوان ایسے کلمات پر مشتمل ہو جس سے موضوع کی باریکیاں جھلکتی ہوں۔ عنوان دلکش، انوکھا اور جاذبِ نظر ہو تاکہ قاری کو دورانِ قرات دلچسپی کا احساس ہو۔ عنوان میں بے جا تکلف اور مبالغہ آرائی سے کام نہیں لینا چاہیے خصوصاً علمی تحقیق میں اس سے اجتناب بہت ضروری ہے۔

(ب) تحقیقی مواد کا کوئی مختصر مگر جامع عنوان منتخب کیا جائے۔

(ج) ذیلی اور فروعی عناوین کا نام بھی مختصر اور کم الفاظ میں تجویز کیا جائے۔

(د) فصلیں اور ابواب قائم کرنے اور عناوین وغیرہ میں افراط و تفریط سے اجتناب برتا جائے۔ فصول اور ابواب کی تعیین تحریر کے حجم کی مناسبت سے ہونی چاہیے۔

(ھ) اقوال و اقتباسات اور عبارات اگر براہ راست نقل کیے جا رہے ہیں تو اس میں تغیر و تبدل نہ کیا جائے البتہ من و عن نقل کرتے ہوئے اس کا حوالہ حاشیہ میں درج کر دیا جائے۔

4.5 آپ نے کیا سیکھا

- تحقیق کی پہلی شرط موضوع کا انتخاب اور اس کی حد بندی ہے۔

- محقق کوممکنہ ذرائع سے کام لے کر زیادہ سے زیادہ مواد یکجا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔
- محقق کو چاہیے کہ وہ زیرِنظر موضوع کو اس کی خارجی اور داخلی ہیئتوں نیز اس کی مختلف نوعیّتوں کے اعتبار سے اسے ذیلی عناوین اور مختصر اجزا اور چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دے۔
- تحقیقی کام شروع کرنے سے پہلے اس کی مکمل منصوبہ بندی بہت ضروری ہے۔
- موضوع سے متعلق ماضی میں انجام پا چکے امور سے محقق کا آگاہ ہونا بے حد ضروری ہے کیونکہ اگر ماضی میں ایسی کوئی تحقیق ہو چکی ہے تو موجودہ تحقیق بے معنی ثابت ہو جائے گی۔
- محقق کی ذمہ داری ہے کہ متعلقہ تحقیقی موضوع کے سلسلے میں ان منابع و مآخذ سے آشنا ہو اور رسائی حاصل کرے۔
- اشیاء کے سلسلے میں غور و فکر اور تفتیش کرنا تحقیق کا ایک اہم سرچشمہ ہے۔
- محقق کی قوت یادداشت اور قوی حافظہ کا عمل دخل اچھی اور مستند تحقیق میں کافی اہم کردار ادا کرتا ہے۔
- جمع شدہ حقائق اور مکمل مطالب کو حتمی صورت دینے کے لیے ایک خاص ترتیب و تنظیم کا لحاظ رکھا جانا چاہیے۔
- تحقیقی امور میں پیش کی جانے والے مواد میں ایسی زبان سے اجتناب کرنا چاہیے جن سے محقق کی ذات کے اظہار کا پتہ چلے جیسے ''میرا خیال یہ ہے'' یا ''میں اس نتیجے پر پہنچا'' اس قسم کے جملوں سے اجتناب برتنا چاہیے۔

4.6 اپنا امتحان خود لیجیے

سوال 1: تحقیق میں اصول وضوابط کی اہمیت پر روشنی ڈالئے؟

سوال 2: تحقیق کے بعض طریقۂ کار کی وضاحت کیجیے؟

سوال 3: محقق کے بعض اوصاف بیان کیجیے؟

سوال 4: تحقیق کی زبان کیسی ہونی چاہیے؟

سوال 5: تحقیقی کتاب کا عنوان کیسا ہونا چاہیے؟

4.7 سوالات کے جوابات

جواب 1: تحقیق اپنی اہمیت وافادیت کے پیش نظر بہت سے کاموں میں اولیت حاصل کر چکی ہیں، چنانچہ تحقیق کے لیے بھی بعض اصول وطرائق وضع کیے گئے ہیں تاکہ تحقیق کے اچھے نتائج برآمد ہو سکیں۔ چونکہ تحقیق کا مقصد کسی شے کی اصل حقیقت کا سراغ لگانا ہوتا ہے، اس لیے تحقیق کے میدان میں انتہائی احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔ تحقیق میں لگن، محنت اور دلچسپی بھی ناگزیر ہوتی ہے کیونکہ ذرا سی بے احتیاطی حقیقت کے چہرے کو مسخ کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے بعض اصول وضوابط متعین کر دیے گئے ہیں تاکہ انہیں اصولوں پر کار فرما ہو کر تحقیق کی دشوار گزار راستوں سے گزرا جائے۔ اس طرح تحقیق کا کام کرنے والوں کے لیے آسانیاں بھی پیدا ہوئی ہیں اور انہیں دشواریوں سے بھی نجات ملی ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے بعض اصول وضع کیے گئے ہیں تا کہ محققین کو بھی آسانی ہو جائے اور نتائج بھی کارآمد ثابت ہوں۔

جواب2: تحقیق کے لیے سب سے پہلے ضروری ہے کہ زیرِ نظر تحقیق کے لیے طبعی مناسبت کا حامل موضوع منتخب کیا جائے۔ کیونکہ موضوع کے انتخاب اور اس کے صحیح تعین کو ''نصف کامیابی'' کہا جاتا ہے۔ موضوع منتخب کرتے وقت محقق کو رہنمائی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ موضوع کا انتخاب ایسے شخص کی صلاح سے کیا جائے جو تحقیق کی اہمیت، اس کی معنویت اور معیاری تحقیق کی ممکنہ خصوصیات سے واقفیت رکھتا ہو تا کہ موضوع محقق کی دلچسپی کے مطابق ہو سکے۔ ایک اچھی تحقیق کے لیے ضروری ہے کہ ایسے موضوع کا انتخاب کیا جائے جس کی طرف طبعی میلان ۔ تحقیق کا عمل شروع کرنے سے قبل محقق کو اس بات کا علم ہونا ضروری ہے کہ وہ کس موضوع پر تحقیق کرنا چاہتا ہے۔ اس کی تحقیق کا موضوع کیا ہے، اس کے حدود کیا ہیں اور اس کے مقاصد کیا ہیں؟ موضوع کے تعین کے بعد زیرِ نظر موضوع سلسلہ میں یہ پتا لگایا جائے کہ موضوع کے متعلقات، لوازمات اور دیگر مواد آسانی سے دستیاب ہو جائے گا یا نہیں؟ موضوع کے انتخاب کے عمل سے گزرنے کے بعد ضروری ہے کہ متعلقہ مواد کا بغائر مطالعہ کیا جائے تا کہ اس کے ضمنی اور ذیلی فصول، ابواب اور مرکزی عنوانات قائم کر کے ایک خاکہ تیار کیا جا سکے۔ اس طرح زیرِ نظر موضوع کی تحقیق کے مراحل آسان ہو جاتے ہیں۔ تحقیقی کام شروع کرنے سے پہلے اس کی مکمل منصوبہ بندی بہت ضروری ہے یعنی تحقیق کی کیفیت کیا ہوگی، اس کے کام کا دائرہ کار اور طریق کار کیا ہوگا، تحقیق کہاں سے شروع ہو کر کہاں اختتام پذیر ہوگی اور کن کن مقاصد اور نتائج کا استخراج ہو سکے گا۔ تحقیق مطلوبہ نتائج کے مدنظر اس کی ابتدا میں منصوبہ بندی بہت ضروری ہے کہ کس طرح اور کن مراحل سے گزر کر مطلوبہ نتیجہ تک پہنچا جائے۔

جواب3: محقق کے لیے سب سے اولین شرط طبعی مناسبت، لگن اور دلچسپی ہے۔ اگر کسی شخص کا تحقیق سے لگاؤ نہیں تو اس میں شوق اور تجسس پیدا نہیں ہوگا اور ایسی صورت میں وہ تحقیقی جدوجہد جاری نہیں رکھ سکے گا۔ تحقیق اپنے عمل میں علوم وفنون کا وسیع مطالعہ چاہتی ہے، محقق کو اپنے زیرِ نظر تحقیقی موضوع سے متعلق کافی مطالعہ کا تقاضہ کرتی ہے، ساتھ ہی دوسرے علوم وفنون کا مطالعہ بھی تحقیق کے لیے ناگزیر ہے خصوصاً ادب کی تحقیق کے لیے اس عہد کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی تاریخ سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ محقق کا وسیع المطالعہ ہونا ضروری ہے۔ اسے زیرِ موضوع مضمون کے علاوہ دیگر علوم کا بھی ماہر ہونا چاہیے۔ ادبی محقق کے لیے ضروری ہے کہ وہ متعلقہ عہد کی سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور تمدنی تاریخ سے بھی بہرہ ور ہو۔ محقق کے لیے کئی زبانوں کا جاننا بھی ضروری ہے، کیونکہ بیشتر وہ کتابیں جسے محقق ماخذ ومصادر کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے، ہوسکتا ہے وہ کسی دیگر زبان میں ہوں۔ اردو ادب میں تحقیق کرنے والوں کو عربی اور فارسی کا جاننا بہت ضروری ہے۔ محقق کے لیے تحقیقی شعور کے ساتھ تنقیدی لیاقت بھی ضروری جزو ہے تا کہ تحقیقی مواد کو تنقید کی کسوٹی پر بھی پرکھا جا سکے۔ تنقید سے عدم واقفیت کے سبب بسا اوقات ایسی چیزیں وجود میں آجاتی ہیں، جن کا تحقیق سے کوئی واسطہ نہیں اور نہ ہی وہ قارئین کے لیے کارآمد ہوتی ہیں۔

جواب 4: تحقیق کی زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہونی چاہیے۔ مبالغہ، ایہام، استعارات و کنایات تحقیق کی زبان کو عام فہم بنانے میں قاصر رہتے ہیں۔ اسی طرح ایک اچھے محقق کو خطابیہ اندازِ تحریر سے گریز کرنا چاہیے۔ اسما کے ساتھ صفات کا استعمال اسی وقت کرنا چاہیے جب کوئی 'صفت' لکھنے والے کی اصل رائے کو نمایاں کرتی ہو۔ اسی طرح تناقضات اور کمزور دلائل و براہین سے اجتناب برتنا چاہیے۔ محقق کا دھیان اس بات پر مرکوز ہونا چاہیے کہ کم سے کم الفاظ میں قاری پر اس کے پیغام کی رسائی ہو جائے۔

تحقیقی عبارت میں بے جا طوالت سے بچنا چاہیے، اس سے قاری صحیح مطالب تک پہنچنے کے بجائے بوریت کا شکار ہونے لگتا ہے۔ کم سے کم الفاظ اور زیادہ سے زیادہ مطالب والی عبارت کا استعمال کرنا چاہیے۔ اگر کوئی مفہوم پانچ الفاظ میں بیان ہو سکے تو اسے چھ یا اس سے زائد میں بیان کرنے سے پرہیز کیا جائے۔ اگر کسی نکتہ کو ایک سطر میں بیان کیا جا سکتا ہے تو اس کے لیے کئی سطروں میں لکھ کر وقت کی تضیع نہیں کرنا چاہیے۔ اسی طرح فعل، فاعل، مبتدا، خبر، شرط اور جزاء میں طویل فاصلے سے بچنا چاہیے۔

جواب 5: تحقیقی کتاب کا عنوان دلکش، انوکھا اور جاذبِ نظر ہو تا کہ قاری کو دورانِ قرات دلچسپی کا احساس ہو۔ تحقیق کا عنوان ایسے کلمات پر مشتمل ہو جس سے موضوع کی باریکیاں جھلکتی ہوں۔ عنوان میں بے جا تکلف اور مبالغہ آرائی سے کام نہیں لینا چاہیے نہ ہی زیادہ الفاظ پر مشتمل عنوان قائم کرنا چاہیے۔ ایک اچھے عنوان کے لیے ضروری ہے کہ وہ مختصر اور جامع ہو اور کتاب سے حتی المقدور مناسبت رکھتا ہو۔ تراکیب آمیز الفاظ کا استعمال عنوان کو پیچیدہ بنا سکتا ہے۔ ایک اچھے عنوان کے لیے ضروری ہے کہ وہ کتاب کی ضخامت اور اس میں پیش کردہ مواد سے حتی الامکان مطابقت رکھتا ہو۔

اصل عنوان کے بعد ذیلی اور فروعی عناوین کا نام بھی مختصر اور کم الفاظ میں تجویز کیا جائے۔ فصلیں اور ابواب قائم کرنے اور عناوین وغیرہ میں افراط و تفریط سے اجتناب برتا جائے۔ فصول اور ابواب کی تعیین تحریر کے حجم کی مناسبت سے ہونی چاہیے۔

4.8 فرہنگ

الفاظ	معانی
سراغ	دریافت، جستجو، پتا، نشان، کھوج، علامت
مسخ	اصلیت خراب ہو جانا، بگڑا ہوا، اچھی صورت کو بدل کر بری صورت ہو جانا
تجسس	جستجو، کھوج، تحقیق، تلاش
علوم متداولہ	وہ علوم جو رائج ہوں، مروج علوم، دست بدست پہنے ہوئے علوم
اجتناب	پرہیز، کنارہ کشی، احتراز، پہلو بچانا، بچنا یا دور رہنا
ثقہ	معتبر، جس کے قول و فعل پر اعتبار ہو، قابل اعتماد
محاسبہ	حساب کتاب، جانچ پڑتال، کسی سے حساب لینا یا کرنا

فصول	فصل کی جمع، دو چیزوں کا درمیانی فاصلہ، جدائی، علیحدگی، دوری
استخراج	نکال دینا، خارج کرنا، نکالنے کی خواہش کرنا
مسودہ	لکھا ہوا، وہ عبارت جو بطور خاکہ لکھی ہو، ابتدائی تحریر جس میں اصلاح و ترمیم کی گنجائش ہو
حجم	وہ چیز جو طول، عرض اور بلندی کو گھیرے، Depth، موٹائی، ضخامت

4.9 کتب برائے مطالعہ

1. ادبی اور لسانی تحقیق اصول اور طریقۂ کار — پروفیسر عبدالستار دلوی — مکتبہ جامعہ لمیٹڈ 1984
2. اصول تحقیق و ترتیب متن — تنویر احمد علوی — ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی — 1994
3. تحقیق و تدوین مسائل و مباحث — حنیف نقوی — اسکرین پلے، تل بھانڈیشور وارانسی — 2010
4. تحقیق و تعارف — حنیف نقوی — قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی — 2013
5. ادبی تحقیق مسائل و تجزیہ — رشید حسین خاں — اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ — 1990

اکائی:5 تذکروں میں تحقیقی عناصر

5.1 اغراض ومقاصد
5.2 تمہید
5.3 تذکرہ کی تعریف
5.4 تذکرہ نگاری کے مقاصد
5.5 تذکرہ نگاری کی خصوصیات
5.6 نکات الشعراء
5.7 آب حیات
5.8 تذکروں کے تراجم
5.9 آپ نے کیا سیکھا
5.10 اپنا امتحان خود لیجئے
5.11 سوالات کے جوابات
5.12 فرہنگ
5.13 کتب برائے مطالعہ

5.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- ’تذکرہ‘ کے بارے میں واقفیت بہم پہنچ جائے گی۔
- ’تذکرہ‘ کی لغوی اور اصطلاحی تعریف جان جائیں گے۔
- تذکرہ نگاری کے مقاصد سے بہرہ ور ہوں گے۔
- تذکرہ نگاری کی خصوصیات سے واقفیت ہو جائے گی۔
- اولین تذکروں کے بارے میں جان سکیں گے۔
- مشہور تذکروں کی خصوصیات سے واقف ہو جائیں گے۔

5.2 تمہید

اردو میں تذکرہ نگاری کی روایت فارسی کے زیر اثر آئی۔ اردو کے یہ تذکرے نہ صرف یہ کہ فارسی کے تذکروں کے تتبع میں لکھے گئے، بلکہ اولین تذکرے فارسی زبان ہی میں لکھے گئے۔ ان تذکروں میں شعرا کے مختصر تعارف کے بعد ان کے کلام پر رائے بھی پیش

کی جاتی تھی اور اکثر و بیشتر شعراء کے کلام کا نمونہ دے دیا جاتا تھا۔ اردو ادب میں تحقیق کا باقاعدہ آغاز تذکروں نگاری سے ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ اٹھارہویں صدی سے عمل میں آیا۔ تذکرے شعراء کے مختصر سوانحی حالات اور ان کے منتخب کلام پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس نوع کی تحقیق کا سلسلہ میر تقی میر کے تحریر کردہ 'نکات الشعراءٔ' (1752) سے محمد حسین آزاد کی آب حیات (1880) تک قائم رہا۔ تذکرہ نویسی کے اولین عہد میں بہت اہتمام، سنجیدگی اور تیزی کے ساتھ تذکرے تحریر کیے گئے۔ اس دوران پچاسوں تذکرے قلمبند ہوئے، جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ تذکرے اگرچہ تحقیق کا مکمل نمونہ نہیں ہیں، البتہ انھیں تحقیق کے ابتدائی نقوش سے ضرور تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اردو کے ادبی سرمایے میں تذکروں کی اہمیت مسلم ہے۔ ان کے ذریعہ اُس دَور کی معاشرت اور طرزِ حیات کا نقشہ نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔ تذکروں سے اس عہد کے معیار، اخلاق، طرز معاشرت اور تذکرہ نگاروں کے تحقیقی وتنقیدی شعور کا بخوبی اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ تذکروں کے مطالعے سے اُس عہد کے علمی و ادبی حلقوں کی کارگزاریاں، آپسی رقابتیں، کشمکش، معاصرانہ چشمک، وضع داریاں، باہمی سلوک، روابط اور پسند و ناپسند کے معیارات بھی سامنے آتے ہیں۔

تذکرہ نگاری اردو تحقیق کی وہ ابتدائی شکل ہے، جس میں شعرائے اردو کے دستیاب شدہ حالاتِ زندگی اور ان کا منتخب کلام یا اس کا کچھ حصہ شامل کیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی تذکرہ نگار شعراء کے کلام پر اپنی آراء بھی پیش کرتا ہے۔ اردو تذکروں کی اہمیت اس وجہ سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ اردو تحقیق کی خشت اول ہیں۔ یہ تذکرے اردو میں ادبی تنقید کے خشت اول کا درجہ رکھتے ہیں۔ تذکروں میں تذکرہ نویسوں کا وہ تنقیدی شعور بھی ملتا ہے جس کے سبب تذکرہ نگار شعراء کا کلام منتخب کرتا تھا، اس عمل کے ذریعہ ان کے فکری ذوق کا بھی پتہ چلتا ہے اور تحقیقی نیز تاریخی شعور بھی سامنے آتا ہے۔

میر کے تذکرہ سے محمد حسین کے ''آب حیات'' تک کے بہت سارے تذکرے وجود میں آئے، جس میں ابطال الباطل، آثار البلاد، آثار الصنادید، آرائش محفل، اُردوئے معلٰی، ارشاد العارفین، اشعار نساخ (دیوان)، اندرسبھا، اندوختہ گریبان، باغ و بہار، بوستان سعدی، بھگت مالا، حدایق البلاغہ، دربار اکبری، دریائے لطافت، ذکر میر، سخن دان فارس، عبدالغفور نساخ (قلمی نسخہ)، غریب گلزار، کاشف الحقائق جیسے نادر تذکرے اہمیت کے حامل ہیں۔

5.3 تذکرہ کی تعریف

'تذکرہ' عربی زبان کا لفظ ہے، جس کا مادہ 'ذکر' ہے، تذکرہ کے لغوی معنی، دستاویز، میمورنڈم، یادداشت، یاد کرنا، یاد آنا، یاد دلانا، یاد دہانی اور سرگذشت کے ہیں لیکن اصطلاحی معنوں میں اس سے مراد ایک ایسی کتاب کے ہیں، جس میں شعراء کے مختصر حالات اور ان کا منتخب کلام درج کیا گیا ہو۔ حالانکہ تذکرہ کے ذیل میں بعض وہ کتابیں بھی آتی ہیں جس میں تاریخی واقعات کا ذکر ہو مثلاً تذکرۂ سلاطین دکن، تذکرہ اولیائے ادکن اور مولانا ابوالکلام آزاد کی خودنوشت تذکرہ۔ لیکن مروجہ اصطلاحی معنی میں تذکرہ کے ذیل میں وہی کتابیں شامل کی جاتی ہیں جن میں شعراء کے حالات اور ان کے کلام کا انتخاب شامل ہو۔ بعض کتابیں ایسی ہوتی ہیں جس میں محض شاعر کا نام، تخلص اور کلام یکجا کر دیا جاتا ہے تو اسے بیاض کہا جاتا ہے، جب کہ حیات اور شخصیت کے تفصیلی مطالعے اور

کلام کے متعلق مفصل بحث کا احاطہ کرنے والا مواد 'تاریخ ادب' کہلاتا ہے۔ بیاض دراصل اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں اس کا مرتب اپنی ضرورت کے مطابق معلومات کا اندراج کرتا رہتا ہے۔اس میں نہ کسی ترتیب و تنظیم کا لحاظ رکھنا ہوتا ہے اور نہ اس سے ادبی تقاضوں کی تکمیل ہوتی ہے۔تذکرے ابتداً بیاض کی شکل میں پائے جاتے تھے، بیاض میں درج کیے جانے والے اشعار، اقوال اور اقتباسات کو ایک خاص ترتیب دینے اور اس میں شعراء کے کلام کا اضافہ کردینے کے بعد تذکرے کا وجود ہوا۔تذکرہ کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر حنیف نقوی رقم طراز ہیں:

> ''مروجہ اصطلاحی معنی کی روشنی میں صرف وہی کتابیں تذکرے کی تعریف میں آتی ہیں جن میں شعراء کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے پیش کیے گئے ہوں۔دوسرے الفاظ میں یہ دو عناصر حالات اور منتخب کلام اس صنف ادب کے لیے ناگزیر ہیں۔جس کی مربوط اور متوازن آمیزش کے بغیر کسی تصنیف کو تذکروں کی فہرست میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ حالات کے تحت تذکرہ نگار شعراء کے نام اور تخلص، وطن اور جائے قیام، علمی و فنی استعداد، شاگردی کے روابط، مزاج و طبیعت کی افتاد، تصنیفی و تالیفی کارناموں کی نوعیت اور کلام کے معیار و مذاق کے متعلق ضروری معلومات فراہم کرتا ہے۔نمونۂ کلام کے ذیل میں عام طور پر متفق غزلوں کے منتخب اشعار اور کبھی کبھی دوسرے اصناف سے بھی اقتباس پیش کیے جاتے ہیں۔'' (حنیف نقوی، شعرائے اردو کے تذکرے، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1998،ص:2)

مذکورہ بالا تعریف سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ تذکرہ اپنی ایک مخصوص فنی ہیئت رکھتا ہے اور اسی کے مطابق اس کے بعض حدود بھی ہیں۔ 'تذکرہ' ایک محدود دائرہ میں رہتے ہوئے بہت سے شعراء کو ان کی حیات کے ضروری حالات و کوائف اور منتخب کلام کو پیش کرتا ہے، جس میں نہ تو اجمال کو روا رکھا جاتا ہے اور نہ بیجا تفصیل کو۔تذکرہ میں اعتدال اور توازن سے کام لیا جاتا ہے۔عام طور سے تذکروں کی ترتیب الف بائی کے اعتبار سے ہوتی ہے، جس میں شعرا کے تخلص کے حرف اول کی رعایت سے ہر حرف کے تحت شروع ہونے والے ناموں کو ترتیب سے رکھا جاتا ہے۔اس سے کسی شاعر کے حالات معلوم کرنے میں آسانی ہوجاتی ہے۔ چونکہ تذکرہ نگار کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ اسکے تذکرے میں زیادہ سے زیادہ شعراء کو جگہ مل سکے، اس لیے وہ اہم اور غیر اہم کی تفریق میں نہیں پڑتا اور جتنے شعراء کے حالات اور کلام اسے مل جاتے ہیں انہیں وہ حروف تہجی کے مطابق ترتیب دے دیتا ہے۔

5.4 تذکرہ نگاری کے مقاصد

تذکرہ نگاری کا بنیادی مقصد شاعروں کا اپنے کلام کو آئندہ نسلوں تک محفوظ رکھنا، شاعری سے لگاؤ، بیاض نگاری، مختلف شعراء کے کلام کا انتخاب، شاعروں کی معاصرانہ چشمک، مشاعروں کے رواج اور اُردو شاعری کی مقبولیت تھی۔تذکرہ نویسی کا عمل اگرچہ

علمی اور تحقیقی بنیادوں پر تھا لیکن اس فن کے تحت دو باتیں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں:

(1) بعض تذکرہ نویسوں نے علاقائی تعصب، گروہ بندی اور معاصرانہ چشمک نیز اپنے حریفوں کو زیر کرنے کے مقصد سے تذکرے تحریر کیے۔

(2) جبکہ بعض تذکروں نویسوں نے اپنے اساتذہ اور احباب یا اپنے عزیز شاعروں کی عظمت کو نمایاں کرنے اور ان کے کلام کو محفوظ رکھنے کے مقصد کے تحت تذکرے لکھے۔

مذکورہ دونوں مقاصد کے نتیجہ کے طور پر کسی ایک شاعر کے ساتھ ناانصافی کا جذبہ ضرور کارفرما ہوتا ہوگا۔ البتہ اس جذبہ کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ جب ایک کی مخالفت میں کوئی تذکرہ لکھا گیا اور پھر اس کے رد میں دوسرا تذکرہ وجود میں آیا تو پے در پے تذکرے وجود میں آتے گئے اور اس طرح اردو ادب کے ذخیرے میں اضافہ ہوتا تھا۔ میر کے نکات الشعرا سے لے کر آب حیات تک بلکہ اس کے بعد کے بہت سارے تذکروں میں کہیں تیز اور کہیں خفیف صورت میں یہ جذبہ کارفرما رہا ہے۔

تذکرہ نگاری کے مقاصد میں بقائے نام کی آرزو بھی شامل حال رہتی تھی اور ارباب کمال کی قدر شناسی بھی۔ ادبی و تحقیقی ذوق کی تسکین نیز تاریخی شعور بھی اس کے مقاصد میں اہمیت رکھتے ہیں۔ آپسی رقابت اور معاصرانہ چشمکیں، ادبی گروہ بندیاں، سرپرستوں کی خوشنودی، مشاعروں کی گرم بازاری، اور پسندیدہ کلام کو منظم ڈھنگ سے جمع کرنے کا ذوق بھی اس کے مقاصد میں شامل تھا۔

تذکرہ نگاری کے مقاصد کو ہم اس طرح بھی درج کر سکتے ہیں:

(1) تذکرہ نویسی زبان و ادب کی تاریخی کڑیوں کو یکجا کرنے کا نام ہے۔

(2) شعراء اور معاصرین کے حالات نیز ان کا کلام محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔

(3) تذکرہ نویسی کا کام تذکرہ نگار کے ادبی ذوق کی تکمیل اور تحقیقی مزاج کو تسکین فراہم کرتا ہے۔

(4) تذکرہ نگار کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ اس کے کارنامے اس کے مرنے کے بعد بھی زندہ رہیں۔

(5) تذکرہ نویسی سے ماہرین فن کی خدمات کا اعتراف اور ان کے مقام و مرتبے کی تعین قدر ہوتی ہے۔

(6) بعض تذکرے معاصرانہ چشمک اور ادبی گروہ بندی کے سبب وجود میں آئے، جیسے گردیزی کا تذکرہ۔

(7) سلاطین و امرا کی خوشنودی اور مقام و مرتبہ کے حصول کا سبب ہے۔

(8) مشاعروں کی گرم بازاری اور اس کی رونقوں کو قائم کرنے کا خیال۔

(9) پسندیدہ کلام کو آئندہ نسلوں تک محفوظ رکھنے کا جذبہ۔

5.5 تذکرہ نگاری کی خصوصیات

تذکروں کی اہمیت سے اس لیے بھی انکار ممکن نہیں کیونکہ ان میں تحقیقی اور تنقیدی دونوں عناصر پائے جاتے ہیں۔ تحقیقی نقطۂ نظر سے شعراء کے حالاتِ زندگی اور ان کا منتخب کلام جو تذکرہ نگار کے مشاہدات اور تجربات نیز تحقیق کے عمل سے گزر کر بازیافت ہوتے

تھے، زیادہ ثقہ اور معتبر ہوتے تھے۔ تنقیدی نقطۂ نظر سے تذکروں کا وہ حصہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے جس میں تذکرہ نویس شعراء اور اس کے کلام پر اظہار خیال کرتا ہے۔ تذکرہ نگار منتخبہ کلام کے معائب اور محاسن کو پرکھ کر تجزیاتی نقطۂ نظر سے بھی دیکھتا تھا۔ حالانکہ تذکروں میں پائی جانے والی تنقید عصر حاضر کی تنقید سے جدا نوعیت رکھتی ہے۔ تذکرے اردو تحقیق وتنقید کے ابتدائی نمونے ہیں، جن سے تحقیق وتنقید کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ بلا شبہ ہم تذکروں سے روگردانی کر کے تحقیق وتنقید کے میدان میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔

تذکروں میں عام طور پر ذیل امور پر نگاہ رکھی جاتی ہے:

1۔ شاعروں کے کلام پر اصلاح

2۔ شاعروں کے کلام پر رائے

3۔ دیگر شعراء سے مقابلہ

4۔ ادبی تحریکوں پر اشارے

تذکرہ نگار، شعراء کے کلام پر اظہار خیال کرتے ہوئے اکثر و بیشتر اشاروں اور کنایوں میں اس کی اصلاح بھی کر دیتا ہے۔ یہ اصلاح لفظی ہوتی تھی اور معنوی بھی۔ اس سے تذکرہ نگار کے تنقیدی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے تذکرہ نگار کو تنقید کے فنّی اصولوں اور غور وفکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض تذکرہ نگار، شعراء کے کلام پر ذاتی رائے بھی دیتے ہیں۔ اس عمل میں رواج کے مطابق لفاظی اور عبارت آرائی کا زیادہ دخل ہوتا ہے۔ ایسے تذکرہ نگار اپنے گروہ کے شعرا کی تعریف کرتے ہیں اور مخالف شعراء کی تعریف سے گریز کرتے ہیں۔

تذکروں کی ایک اہم تنقیدی خصوصیت معاصرین شعراء سے تقابلی مطالعہ بھی ہے۔ اس میں تذکرہ نگار ایک شاعر کا موازنہ دیگر شعراء سے کرتا ہے۔ اس سے تذکروں کی اہمیت میں اضافہ ہو جاتا ہے لیکن بہت سے تذکروں میں یہ صورت حال ناپید ہے۔

کسی شاعر کے ذکر کے دوران تذکرہ نگار اس عہد کی ادبی، سیاسی اور سماجی تحریکوں کا ذکر بھی بین السطور کے طور پر کر دیتا ہے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس تحریک کے سلسلے میں تذکرہ نگاری کی رائے کا عندیہ معلوم ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی اس بات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ شاعر اس تحریک سے کس حد تک متاثر ہے۔

اردو میں تحقیق کی روایت بہت قدیم ہے۔ تحقیق کی اس قدیم روایت کا دار و مدار تذکروں پر مبنی ہے۔ تحقیق کے بنیادی نقوش اردو کے تذکروں میں پائے جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ تذکرے ادبی تحقیق کے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ادبی تاریخ کی گمشدہ کڑیوں کا سراغ بھی تذکروں سے ملتا ہے۔ تذکرے دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ جس میں شعراء کے حالات درج ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جس میں ادبی کارناموں کا ذکر ہوتا ہے۔ چنانچہ موضوع اور مواد کے اعتبار سے ہر تذکرے کی نوعیت جداگانہ ہوتی ہے۔ اس کے باوجود بیشتر تذکروں میں تحقیقی عناصر کی کارفرمائی ہے۔

تحقیق کا آغاز اس وقت سے تسلیم کیا جاتا ہے جب اٹھارہویں صدی میں تذکرہ نویسی کا آغاز ہوا، یعنی تحقیق کا آغاز تذکروں

کی مرہونِ منت ہے۔ یہ تذکرے ابتداً فارسی میں ہوتے تھے، اس کے بعد اردو میں بھی لکھے جانے لگے۔ یہ تذکرہ اس وقت لکھے گئے جب تحقیق کا معیار اتنا مضبوط نہیں ہوا تھا، جیسا کہ عصر حاضر میں ہے۔ اٹھارہویں صدی میں جب تذکرہ نگاری کا آغاز ہوا تو ان کی بنیاد جدید تحقیقی اصولوں پر استوار نہیں تھی بلکہ وہ معاصرین کی سوانحی حالات تک محدود تھے پھر بھی اردو تحقیق کے ابتدائی نقوش انہی تذکروں میں پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محققین اور ناقدین کا ایک بڑا طبقہ اس بات پر متفق ہے کہ وہ تذکرے اردو تحقیق کا نقش اول ہیں۔ اس حوالے سے آفتاب احمد آفاقی لکھتے ہیں:

> ''تذکروں میں شعراء کے ادھورے اور ناقص مطالعے کے باوجود ایک اصولی موقف ضرور اختیار کیا گیا ہے جو شعروادب کی معروضی انداز میں جانچ پرکھ کی بنیاد ہے اور یہیں سے تحقیق کی ابتدا ہوتی ہے، جسے حقائق کی بازیافت اور صداقت تک کی رسائی کا نام دیا گیا ہے۔'' (آفتاب احمد آفاقی، آزادی سے قبل اردو تحقیق، تحقیق و تدوین، مرتب ابن کنول، 2006، ص:267)

اردو میں تذکرہ نگاری کی روایت فارسی سے آئی۔ فارسی میں شعراء کا پہلا تذکرہ نورالدین محمد عوفی کا لباب الالباب ملتان میں لکھا گیا۔ یہ روایت ایران سے ہندوستان آئی اور عہد مغلیہ میں فارسی زبان میں بعض اہم تذکرے لکھے گئے۔ طبقات اکبری اور منتخب التواریخ وغیرہ میں شعراء کے مستند حالات اور ان کا کلام درج ہے۔ مغلیہ دور کے آخری عہد میں آرزو اور خوشگو کے مستند تذکرے ملتے ہیں۔ عہد مغلیہ کے آخری دور میں ایسے تذکرے پائے جاتے ہیں جن میں اردو اور فارسی زبانوں کے شعراء کے حالات ملتے ہیں اور اس کے بعد ایک ایسا عہد آیا جب ایک ہی تذکرہ نگار نے فارسی اور اردو شعراء کے الگ الگ تذکرے تحریر کیے یہی وہ عہد تھا جب مختلف مصنفین نے صرف اردو شعراء کے تذکرے تحریر کیے، جن میں اردو زبان کا پہلا تذکرہ تذکرہ گلشن ہند (مرزا علی لطف) تذکرہ شعرائے اردو (میر حسن) تذکرہ گلشن بے خار (مصطفیٰ خاں شیفتہ)، انتخاب یادگار (امیر مینائی)، انتخاب دواوین (امام بخش صہبائی (آب حیات وسخن دان فارس (محمد حسین آزاد)، تذکرہ معاصرین وسخن شعراء (عبدالغفور نساخ) تذکرہ ماہ وسال (مالک رام)، مجموعۂ نغز (قدرت اللہ قاسم)، گل رعنا (مولوی عبدالحئی) کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

اس کے بعد کے تذکروں میں دولت شاہ ثمرقندی کا تذکرۃ الشعراء، جو لباب الالباب کے پونے تین سو سال کے بعد وجود میں آیا۔ اردو تذکرہ نگاروں نے اردو تذکرہ نگاری کی روایت نہ صرف فارسی کے تتبع میں شروع کی بلکہ اپنے اولین تذکرے فارسی میں لکھے۔ یہی وجہ ہے کہ نثر میں اردو کو فارسی کی جگہ لینے میں کافی وقت لگا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ابتدائی تذکرے خواہ وہ فارسی زبان میں ہوں یا اردو میں، بعض مسلمات اور اصولوں کے تحت مرتب کیے گئے ہوں گے۔ یہ بات الگ ہے کہ انہیں جدید اصولوں کے تحت مرتب نہیں کیا گیا البتہ بعض وہ اصول اپنائے گئے جو اس دور میں اہمیت کے حامل تھے۔ تذکروں کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس میں شعراء کے احوال، پیدائش ووفات کی تاریخوں کا تعین، مولد ومسکن کی نشاندہی اور سیرت وشخصیت کے نقوش اپنی تمام صداقت کے ساتھ مل جاتے ہیں اور اس طرح تحقیق کے فن کے ابتدائی نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔ بقول حنیف نقوی:

''تذکرے تاریخ ادب کا ایک جز بھی ہیں اور اس کی بنیاد بھی۔ انھوں نے بلا استثنا مورخینِ ادب کے لیے تحقیق وتلاش کی ظلمتوں میں چراغ راہ کا کام دیا ہے۔ ان کے متفق علی بیانات سے حقائق کے عرفان اور واقعات کی تعبیر میں مدد ملتی ہے اور اختلافی بحث نے اربابِ نظر کے ذوق تجسس کو بیدار کر کے تحقیقی شعور کی پرورش اور نشو ونما کے مواقع فراہم کیے ہیں۔'' (حنیف نقوی، شعرائے اردو کے تذکرے، 1972، ص:17)

مذکورہ بالا قول کے سیاق میں یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ ابتدائی تذکروں کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ انہیں تحقیق کا نقش اول گردانا جاتا ہے کیونکہ انہیں تذکروں نے مزید تحقیق کے نئے دروازے وا کیے اور اس کے نتیجہ میں تحقیق کی رفتار تیز ہوئی اور تحقیق کی طرف رجحان بڑھتا چلا گیا۔ اس طرح کی تذکروں کے زیر اثر تحقیق کا یہ سلسلہ اٹھارہویں صدی کے وسط سے انیسویں صدی کے ربع تک چلتا رہا۔

اردو میں تذکرہ نگاری کا باقاعدہ آغاز بارہویں صدی ہجری میں شروع ہوا لیکن کسی تذکرہ نگار نے اپنی کتابوں کے ناموں میں اس لفظ کا استعمال نہیں کیا۔ اردو کے اولین تذکروں میں میر تقی میر کا نکات الشعراء اور قائم چاند پوری کا مخزن نکات ہے۔ میر تقی میر اور قائم چاند پوری نے اپنے تذکروں میں تذکرہ کا لفظ استعمال نہیں کیا لیکن اردو کے مشہور شاعر میر حسن پہلے مصنف ہیں، جنھوں نے اپنی کتاب کے نام میں تذکرہ کا لفظ استعمال کیا۔ انھوں نے 'تذکرۃ الشعراء' اور 'تذکرہ شعرائے اردو' کے نام سے تذکرے لکھے۔ ان کے بعد بھی چند تذکرہ نگاروں کے علاوہ بعض تذکرہ نگاروں نے بھی اس لفظ کا استعمال نہیں کیا۔ اردو کے قدیم ترین تذکروں میں میر تقی میر کا ''نکات الشعرا''، حمید اورنگ آبادی کے ''گلشن گفتار''، افضل بیگ قاقشال کا ''تحفۃ الشعرا''، فتح علی حسینی گردیزی کا ''ریختہ گویاں'' اور قیام الدین قائم کا ''مخزن نکات'' کو اولیت حاصل ہے۔

اردو تذکرہ نگاری کا باقاعدہ سلسلہ انیسویں صدی عیسوی کے بعد سے شروع ہوا، اس سلسلہ کا پہلا تذکرہ مرزا علی لطف کا ''گلشن ہند'' (1801) ہے، جو پہلی بار نومبر 1906 میں مولوی عبدالحق کے مقدمہ کے ساتھ اردوئے معلیٰ میں شائع ہوا۔ یہ تذکرہ بھی علی ابراہیم خاں کے فارسی تذکرے گلزار ابراہیم کا اردو ترجمہ ہے، البتہ اس میں بہت کچھ تغیر وتبدل سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے بعد کے دستیاب تذکروں میں نکات الشعراء مولفہ میر تقی میر (1165ھ)، تذکرہ ریختہ گویاں مولفہ فتح علی حسینی گردیزی (1166ھ)، مخزن نکات مولفہ قیام الدین قائم (1168ھ)، گلشن گفتار مولفہ حمید اورنگ آبادی (1165ھ)، تحفۃ الشعراء مولفہ افضل بیگ قاقشال (1165ھ)، ریاض حسینی مولفہ عنایت اللہ فتوت (1168ھ) ہیں۔ یہ تذکرے تھوڑے بہت وقفہ کے ساتھ ایک ہی زمانے میں تحریر کیے گئے۔ ان میں نکات الشعراء، گلشن گفتار اور تحفۃ الشعراء ایک ہی سال میں لکھے گئے۔ تحفۃ الشعراء بنیادی طور پر فارسی شعراء کا تذکرہ ہے لیکن ضمنی طور پر بعض شعراء کے اردو اشعار بھی درج ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض محققین اس کا شمار شعرائے اردو کے تذکروں میں کرتے ہیں، جبکہ بعض محققین اس کی اصل نوعیت کے پیش نظر شعرائے فارسی کا تذکرہ قرار دیتے ہیں۔

تذکروں سے تنقیدی، تاریخی یا تحقیقی کارنامہ انجام دینا نہیں ہوتا تھا بلکہ تذکروں کی تالیف کے پیش نظر ارباب ہنر وارباب

کمال کی قدر شناسی، اپنے سر پرستوں کی خوشنودی، دوستوں کی فرمائش، تفریح طبع اور شعراء کے کلام کا انتخاب وغیرہ اسباب کارفرما ہوتے تھے۔ ادبی گروہ بندی اور اپنے ذوقِ تحقیق وتنقید کی تشفی جیسے مقاصد بھی تذکرے لکھنے کے مقاصد تھے، یہی وجہ ہے کہ تذکروں میں خوبیاں کے ساتھ بعض خامیاں بھی پائی جاتی تھیں۔

عام طور سے تذکروں میں جن شعراء کا ذکر کیا جاتا تھا، ان کی ترتیب حروف تہجی کی بنیاد پر رکھی جاتی ہے، یہ حروف تہجی شعراء کے تخلص کے حرف اول کی رعایت سے ہوتے تھے۔ اس طرح کسی شاعر کے حالات زندگی دریافت کرنے میں دشواری نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اس طرح کی ترتیب سے شعراء کی فنی حیثیت کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا تھا۔ حروف تہجی کے اعتبار سے اکثر تذکرے بھرے پڑے ہیں تاہم کہیں کہیں اس اصول سے برعکس بھی مثالیں مل جاتی ہیں مثلاً میر کا تذکرہ نکات الشعراء، گلشن گفتار۔ ان میں شعراء کی ترتیب نہ تو حروف تہجی کے اعتبار سے ہے اور نہ ہی شعراء کی ادبی حیثیت اور تاریخی تقدم کے لحاظ سے۔ اس کے بعد کے تذکرہ نگاروں مختلف ادوار کے تحت شعراء کا مطالعہ کیا مثلاً قائم چاندپوری کا مخزن نکات۔ اس دور کے تذکروں میں عام طور پر شاعر کے کلام کے علاوہ تین خاص موضوعات کے تحت تذکرے تحریر کیے گئے، جس میں شاعر کی زندگی، شاعر کی شخصیت اور کلام پر تنقید۔

شعرائے اردو کے تذکروں میں میرتقی میر کا ''نکات الشعراء'' سید فتح علی گردیزی کا ''تذکرہ ریختہ گویاں''، حمید اورنگ آبادی کا ''گلشن گفتار''، قائم چاندپوری کا ''مخزن نکات'' اور عنایت اللہ فتوت کا ''ریاض حسنیٰ'' کو اہمیت اور اولیت حاصل ہے۔ انھوں نے تذکروں کو ترتیب دے کر نہ صرف حقائق کی جستجو کی بلکہ تحقیق کی خشت اول ثابت ہوئے۔

اردو کے اولین تذکرہ نکات الشعراء سے لے کر آب حیات تک شعرائے اردو کے بہت سے تذکرے تحریر کیے گئے، جن میں بیشتر تذکروں کی زبان فارسی ہے۔ انیسویں صدی کے وسط سے لے کر آب حیات تک لکھے جانے والے تذکروں کی زبان اردو ہے۔ اٹھارہویں صدی میں لکھے جانے والے تذکروں میں چمنستان شعراء (لچھمی نرائن شفیق)، طبقات الشعراء (قدرت اللہ شوق)، تذکرہ شعرائے اردو (میرحسن دہلوی)، تذکرۂ شورش (سید غلام حسین شورش)، مسرت افزا (ابوالحسن)، گلشن سخن (مرزا کاظم علی مبتلا لکھنوی)، گلزار ابراہیم (محمد ابراہیم خاں خلیل)، تذکرہ ہندی (غلام ہمدانی مصحفی)، غبار الشعراء (خوب چند ذکا) اہمیت کے حامل ہیں۔

انیسویں صدی میں تحریر کیے جانے والے تذکروں میں تذکرۂ عشقی (وجیہ الدین عشقی)، عمدۂ منتخبہ (اعظم الدولہ سرور)، (گلشن ہند) مرزا علی لطف)، ریاض الفصحا (مصحفی)، مجموعہ نغز (قدرت اللہ قاسم)، تذکرۂ بے جگر (خیراتی لال جگر)، طبقات سخن (غلام محی الدین مبتلا)، تذکرۃ الشعراء (ابن امین اللہ)، دستور الفصاحت (احمد علی یکتا)، تذکرہ بہار بے خزاں (احمد حسن سحر)، گلدستہ نازنیناں (کریم الدین)، گلستان بے خزاں (قطب الدین باطن)، خوش معرکہ زیبا (سعادت خاں ناصر)، طبقات الشعرائے ہند، اول ودوم (کریم الدین)، گلشن ہمیشہ بہار (نصر اللہ خاں)، گلستان سخن (قادر بخش خاں)، سخن شعراء (عبدالغفار نساخ)، شمیم سخن، اول ودوم (عبدالحئی)، انتخاب یادگار (امیر مینائی) اور آب حیات (محمد حسین آزاد) وغیرہ فکری وفنی اور ہیئتی اعتبار سے بہت اہم ہیں۔

شمالی ہند کے وہ تذکرے جنھیں قدامت کے لحاظ سے اولیت حاصل ہے، درج ذیل ہیں:

1	نکات الشعراء	میر تقی میر	1165ھ
2	تذکرہ ریختہ گویاں	فتح علی حسینی گردیزی	1166ھ
3	مخزن نکات	قیام الدین قائم	1168ھ

قدامتِ زمانہ کے لحاظ سے دکن میں دستیاب تذکرے درج ذیل ہیں:

1	گلشن گفتار	حمید اورنگ آبادی	1165ھ
2	تحفۃ الشعراء	افضل بیگ قاقشال	1165ھ
3	ریاض حسینی	عنایت اللہ فتوت	1168ھ

اپنی قدامت اور معنویت کے لحاظ سے درج ذیل تذکرے بھی اہمیت کے حامل ہیں:

1	گلشن گفتار	خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی	1165ھ
2	گلشن رازیا	سید فتح علی	1166ھ
3	تذکرۂ بے بدل ہندی	خاں حسینی گردیزی	1752ء
4	مخزن نکات	قائم چاندپوری	1168ھ
5	مقالات الشعراء	قیام الدین حیرت	1174ھ
6	خزانہ عامرہ	غلام علی بلگرامی	
7	چمنستان شعراء	لچھمی نرائن شفیق	1175ھ
8	طبقات الشعراء	قدرت اللہ قدرت	1188ھ
9	تذکرہ شعرائے اردو	میر حسن	1192ھ
10	تذکرۂ عشقی	شیخ وجیہ الدین عشقی	1188ھ
11	گلزار ابراہیم	علی ابراہیم خلیل	1198ھ
12	گلشن ہند	مرزا علی لطف	1215ھ
13	گلشن ہند	حیدر بخش حیدری	1215ھ
14	عقد ثریا (فارسی شعراء)	مصحفی	1199ھ
15	تذکرۂ ہندی	مصحفی	1209ھ
16	ریاض الفصحا	مصحفی	1236ھ
17	عمدۂ منتخبہ	اعظم الدولہ سرور	1216ھ

18	عیار الشعراء	خوب چند ذکا	1218ھ
19	مجموعہ نغز	قدرت اللہ قاسم	1221ھ
20	دیوان جہاں	بنی نرائن	1221ھ
21	تذکرۂ بے جگر	خیراتی لال بے جگر	1241ھ
22	تذکرۂ آزردہ	منشی صدر الدین آزردہ	1229ھ
23	گلشن بے خار	نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ	1250ھ
24	دستور الفصاحت	حکیم احمد علی خاں یکتا	1834ء
25	خوش معرکہ زیبا	سعادت خاں ناصر	1262ھ
26	بہار بے خزاں	احمد حسن سحر	1261ھ
27	طبقات الشعرائے ہند	کریم الدین	1847ء
28	خم خانۂ جاوید	لالہ سری رام	1908ء

اردو کے اولین تذکرے ''نکات الشعراء'' کے بعد بہت سے تذکرے لکھے گئے، جن میں سے بیشتر کی زبان فارسی ہے۔ لیکن انیسویں صدی کے وسط سے آب حیات (جو اردو کا آخری تذکرہ ہے) تک کے بیشتر تذکرے اردو زبان میں ہیں۔ درج میں اردو کا اولین (نکات الشعراء) اور آخری (آب حیات) کے بارے میں اختصار سے درج کیا جاتا ہے۔

5.6 نکات الشعراء

اردو شعرا کا پہلا باقاعدہ تذکرہ میر تقی میر کا ''نکات الشعرا'' تسلیم کیا جاتا ہے لیکن تحقیقی نقطۂ نظر سے اس تذکرہ کو اولیت دینے میں ناقدین کی مختلف الرائے ہیں۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ میر کے تذکرے کو ''ریختہ گویاں'' (فتح علی حسینی) اور ''مخزنِ نکات'' (قائم) کے تذکروں پر تقدم حاصل ہے، جبکہ بعض حضرات اس سے انکار کرتے ہیں۔ ان متضاد باتوں کی تطبیق کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ میر، فتح علی حسینی اور قائم تینوں نے ایک دوسرے کی معلومات سے استفادہ کیا ہوگا لیکن معاصرانہ چشمک یا اخلاقی جرات کی کمی کے سبب ایک دوسرے کے تذکرے کا نام نہیں لیا۔ اس سلسلے میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی تحقیقات زیادہ معتبر ہیں، ان کے مطابق ''ریختہ گویاں'' کا آغاز 1165ھ، ''مخزن نکات'' کا 1175ھ اور ''نکات الشعرا'' کا 1161ھ میں ہوا نیز آغازِ تصنیف کے لحاظ سے تاریخی ترتیب قائم کرنے میں پہلا تذکرہ ''ریختہ گویاں''، دوسرا ''مخزن نکات'' اور تیسرا ''نکات الشعرا'' قرار پاتا ہے، لیکن چوں کہ کتابوں کی تصنیف کے تعین میں ان کی ابتدا نہیں بلکہ اختتام شمار ہوتا ہے اس لیے عرشی صاحب کی تحقیق کے مطابق ''نکات الشعرا'' 1165ھ، ''ریختہ گویاں'' 1166ھ اور ''مخزن نکات'' 1168ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس لحاظ سے میر کا تذکرہ ''نکات الشعرا'' گردیزی اور قائم کے تذکروں پر فوقیت لے جاتا ہے اور یہی قرینِ قیاس ہے۔

نکات الشعراء 1752ء میں منظر عام پر آیا۔ اس تذکرے میں 103 فارسی شعراء کے مختصر حالات اور کلام کا انتخاب شامل ہے حالانکہ میر نے شعراء کے حالات کو بہت اختصار کے ساتھ لکھا ہے لیکن اس انداز میں لکھا ہے کہ ان کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کر دی ہیں۔ شعراء کا تذکرہ مختصر ہونے کے باوجود بڑی حد تک مکمل معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے حالات کے بیان کے ساتھ ساتھ شعراء کے عہد اور اس ماحول پر روشنی ڈالی ہے۔ اس تذکرہ میں شعراء کی ولادت، وفات، واقعات کے سنین وغیرہ بہت اختصار کے ساتھ درج ہیں۔ اردو ادب کے ابتدائی عہد میں اگر تذکرہ نگاری کا کام انجام نہ دیا جاتا تو بہت سے شعراء پردۂ خفا میں رہتے، یہی وجہ ہے کہ تذکرہ نگاری کو اس عہد کی ایک اہم ضرورت کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ انہی اسباب کی بنا پر میر تقی میر نے نکات الشعراء تصنیف کی۔ وہ خود کہتے ہیں:

''تا ماحول شاعران ایں فن بصفحۂ روزگار بماند۔''

نکات الشعراء کی اہمیت اس لیے بھی مسلم ہے کہ اس میں شاعری کے حوالے سے میر جیسے عظیم شاعر کے نظریات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ نظریات نکات الشعراء میں کثرت سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس میں میر نے شعراء اور ان کے کلام پر جو تنقید کی ہے اس سے ان کے شعری نظریات کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے شاعری کے جو اصول اور معیارات وضع کیے تھے، انہیں اصولوں پر شعراء کے کلام کی تنقید کی ہے۔ چونکہ میر ایہام کو شاعری کے لئے روا نہیں سمجھتے تھے، جس میں تجنیس، ترصیع، صفائی، گفتگو، ادا بندی جیسے خیال موجود ہوں، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں بھی ایہام گوئی سے اجتناب برتا اور شعراء کے کلام کی بھی اصلاح کی۔

5.7 آب حیات

یہ تذکرہ پہلی مرتبہ 1880ء میں وکٹوریہ پریس لاہور سے شائع ہوا۔ محمد حسین آزاد کی اس تصنیف میں تذکرہ نگاری اور ادبی تاریخ نویسی دونوں خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ یہ تاریخی حیثیت سے مسلم اور اولین ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس تصنیف کے ذریعہ آزاد نے پہلی دفعہ اردو کی ادبی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لیے انھوں نے تلاش بسیار کے بعد شعراء کے حالات جمع کیے اور انہیں تاریخی ترتیب سے جمع کیا۔ آزاد نے پوری کتاب کو پانچ ادوار میں منقسم کیا ہے، جس میں انھوں نے سب سے پہلے اردو زبان کی پیدائش، تاریخ اور اردو پر دیگر زبانوں کے اثرات سے بحث کی ہے۔ اس کے بعد نظم اردو کا ارتقا اور مختلف ادوار قائم کیے ہیں، جس میں منتخب شعراء کے حالات اور ان کے کلام کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے شعراء کا حالات بیان کرنے سے قبل اس عہد کی فنی اور لسانی خصوصیات بھی بیان کی ہیں۔ لیکن تحقیقی نقطۂ نظر سے یہ کتاب موجودہ نظریات کی رو سے بعض خامیوں کا شکار ہوگئی ہے، جن کی طرف عبدالباری آسی، حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود جیسے پایہ کے محققین نے توجہ مبذول کرائی ہے۔ پھر بھی اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ آب حیات اردو کی چند اہم اور مقبول ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ 'آب حیات' کے ذریعہ ہی تحقیق کی نئی راہیں ہموار ہوئیں۔

محمد حسین آزاد کی خصوصیت یہ ہے کہ مختلف تذکروں میں شعرائے اردو کے جو حالات منتشر حالت میں ملتے تھے، انہیں آزاد نے

یکجا کرکے بالتفصیل بیان کردیا ہے۔انھوں نے اس میں اپنی انشاپردازی کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ آب حیات اپنی بعض خامیوں کے باوجود بھی تحسین کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔آزاد نے تشبیہ واستعارے اور مختلف صنائع بدائع کے استعمال سے عبارت میں رنگینی پیدا کرکے نہ صرف یہ کہ اسے دلچسپ بنایا ہے بلکہ نثر کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔آب حیات کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے مالک رام لکھتے ہیں:

> ''بے شبہ(آب حیات)اردو کا پہلا تذکرہ ہے جس میں کچھ تحقیق سے کام لیا گیا ہے بلکہ کسی نہ کسی حد تک اردو زبان کی تاریخ بھی پہلی مرتبہ اسی کتاب میں لکھی گئی ہے۔اس کتاب کا مواد جمع کرنے میں انہیں بہت دن لگے ہوں گے اور اس میں انہیں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ہمارا حق ہے کہ آزاد کی سہل انگاری پر نکتہ چینی کریں ان کی ناانصافی اور کج بینی کے خلاف احتجاج کریں۔ان افسانہ طرازیوں اور حق گوئی سے انحراف پر غم وغصہ کا اظہار کریں لیکن یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم اس سے آب حیات کی اس اہمیت کو بھی نظرانداز کردیں جس کا یہ جائز طور پر مستحق ہے۔''(اردو میں تحقیق،رہبر تحقیق، ص:55)

5.8 تذکروں کے تراجم

بعض دیگر زبانوں کے تذکروں کے اردو تراجم بھی کیے گئے،جن میں اشپرنگر کے''یادگار شعرا''،مولفہ 1850ء،مترجمہ طفیل احمد اور گارساں دتاسی کے''خطبات گارسیں دتاسی'' (1850ء-1869ء)''مطبوعہ انجمن ترقی اُردو،اورنگ آباد، 1935ء، ''مقدمہ خطبات گارساں دتاسی'' از مولوی عبدالحق مطبوعہ انجمن ترقی اردو 1935ء، گارساں کی تالیف''ہندوستانی مصنفین'' اور رسالہ''تذکرات''،مؤلفہ گارساں دتاسی،مترجمہ ذکاءاللہ،مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی اہمیت کے حامل ہیں۔

عام طور سے تذکروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ موجودہ تحقیقی معیار کے حامل نہیں ہیں تاہم اس حقیقت سے انکار بھی ممکن نہیں آج کی تحقیق کا دارومدار انہیں تذکروں پر ہے۔اولین دور کے تذکرہ نگاروں کے سامنے اصول وضوابط نہیں تھے،مواد کی قلت تھی،اس لیے انھوں نے اپنے مزاج اور اپنے عہد کے مطابق جو حقیر سی کوشش کی اس نے بعد میں آنے والے محققین کے لیے راہیں ہموار کردیں۔حنیف نقوی کا کہنا بجا ہے کہ:

> ''تذکرے تاریخ ادب کا ایک جزو بھی ہیں اور ان کی بنیاد بھی۔انھوں نے بلا استثناء تمام مورخین کے لیے تحقیق وتلاش کی ظلمتوں میں چراغ راہ کا کام دیا ہے۔ان کے متفق علیہ بیانات سے حقائق کے عرفان اور واقعات کی تعمیر میں مدد ملتی ہے اور اختلافی مباحث نے ارباب نظر کے ذوقِ تجسس کو بیدار کرکے تحقیقی شعور کی پرورش اور نشوونما کے مواقع فراہم

کیے ہیں۔تذکروں کا یہی وہ بنیادی کردار ہے جو ہر صائب الرائے شخص کو ان کے لازوال تاریخی اہمیت کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔'' (حنیف نقوی، شعرائے اردو کے تذکرے، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1998ء، ص:26)

5.9 آپ نے کیا سیکھا

- اردو میں تذکرہ نگاری کی روایت فارسی سے آئی۔
- اردو ادب میں تحقیق کا باقاعدہ آغاز تذکروں نگاری سے ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ اٹھارہویں صدی سے عمل میں آیا۔
- اردو تذکرہ نگاری کا باقاعدہ سلسلہ انیسویں صدی عیسوی کے بعد سے شروع ہوا، اس سلسلہ کا پہلا تذکرہ مرزا علی لطف کا ''گلشن ہند'' (1801) ہے، جو پہلی بار نومبر 1906 میں مولوی عبدالحق کے مقدمہ کے ساتھ اردوئے معلیٰ میں شائع ہوا۔
- تذکروں میں شعرا کے مختصر تعارف کے بعد ان کے کلام پر رائے بھی پیش کی جاتی تھی اور اکثر و بیشتر شعراء کے کلام کا نمونہ دے دیا جاتا تھا۔
- تذکرہ نگاری کی روایت میر تقی میر کے 'نکات الشعراء' (1752) سے محمد حسین آزاد کی آب حیات (1880) تک قائم رہی۔
- ابطال الباطل، آثار البلاد، آثار الصنادید، آرایش محفل، اُردوئے معلیٰ، ارشاد العارفین، اشعار نساخ (دیوان)، اندرسبھا، اندوختہ گریبان، باغ و بہار، بوستان سعدی، بھگت مالا، حدایق البلاغہ، دربار اکبری، دریائے لطافت، ذکر میر، سخن دان فارس، عبدالغفور نساخ (قلمی نسخہ)، غریب گلزار، کاشف الحقائق جیسے نادر تذکرے اہمیت کے حامل ہیں۔
- تذکرہ نگاری کا بنیادی مقصد شاعروں کا اپنے کلام کو آئندہ نسلوں تک محفوظ رکھنا، شاعری سے لگاؤ، بیاض نگاری، مختلف شعراء کے کلام کا انتخاب، شاعروں کی معاصرانہ چشمک، مشاعروں کے رواج اور اُردو شاعری کی مقبولیت تھی۔
- تذکروں کی ایک اہم تنقیدی خصوصیت معاصرین شعراء سے تقابلی مطالعہ بھی ہے۔ اس میں تذکرہ نگار ایک شاعر کا موازنہ دیگر شعراء سے کرتا ہے۔
- اٹھارہویں صدی میں لکھے جانے والے تذکروں میں چمنستان شعراء (لچھمی نرائن شفیق)، طبقات الشعراء (قدرت اللہ شوق)، تذکرہ شعرائے اردو (میر حسن دہلوی)، تذکرۂ شورش (سید غلام حسین شورش)، مسرت افزا (ابوالحسن)، گلشن سخن (مرزا کاظم علی مبتلا لکھنوی)، گلزار ابراہیم (محمد ابراہیم خاں خلیل)، تذکرہ ہندی (غلام ہمدانی مصحفی)، غبار الشعراء (خوب چند ذکا) اہمیت کے حامل ہیں۔
- انیسویں صدی میں تحریر کیے جانے والے تذکروں میں تذکرۂ عشقی (وجیہ الدین عشقی)، عمدۂ منتخبہ (اعظم الدولہ سرور)، (گلشن ہند) مرزا علی لطف)، ریاض الفصحا (مصحفی)، مجموعہ نغز (قدرت اللہ قاسم)، تذکرۂ بے جگر (خیراتی لال جگر)، طبقات سخن (غلام محی الدین مبتلا)، تذکرۃ الشعراء (ابن امین اللہ)، دستور الفصاحت (احمد علی یکتا)، تذکرہ بہار بے خزاں (احمد حسن سحر)، گلدستہ نازنیناں (کریم الدین)، گلستان بے خزاں (قطب الدین باطن)، خوش معرکہ زیبا (سعادت خاں ناصر)، طبقات

الشعرائے ہند، اول و دوم (کریم الدین)، گلشن ہمیشہ بہار (نصر اللہ خاں)، گلستان سخن (قادر بخش خاں)، سخن شعراء (عبدالغفار نساخ)، شمیم سخن، اول و دوم (عبدالحئی)، انتخاب یادگار (امیر مینائی) اور آب حیات (محمد حسین آزاد) وغیرہ اہم ہیں۔

5.10 اپنا امتحان خود لیجئے

سوال 1: 'تذکرہ' کے لغوی اور اصطلاحی معنی بیان کیجئے؟

سوال 2: تذکرہ نگاری کی خصوصیات پر نوٹ لکھئے؟

سوال 3: تذکرہ نگاری کا مقصد کیا ہے؟

سوال 4: اولین تذکرہ کا نام اور خصوصیات بتایئے؟

سوال 5: آب حیات کی خصوصیات قلمبند کیجئے۔

5.11 سوالات کے جوابات

جواب 1: 'تذکرہ' عربی زبان کا لفظ ہے، جس کا مادہ 'ذکر' ہے، تذکرہ کے لغوی معنی، دستاویز، میمورنڈم، یادداشت، یاد کرنا، یاد آنا، یاد دلانا، یاد دہانی اور سرگذشت کے ہیں۔ اصطلاح میں 'تذکرہ' ایسی کتاب کو کہتے ہیں، جس میں شعراء کے مختصر حالات اور ان کا منتخب کلام درج کیا گیا ہو حالانکہ تذکرہ کے ذیل میں بعض وہ کتابیں بھی آتی ہیں جس میں تاریخی واقعات کا ذکر ہو مثلاً تذکرۂ سلاطین دکن، تذکرہ اولیائے دکن اور مولانا ابوالکلام آزاد کی خودنوشت تذکرہ۔

فی زمانہ مروجہ اصطلاحی معنی میں تذکرہ کے ذیل میں وہی کتابیں شامل کی جاتی ہیں جن میں شعراء کے حالات اور ان کے کلام کا انتخاب شامل ہو۔ بعض کتابیں ایسی ہوتی ہیں جس میں محض شاعر کا نام، تخلص اور کلام یکجا کر دیا جاتا ہے تو اسے بیاض کہا جاتا ہے، جب کہ حیات اور شخصیت کے تفصیلی مطالعے اور کلام کے متعلق مفصل بحث کا احاطہ کرنے والا مواد 'تاریخ ادب' کہلاتا ہے۔ بیاض دراصل اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں اس کا مرتب اپنی ضرورت کے مطابق معلومات کا اندراج کرتا رہتا ہے۔ اس میں نہ کسی ترتیب و تنظیم کا لحاظ رکھنا ہوتا ہے اور نہ اس سے ادبی تقاضوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ تذکرے ابتداً بیاض کی شکل میں پائے جاتے تھے، بیاض میں درج کیے جانے والے اشعار، اقوال اور اقتباسات کو ایک خاص ترتیب دینے اور اس میں شعراء کے کلام کا اضافہ کر دینے کے بعد تذکرے کا وجود ہوا۔

جواب 2: تذکرہ نگار شعراء کے کلام پر اظہار خیال کرتے ہوئے اکثر و بیشتر اشاروں اور کنایوں میں اس کی اصلاح بھی کر دیتا ہے۔ یہ اصلاح لفظی ہوتی تھی اور معنوی بھی۔ اس سے تذکرہ نگار کے تنقیدی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے تذکرہ نگار کو تنقید کے فنی اصولوں اور غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض تذکرہ نگار شعراء کے کلام پر ذاتی رائے بھی دیتے ہیں۔

اس عمل میں رواج کے مطابق لفاظی اور عبارت آرائی کا زیادہ دخل ہوتا ہے۔ ایسے تذکرہ نگار اپنے گروہ کے شعرا کی تعریف کرتے ہیں اور مخالف شعراء کی تعریف سے گریز کرتے ہیں۔

تذکروں کی ایک اہم تنقیدی خصوصیت معاصرین شعراء سے تقابلی مطالعہ بھی ہے۔ اس میں تذکرہ نگار ایک شاعر کا موازنہ دیگر شعراء سے کرتا ہے۔ اس سے تذکروں کی اہمیت میں اضافہ ہوجاتا ہے لیکن بہت سے تذکروں میں یہ صورت حال ناپید ہے۔ کسی شاعر کے ذکر کے دوران تذکرہ نگار اس عہد کی ادبی، سیاسی اور سماجی تحریکوں کا ذکر بھی بین السطور کے طور پر کر دیتا ہے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس تحریک کے سلسلے میں تذکرہ نگاری کی رائے کا عندیہ معلوم ہوجاتا ہے اور ساتھ ہی اس بات کا بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ شاعر اس تحریک سے کس حد تک متاثر رہے۔

جواب 3: تذکرہ نگاری کا بنیادی مقصد شاعروں کا اپنے کلام کو آئندہ نسلوں تک محفوظ رکھنا، شاعری سے لگاؤ، بیاض نگاری، مختلف شعراء کے کلام کا انتخاب، شاعروں کی معاصرانہ چشمک، مشاعروں کے رواج اور اُردو شاعری کی مقبولیت تھی۔ تذکرہ نگاری کے مقاصد میں بقائے نام کی آرزو بھی شامل حال رہتی تھی اور ارباب کمال کی قدر شناسی بھی۔ ادبی و تحقیقی ذوق کی تسکین نیز تاریخی شعور بھی اس کے مقاصد میں اہمیت رکھتے ہیں۔ آپسی رقابت اور معاصرانہ چشمکیں، ادبی گروہ بندیاں، سرپرستوں کی خوشنودی، مشاعروں کی گرم بازاری، اور پسندیدہ کلام کو منظّم ڈھنگ سے جمع کرنے کا ذوق بھی اس کے مقاصد میں شامل تھا۔

اس کے علاوہ تذکرہ نویسی زبان وادب کی تاریخی کڑیوں کو یکجا کرنے کا بہترین عمل ہے۔ اس سے شعراء اور معاصرین کے حالات نیز ان کا کلام محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ تذکرہ نویسی کا کام تذکرہ نگار کے ادبی ذوق کی تکمیل اور تحقیقی مزاج کو تسکین فراہم کرتا ہے۔ تذکرہ نویسی سے ماہرین فن کی خدمات کا اعتراف اور ان کے مقام ومرتبے کی تعین قدر ہوتی ہے۔ یہ عمل سلاطین وامرا کی خوشنودی اور مقام ومرتبہ کے حصول کا سبب بھی ہے۔ اس کے ذریعہ پسندیدہ کلام کو آئندہ نسلوں تک محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔

جواب 4: اردو کا اولین تذکرہ نکات الشعراء ہے۔ اس میں 103 فارسی شعراء کے مختصر حالات اور کلام کا انتخاب شامل ہے حالانکہ میر نے شعراء کے حالات کو بہت اختصار کے ساتھ لکھا ہے لیکن اس انداز میں لکھا ہے کہ ان کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کر دی ہیں۔ شعراء کا تذکرہ مختصر ہونے کے باوجود بڑی حد تک مکمل معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے حالات کے بیان کے ساتھ ساتھ شعراء کے عہد اور اس ماحول پر روشنی ڈالی ہے۔ اس تذکرہ میں شعراء کی ولادت، وفات، واقعات کے سنین وغیرہ بہت اختصار کے ساتھ درج ہیں۔

نکات الشعراء کی اہمیت اس لیے بھی مسلم ہے کہ اس میں شاعری کے حوالے سے میر جیسے عظیم شاعر کے نظریات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ نظریات نکات الشعراء میں کثرت سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس میں میر نے شعراء اور ان کے کلام پر جو تنقید کی ہے اس سے ان کے شعری نظریات کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے شاعری کے جو اصول اور معیارات وضع کیے تھے، انہیں

اصولوں پر شعراء کے کلام کی تنقید کی ہے۔چونکہ میر ایہام کو شاعری کے لئے روا نہیں سمجھتے تھے،جس میں تجنیس،ترصیع،صفائی،گفتگو،ادابندی جیسے خیال موجودہوں،یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں بھی ایہام گوئی سے اجتناب برتا اور شعراء کے کلام کی بھی اصلاح کی۔

جواب 5: محمد حسین آزاد کی اس تصنیف میں تذکرہ نگاری اور ادبی تاریخ نویسی دونوں خصوصیات پائی جاتی ہیں۔یہ تاریخی حیثیت سے مسلم اور اولین ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔اس تصنیف کے ذریعہ آزاد نے پہلی دفعہ اردو کی ادبی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کے لیے انھوں نے تلاش بسیار کے بعد شعراء کے حالات جمع کیے اور انہیں تاریخی ترتیب سے جمع کیا۔آزاد نے پوری کتاب کو پانچ ادوار میں منقسم کیا ہے،جس میں انھوں نے سب سے پہلے اردو زبان کی پیدائش،تاریخ اور اردو پر دیگر زبانوں کے اثرات سے بحث کی ہے۔اس کے بعد نظم اردو کا ارتقا اور مختلف ادوار قائم کیے ہیں،جس میں منتخب شعراء کے حالات اور ان کے کلام کو پیش کیا ہے۔انھوں نے شعراء کا حالات بیان کرنے سے قبل اس عہد کی فنی اور لسانی خصوصیات بھی بیان کی ہیں۔لیکن تحقیقی نقطۂ نظر سے یہ کتاب موجودہ نظریات کی رو سے بعض خامیوں کا شکار ہوگئی ہے،جن کی طرف عبدالباری آسی،حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود جیسے پایہ کے محققین نے توجہ مبذول کرائی ہے۔پھر بھی اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ آب حیات اردو کی چند اہم اور مقبول ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔محمد حسین آزاد کی خصوصیت یہ ہے کہ مختلف تذکروں میں شعرائے اردو کے جو حالات منتشر حالت میں ملتے تھے،انہیں آزاد نے یکجا کرکے بالتفصیل بیان کردیا ہے۔انھوں نے اس میں اپنی انشاپردازی کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ آب حیات اپنی بعض خامیوں کے باوجود بھی تحسین کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔آزاد نے تشبیہ واستعارے اور مختلف صنائع بدائع کے استعمال سے عبارت میں رنگینی پیدا کرکے نہ صرف یہ کہ اسے دلچسپ بنایا ہے بلکہ نثر کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔

5.12 فرہنگ

الفاظ	معانی
بیاض	سادہ کاغذ،سفید کتاب اشعار یا نوٹ لکھنے کے لیے،اصطلاحاً وہ کتاب جس میں یادداشت وحساب لکھتے ہیں
چشمک	چھیڑ چھاڑ،طعن وتشنیع،نوک جھونک
عندیہ	رائے،خیال،کسی چیز کے متعلق دل میں پوشیدہ خیال
تتبع	تقلید،نقل،پیروی،اتباع
مسلمات	طے شدہ،وضع کی ہوئی یا تسلیم کی ہوئی چیزیں
وسط	بیچ،درمیان،قلب،مرکز
اولین	اگلے زمانے کے لوگ،سب سے پہلی چیز

ایہام	وہ صنعت جس میں دو یا زیادہ مطالب کے متعلق یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ ان میں کون سا درست ہے
ترصیع	تزئین، ترتیب دینا، مرتب اور درست حالت میں رکھنا
تجنیس	دو لفظوں کا تلفظ میں مشابہ اور معنی میں مختلف ہونا
اجتناب	پرہیز، کنارہ کشی، پہلو بچانا، دور رہنا

5.13 کتب برائے مطالعہ

1. شعرائے اردو کے تذکرے — حنیف نقوی — نسیم بک ڈپو، لکھنؤ — 1976
2. آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق — مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی — اردو اکادمی، دہلی — 1990
3. تذکرہ گلشن ہند — حیدر بخش حیدری — مرتبہ مختار الدین احمد، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ 1966
4. جامعات میں اردو تحقیق — رفیع الدین ہاشمی — ہائر ایجوکیشن کمیشن، اسلام آباد — 2008
5. انجمن ترقی اردو ہند کی علمی و ادبی خدمات، شہاب الدین ثاقب — لیتھو کلر پرنٹرس، علی گڑھ — 1990

بلاک:2

اکائی:6 اردو میں تحقیق و تدوین کی روایت

اکائی:7 تدوینِ متن: اصول و مسائل

بلاک 2 کا تعارف

چھٹی اکائی میں ''اردو میں تحقیق وتدوین کی روایت'' پر گفتگو کی گئی ہے۔اس اکائی میں اردو میں تحقیق وتدوین کے آغاز و ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس کے ارتقائی مراحل کو دو حصوں، جنوبی ہند اور شمالی ہند میں اردو تحقیق وتدوین میں تقسیم کر کے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

ساتویں اکائی میں ''تدوینِ متن: اصول ومسائل'' پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔جس میں تدوین کی تعریف، متن کی تعریف، مخطوطے کی تعریف پیش کی گئی ہے۔اصطلاحات تدوین کا ذکر کرتے ہوئے ان کی تعریفات بھی پیش کی گئی ہیں۔ساتھ ہی تدوین کے اصول ومسائل کا بھی بیان کیا گیا ہے۔

اکائی 6: اردو میں تحقیق وتدوین کی روایت

6.1 اغراض ومقاصد

6.2 تمہید

6.3 تحقیق وتدوین کی روایت

6.4 جنوبی ہند میں اردو تحقیق

6.5 شمالی ہند میں اردو تحقیق

6.6 آپ نے کیا سیکھا

6.7 اپنا امتحان خود لیجیے

6.8 سوالات کے جوابات

6.9 فرہنگ

6.10 کتب برائے مطالعہ

6.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- اردو میں تحقیق کے آغاز سے متعلق جانکاری ہوجائے گی۔
- تحقیق کی ارتقائی منزلوں سے واقفیت ہوجائے گی۔
- تحقیق کے اولین بنیادگزاروں کو جان سکیں گے۔
- جنوبی ہند میں تحقیق کے ارتقا کو سمجھ سکیں گے۔
- شمالی ہند کے محققین سے آگاہی ہوجائے گی۔
- ابتدا سے عصر حاضر تک تحقیقی صورت حال ذہن نشین ہوجائے گی۔

6.2 تمہید

اردو میں تحقیق وتدوین کی ابتدا شاہ حاتم سے تسلیم کی جاتی ہے، جب انھوں نے ''دیوان زادہ'' کے نام سے اپنے دیوان کا انتخاب تیار کرکے شائع کیا۔اسی طرح خان آرزو کی ''نوادرالفاظ'' سے اردو میں تدوین کا آغاز سمجھا جاتا ہے۔بعد کے محققین میں مولوی عبدالحق کا نام سرفہرست ہے،جنھوں نے شعراے اردو کے کئی تذکروں اور شاعروں کے دواوین کو مرتب کرکے تحقیق وتدوین کا بلند معیار قائم کیا۔پروفیسر محمود شیرانی نے ''پنجاب میں اردو'' جیسی محققانہ کتاب تصنیف کی اورقدرت اللہ قاسم کے تذکرے

''مجموعۂ نغز'' کو مرتب کیا۔ ڈاکٹر نصیرالدین ہاشمی نے اہم تحقیقی و تدوینی کام انجام دیے اور ''دکن میں اردو'' نامی اہم کتاب تصنیف کی۔ البتہ بیسویں صدی تدوین کے اعتبار سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں ابتدا سے انتہا تک تحقیقی نوادر کی کثرت رہی ہے۔ چنانچہ دکن میں بیسویں صدی کے دوسرے دہے میں تحقیق و تدوین کا کام ذوق وشوق سے ہونے لگا تھا، جس میں مولوی شمس اللہ قادری، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، عبدالقادر سروری، نصیرالدین ہاشمی اور مولوی عبدالحق کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

انیسویں اور بیسویں صدی اردو ادب میں تحقیق و تدوین کے حوالے سے کافی اہمیت رکھتی ہے۔ انیسویں صدی میں اردو ادب میں جن محققین نے تحقیق کی دنیا میں شہرت حاصل کی، ان میں سر سید احمد خاں، محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی اور علامہ شبلی نعمانی کے کارنامے ادبی تخلیقات کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ سر سید محققانہ ذہن کے حامل مصنف تھے۔ انھوں نے آئین اکبری، تزک جہانگیری اور تاریخ فیروز شاہی کی سائنٹفک بنیادوں پر تدوین کی۔ انیسویں صدی کے وسط میں سر سید نے آئین اکبری، تزک جہانگیری اور تاریخ فیروز شاہی کی سائنٹیفک انداز سے ترتیب وتدوین کر کے تدوین کے فن کا ایک مثالی نمونہ پیش کیا۔

بیسویں صدی میں متعدد ادیبوں نے تحقیق و تدوین کے مثالی نمونے ادبی دنیا کی خدمت میں پیش کیے۔ حافظ محمود خاں شیرانی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، مسعود حسین خان، رشید حسن خاں، مسعود حسن رضوی ادیب، مالک رام، پروفیسر نذیر احمد وغیرہ، یہ وہ افراد ہیں جنھوں نے تدوین و ترتیب کے معیاری اور اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں۔ قاضی عبدالودود تحقیق میں ایک بڑا نام ہے، جنھو ں نے غالب بحیثیت محقق، یادداشت ہائے قاضی عبدالودود، جہان غالب اور دیوان جوش وغیرہ کے ذریعہ ایک بڑے محقق و مدون کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی۔ امتیاز علی خاں عرشی نے دیوان غالب (نسخۂ عرشی) مرتب کر کے تدوین کا بہت اہم کارنامہ انجام دیا۔ دیگر اہم محققین و مدونین میں مالک رام، نورالحسن ہاشمی، مسعود حسین خاں، نذیر احمد، مختارالدین احمد آرزو، مشفق خواجہ، خلیق انجم، رشید حسن خاں، تنویر احمد علوی، فرمان فتح پوری، محمود الٰہی اور حنیف نقوی کے نام بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ رشید حسن خاں ہم عصر تحقیق و تدوین کا ایک بہت بڑا نام ہے۔ تحقیق و تدوین کی اس روایت کو ترویج دینے میں حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، مولوی عبدالحق، امتیاز علی عرشی، نیاز فتح پوری اور ڈاکٹر عندلیب شادانی وغیرہ بھی پیش پیش رہے۔

6.3 تحقیق و تدوین کی روایت

شعرائے اردو کے تذکروں کے بعد اردو میں باقاعدہ تحقیق و تدوین کی روایت انیسویں صدی کے اواخر سے عمل میں آئی۔ تحقیق کی روایت آب حیات (1880) سے تسلیم کی جاتی ہے۔ یہ کتاب تذکرہ نگاری کی آخری کتاب بھی سمجھی جاتی ہے لیکن اردو میں تحقیق و تدوین کی باقاعدہ ابتدا شاہ حاتم کے ''دیوان زادہ'' سے ہوتی ہے۔ اسی طرح خان آرزو کی ''نوادرالفاظ'' سے اردو میں باقاعدہ تدوین کا آغاز سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد امداد امام اثر کی ''کاشف الحقائق'' (1897)، عبدالسلام ندوی کی ''شعرالہند'' (1938) وغیرہ تحقیقی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ یہ تینوں کتابیں شاعری کی تحقیقی و تنقیدی تاریخ تک محدود ہیں۔ نثر میں اولین تحقیقی کتاب احسن مارہروی کی ''تاریخ نثر اردو'' (1930) ہے جس میں نثر نگاروں کے حالات اور نثری نمونے درج ہیں۔ یحییٰ تنہا کی تالیف ''سیرالمصنفین''

(1924) بھی اہمیت کی حامل ہے۔اس میں سرسید، آزاد، حالی، نذیر اور شبلی وغیرہ کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ حامد حسن قادری کی تالیف ''داستان تاریخ اردو'' (1941) میں اردو ادب کا تحقیقی جائزہ ہے۔اسی زمانے میں رام بابو سکسینہ کی ''تاریخ ادبِ اردو'' 1929 بھی اہمیت کی حامل ہے۔ بعد کے زمانوں میں مولوی عبدالحق کی ''اردوئے قدیم'' (1925) اور محی الدین قادری زور کی ''اردو شہ پارے'' (1929) تحقیقی تصانیف ہیں۔ ہاشمی کی ''دکن میں اردو''، عبدالسلام ندوی کی ''شعرالہند'' تحقیقی جہات کے در وا کرتی ہیں۔نورالحسن ہاشمی کی ''دلی کا دبستان شاعری'' (1943) اور ابواللیث صدیقی کی ''لکھنؤ کا دبستان شاعری'' (1944) سندی تحقیق کے اولین نمونے ہیں۔اس کے علاوہ عبدالقادر سروری کی ''اردو مثنوی کا ارتقا'' (1936) میں قدیم مثنویوں کی تاریخ ہے۔حالی کی ''یادگار غالب'' (1896) شخصی حالات وکوائف کی تحقیقی کتاب ہے۔اس کے بعد شخصیت کی تحقیق کا سلسلہ چل نکلا اور غلام رسول مہر نے 1935 نے غالب کی زندگی پر ایک مستند کتاب 'غالب' تالیف کی۔

6.4 جنوبی ہند میں اردو تحقیق

تحقیق وتدوین کا باقاعدہ آغاز دکن کے سر جاتا ہے۔دکن کے محققین میں قادری، شمسی، زور اور سروری دکنی زبان وادب کی تحقیق میں اہمیت کے حامل ہیں۔انھوں نے دکن میں تحقیق کی ابتدا کر کے جدید تحقیق کے اصول وضوابط بھی مرتب کیے اور تحقیقی معیار کو بھی بڑی حد تک معتبر بنایا۔

شمس اللہ قادری (1953-1885)- قادری کی تحقیقی وتاریخی کتاب ''اردوے قدیم'' (1926) ہے۔اس کے بیشتر مضامین لسان العصر میں شائع ہو چکے تھے، بعد میں یہی مضامین کتابی صورت میں یکجا کر دیے گئے۔اس کتاب میں بہمنی، قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنت کے علاوہ اورنگ زیب اور گجرات کے شعراء وادباء کے حالات اور ادبی کارناموں کا تحقیقی تجزیہ کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ قادری نے دکن کیمشہور شاعر سید محمد والہ اوران کی مثنوی ''طالب وموہنی'' کی تحقیق وتخریج کی ہے۔انھوں نے عین الدین گنج العلم اور شاہ میراں جی شمس العشاق کے رسائل ''جل ترنگ'' اور ''گل باس'' کی تحقیق وتدوین کر کے شائع کیا۔

نصیرالدین ہاشمی (1965-1895)- ہاشمی کا اہم تحقیقی کارنامہ ''دکن میں اردو'' (1925)۔ان کے دیگر تحقیقی کاموں میں ''مدراس میں اردو'' اور ''یورپ میں دکنی مخطوطات'' ''خواتین دکن کی اردو خدمات'' (1929)، ''سلاطینِ دکن کی ہندوستانی شاعری'' (1932) ''دکنی کے چند تحقیقی مضامین'' (1963) دکنی ہندو اور اردو (1956) اور ''مقالاتِ ہاشمی'' (1979) وغیرہ اہمیت کی حامل ہیں۔اہاشمی نے ہی نظامی گنجوی کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کی دریافت کی۔

محی الدین قادری زور (1962-1905)- زور کی تحقیقی سرگرمیاں ان کے ڈاکٹریٹ کے تحقیقی مقالہ ''اردو کے آغاز وارتقا'' سے شروع ہوتی ہیں۔ان کی دیگر تحقیقی کتابوں میں ''ہندوستانی لسانیات'' اور ''ہندوستانی صوتیات'' اہم ہیں، جو ان کے مقالے کا حصہ ہیں اور بعض تبدیلیوں کے ساتھ الگ سے شائع کیا گیا ہے۔''اردو شہ پارے'' (1928) عہدِ عثمانیہ میں اردو کی ترقی (1934) داستان ادب حیدرآباد (1951) اور ''دکنی ادب کی تاریخ'' (1960) زور کی خالص تحقیقی تصانیف ہیں جبکہ تدوینی

کارناموں میں ''گلزار ابراہیم مع گلشن ہند'' (1934)، '' مکتوبات شاد عظیم آبادی'' (1939)، ''کلیات قلی قطب شاہ'' (1940)، ''ابراہیم نامہ، ارشاد نامہ'' (1940)، قطب شاہی سلطنت کے پیشوا محمد مومن کی سوانح حیات ''سلطان میر محمد مومن'' (1941) اہمیت کی حامل ہیں۔

عبدالقادر سروری (1906-1971)۔صنعتی نے دکنی زبان وادب کے سلسلہ میں اہم تحقیقی اور تدوینی کارنامے انجام دیے۔ ان کے کارناموں میں مثنوی قصہ بے نظیر (1937) نشاطی کی مثنوی ''پھول بن'' کی ترتیب وتدوین (1938)، ''کلیات سراج'' کی ترتیب (1940) اور شاہ صدرالدین کی تالیف ''مراۃ الامراء'' کو 1940 میں شائع ہوئیں، جو اہم تحقیقی اور تدوینی کارنامے ہیں۔انھوں نے ''اردو مثنوی کا ارتقاء'' میں دکن کی مثنویوں کا تاریخی اور تحقیقی نوعیت سے تجزیہ کیا ہے۔ان کے علاوہ دکن کے بہت سے ایسے محققین ہیں جنھوں نے اردو ادب اوراس کے سرمایہ کی تحقیقی وتدوینی خدمات سے قابل قدر اضافہ کیا۔

6.5 شمالی ہند میں اردو تحقیق

مولوی عبدالحق (1870-1963)

مولوی عبدالحق کا شمار بیسویں صدی کے مشہور محققین میں ہوتا ہے بحیثیت مدیر رسالہ اردو اور آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو کی حیثیت سے ان کا نام کافی شہرت رکھتا ہے دکن میں اردو زبان کی ترقی مولوی عبدالحق ہی کی زبردست کوششوں کا نتیجہ ہے۔انجمن ترقی اردو ہند کی عنان کاروبار ان ہی کی بدولت ہے۔ان ہی کی زیر سرپرستی مفید اور کارآمد کتابیں (تالیفات یا تراجم) شائع ہوئے، انجمن کی بعض دوسری مطبوعات پر نہایت پر مغز تحقیقی نوعیت کے دیباچے یا پیش لفظ انہیں کے تحریر کردہ ہیں، جن سے آپ کی علمی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے اس کے علاوہ اکثر وبیشتر جو تحقیقی مضامین انہوں نے رسائل کے لئے شائع کئے وہ نہایت گرانقدر اور موقر سمجھے جاتے ہیں۔انہوں نے تمام عمر اردو کی خدمت کی انہیں ہی کی کھوج وتلاش کا کارنامہ ہے کہ قدیم اردو کے قلمی نسخے جو امتداد زمانہ سے طاق نسیاں پر پڑے اپنی آخری سانسوں کے منتظر تھے اور نابود ہوجانے کی منزل پر تھے دوبارہ زندگی پاسکے۔اسی طرح قدیم تاریخ اردو یا نظم ونثر سے آج اردو والے واقف ہیں وہ بھی بیشتر طور پر مولوی عبدالحق صاحب کی کدوکاوش کا نتیجہ ہیں۔مولوی صاحب کی تحقیق ہمیشہ غیر جانب دارانہ اور تنقید منصفانہ ہوتی ہے۔اردو نثر نگار کی حیثیت سے ان کا مرتبہ بہت بلند ہے ان کی تحریر کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہندی کے سہل الفہم الفاظ اپنی تحریر میں اس طرح کھپاتے ہیں کہ اس کا حسن دوبالا ہوجاتا ہے۔انہیں نے زبان و بیان پر پوری دسترس حاصل ہے۔

مولوی عبدالحق کی ایک اہم تحقیقی کاوش ملا وجہی کی ''سب رس'' (1933) اردو زبان میں علمی اصطلاحات (1961)، اردو صرف ونحو (1934)، اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام (1949)، انتخاب کلام میر بمع مقدمہ، اردو انگریزی لغت (1977) اور باغ وبہار (ترتیب و تدوین) ہیں۔مولوی عبدالحق کے مرتب کردہ کتابوں میں چمنستان شعراء (1928)، مخزن نکات (1929)، ریختہ (1933)، تذکرہ ہندی (1933)، مخزن شعر (1933)، عقد ثریا (1934)، ریاض الفصحا (1934)، گل عجائب (1934) نکات الشعر (1751) تذکرہ ریختہ گویاں (1752) چمنستان شعرا (1761) گل عجائب (1779) عقدِ ثریا (

1784) تذکرۂ ہندی (1794-1785) ریاض الفصحا (1806-1820) ،مخزن شعرا (1851) وغیرہ اہمیت کی حامل ہیں۔

مسعود حسن رضوی ادیب (1893۔1975)

مسعود حسن رضوی ادیب کا ہے کی تحقیق کا طریق کار سائنٹیفک اصولوں پر مبنی ہے۔ان کا اہم تحقیقی کاموں میں اردو کے رثائی ادب کی تحقیق وتنقید ہے۔رثائی ادب سے متعلق ان کی تصنیفات میں شاہکار انیس (1943) ،رزم نامہ انیس (1957) ،شاعر اعظم انیس (1966) ،اسلاف میر انیس (1970) ،انیسیات (1976) اہم ہیں۔اس سلسلہ میں انھوں نے انیس کے کلام کے متن کی تصحیح روح انیس (1926) بڑا اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ادیب کی تحقیقی وتدوینی کارناموں میں دیوان فائز ،فیض میر ،مجالس رنگین ،اودھ کا شاہی اسٹیج اور اودھ کا عوامی اسٹیج جیسی بلند پایہ کتابیں شامل ہیں ۔اس کے علاوہ آب حیات کا تنقیدی مطالعہ (1913) ،فیض میر (1929) ،متفرقاتِ غالب (1947) ،شرحِ طباطبائی اور تنقید کلام غالب (1973) ، مراثیِ ریختہ (1984) وغیرہ ہیں۔اردو ڈرامے کی تحقیق ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ڈرامے کے متعلق انھوں نے بہت سی معلومات فراہم کیں۔اس سلسلہ کی ان کی کتابوں میں لکھنؤ کا عوامی اسٹیج (1956) ،لکھنؤ کا شاہی اسٹیج (1957) ،اندرسبھا: ترتیب وتدوین (1968) وغیرہ ہیں۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی (1897۔1969)

شادانی نے اپنی تحقیقی کاوش ،محنت اور لگن سے بیشتر کتابوں کی تحقیق کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں ،ان میں دومشہور کتابیں ’’تحقیقات‘‘ ،اور ’’تحقیق کی روشنی میں‘‘ اردو ادب کے بہترین تحقیقی سرمائے ہیں۔’تحقیقات‘ میں سترہ تحقیقی وتنقیدی مقالات شامل ہیں، جو خالص تحقیقی نوعیت کے ہیں ،جبکہ بعض مقالات تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کے ہیں۔

خواجہ احمد فاروقی: (1917۔1995)

خواجہ احمد فاروقی‘ زندگی بھر اردو ادب کے تحقیقی کاموں میں مصروف رہے۔ان کی تحقیقی کاوشوں میں میر: حیات اور شاعری اور مرزا شوق لکھنوی اہم ہیں۔ان کے علاوہ دہلی کالج میگزین کا ’قدیم دہلی کالج نمبر‘ ان کی تحقیقی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

مالک رام (1906-)

مالک رام کی ولادت 22 دسمبر 1906 کو ہوئی تھی۔ابتدائی تعلیم سے فارغ ہو کر انہوں نے مقامی ورنا کیولر مڈل اسکول سے اردو مڈل کا امتحان 1902 میں پاس کیا۔دو سال بعد 1922 میں ہائی اسکول کے امتحان میں پاس ہوئے نامعلوم حالات کی بنا پر دو سال تعلیمی سلسلہ منقطع رہا بعد میں 1926 میں انہوں نے انٹرمیڈیٹ اور 1928 میں بی اے کی اسناد حاصل کیں۔ 1930 میں مالک رام نے ایم اے (تاریخ) پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا اور اسی یونیورسٹی سے 1932 میں ایل ایل بی پاس کر لیا۔تعلیم سے فراغت کے بعد 1932 سے 1935 تک ہفت روزہ آریہ گزٹ سے منسلک رہے اس کے ایک سال بعد یعنی 1936 سے 1938 تک ایک عارضی سرکاری ملازمت کرتے رہے۔کچھ دن ادھر ادھر بھٹک کر ان کے دن پھر گئے اور 1948 میں یہ انڈین فارن سروس کے منتخب ہوئے ، جسے انہوں نے 1965 تک نہایت ذمہ داری سے نبھا کر ملازمت سے سبکدوش ہو گئے ۔فارن سروس سے منسلک رہ کر ان کو مغربی ایشیاء شمالی افریقہ اور دوسرے ممالک کے ہندوستانی سفارت خانوں میں کام کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔اس

سرکاری ملازمت کے بعد دو سال تک یعنی 1965 سے 1967 تک ساہتیہ اکیڈمی (اردو) کے ایڈیٹر بھی بنائے گئے۔ اسی زمانے میں مالک رام کی ادارت میں 1967 سے 1978 تک سہ ماہی رسالہ تحریر نکلتا رہا۔ مالک رام ایک ممتاز محقق ماہر غالبیات اور آزاد شناس تھے۔ انہوں نے اپنی مساعی جمیلہ سے تحقیق کی روایت کو عروج دیا اور اسے آگے بڑھایا۔ مالک رام کی اسلامیات پر بھی گہری نگاہ تھی۔ وہ صحیح معنوں میں غیر متعصب انسانیت نواز اور انسان دوست تھے۔ تمام تر تعصّبات سے دور رہ کر انہوں نے تاحین حیات زبان اردو کے عروج و ارتقاء کیلئے عظیم خدمات انجام دیں ان کی تصانیف میں ذکر غالب، عورت اور اسلام، ایرانی شاہنشاہ کے ڈھائی ہزار سال تذکرہ معاصرین (یہ چار جلدوں میں ہے) تذکرہ ماہ و سال، وہ صورتیں الٰہی، قدیم دلی کالج، فسانہ غالب اور اسلامیات، گفتار غالب، تلامذہ غالب اور انتخاب نثر ابوالکلام آزاد لائق قدر کتابیں ہیں، جو ان کے نام اور کام کی ابدیت کی ضمانت فراہم کرتی ہیں۔

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط

ڈاکٹر یحییٰ نشیط کا پہلا تحقیقی مضمون ''بھارتیہ ہریش چند کی اردو خدمات'' 1971 میں کامٹی (ضلع ناگپور) سے شائع ہونے والے ہفت روزہ ''تاج'' میں شائع ہوا اور جلدی ہی دوسرا مضمون ''مولانا ابوالکلام آزاد کا مطالعہ' ہفت روزہ ''ہماری زبان'' دہلی میں چھپا۔ اس کے بعد برابر تحقیقی مضامین لکھنے کا سلسلہ جاری ہے۔ ڈاکٹر یحییٰ نشیط کا یہی وہ عزم و حوصلہ تھا، جس نے ان کی تحریر میں گرفتگی اور وقار پیدا کیا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی عرق ریزی اور سخت کوشی ایماندارانہ رویے نے ان کو مقبولیت عطا کی ہے۔ نشیط صاحب کی تحقیق کا مقصد عام مسائل سماج سے دامن سمیٹے رہنے کے باوجود بھی اس کے ہم رتبہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے ''اردو مراٹھی کے باہمی روابط'' اور ''اردو مراٹھی کے تہذیبی رشتے'' کا مقصد ہی ہندو مسلم دلوں کو جوڑنا ہے۔ ان کی اشاعت کے بعد جب یہ ظاہر ہوا کہ انہوں نے تکارام، ایک ناتھ، جیوتی باپھولے وغیرہ کے نعتیہ کلام کو بھی پاکستان میں متعارف کرایا، جو ان کی عظمت بطور محقق اور بھی مستحکم ہوگئی۔ ڈاکٹر نشیط نے تقدیسی اصناف مثلاً نعت، حمد وغیرہ پر بھی کافی تحقیقی کام کیا ہے۔ ان کی ''اردو میں حمد و مناجات'' تحقیق کا زبردست کارنامہ ہے۔ اس کتاب کو اردو کی اولین کوشش قرار دے کر ہندو پاک میں اسے نظر استحسان سے دیکھا گیا اور اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ اس کے علاوہ انہوں نے ادبی تحقیقات میں شامل مذہبی عناصر کا بھی تقابلی جائزہ لیا ہے۔ ان کے اکثر مضامین معارف اعظم گڑھ، نعت رنگ کراچی اور الانصار حیدرآباد کے رسائل اور جرائد میں شامل ہوتے رہے۔ انہوں نے چند انشائیے بھی قلمبند کئے، جو ماہنامہ ''شگوفہ'' حیدرآباد میں اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر یحییٰ نشیط تحقیق کے ساتھ تنقید کے سلسلے میں نہایت مناسب اور معتبر رویہ ظاہر کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جدید ترین اردو تنقید میں رائے زنی کی گرم بازاری ہے، جو جملہ بازی کی حد تک پہنچ چکی ہے۔ ہر شخص دوسرے پر تبصرہ کرنے کیلئے بیقرار ہے۔ اور پہلی فرصت میں اپنا یا پرایا دماغ صاف کر دینا چاہتا ہے۔ صفائی کی اس مہم نے نہایت گندگی پھیلائی ہے اعلیٰ تنقید کا فریضہ، تجزیہ اور موازنہ کر کے فیصلہ کرنا بھی ہوتا ہے تا کہ ادب کی قدر و قیمت متعین کرنے کا کام ہو سکے یہی مقصود تنقید ہے۔ ڈاکٹر یحییٰ کا یہ ذہن عظمت اللہ اور کلیم الدین احمد جیسے ناقدین کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے۔ ڈاکٹر نشیط کے اب تک ''اردو مراٹھی کے تہذیبی رشتے'' (1996) ف س اعجاز ہشت پہلو فن کار

(2000) اردو میں حمد ومناجات (پاکستانی ایڈیشن)(2000) اردو مراٹھی کے باہمی روابط (2006) اسطوری فکر وفلسفہ اردو شاعری میں (۲۰۰۸) حمد ومناجات کا دوسرا ہندوستانی ایڈیشن وغیرہ کتابیں شائع ہوکر سند قبولیت حاصل کر چکی ہیں۔فن زمانہ وہ ''اردو رباعیات میں ہندوستانی عناصر''اوراردو میں''نعت گوئی'' کی ترتیب وتدوین میں مصروف ہیں۔

حافظ محمود شیرانی (1880-1946)

شیرانی کواردو تحقیق کا معمار اول مانا جاتا ہے۔انھوں نے فارسی اور اردو زبان وادب سے متعلق مختلف موضوعات پر تحقیق کی۔ان کے پسندیدہ موضوعات میں لسانیات،لغت وقواعد،عروض وبلاغت،شعروادب اور تذکرے شامل ہیں۔شیرانی نے اردو کی پیدائش کے بارے میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ اردو پنجاب سے نکلی اپنے اس قول کے ثبوت میں انہوں نے مختلف دلائل کی بنیادوں پر یہ واضح کیا ہے کہ اردواور پنجابی میں بہت یکسانیت ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو کا مولد پنجاب ہے۔پنجاب میں اردوان کی گرانقدر تصنیف ہے۔ان کی دوسری اہم تحقیق پرتھوی راج پر ہے۔قدرت اللہ قاسم کے تذکرے مجموعہ نغز کا واحد نسخہ جو پنجاب یونیورسٹی لاہور میں محفوظ تھا،انہوں نے بڑی دیدہ ریزی اورعرق ریزی سے اسے مرتب کر کے اشاعت پذیر کیا۔ڈاکٹر محمود شیرانی عربی فارسی کے بڑے عالم تھےان کا مطالعہ بہت وسیع تھااس بناپر وہ اکثر محققین ومصنفین کی غلطیوں کی بہت آسانی سے گرفت میں لے لیتے تھے۔مولانا آزاداورعلامہ شبلی جیسے اکابرین کی غلطیوں کی انہوں نے خاص طور سے نشاندہی کی ہے۔ان کی اہم تحقیقی کتابوں میں''تنقید شعرالعجم،فردوسی پر چار مقالے''،''مقالاتِ حافظ محمود شیرانی''،''خالق باری''(تدوین) بہت اہم ہیں۔ان کے علاوہ قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ''مجموعہ نغز''(ترتیب) اور تحقیقی تصنیف''پنجاب میں اردو'' ہے۔

قاضی عبدالودود (1896-1984)

قاضی عبدالودود ابتدائی تعلیم پٹنہ میں حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کیلئے انگلستان گئے،جہاں سے بیرسٹری کی سندلیکر وطن لوٹے۔مغرب کے اثر اور قانون کے مطالعہ نے انہیں تحقیقی ذہن عطا کیا،چنانچہ انہوں نے وکالت کی طرف متوجہ نہ ہوکر تصنیف وتالیف سے لولگائی مطالعہ کا شوق شروع ہی سے تھا۔چنانچہ اب وہ اپنا سارا وقت اسی کام میں صرف کرنے لگے،ویسے تو ان کا مستقل قیام پٹنہ میں تھالیکن ادبی مشاغل اور امور کیلئے ان کو بار بار پٹنہ سے باہر بھی جانا پڑتا تھا۔خوش خلق ہونے کے ساتھ ہمیشہ بات بہت کھری بےخوف ہوکر کہتے تھے،اوراس معاملے میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بھی رعایت اور رواداری سے کام نہیں لیتے تھے یہ بات تحقیق کیلئے ضروری بھی ہے کہ بات سچ ہو کسی کو بری لگے تو لگے،اس طرح ان کی تنقید بھی نہایت غیر جانب دارانہ ہوتی تھی۔انہوں نے جو کچھ کہا اور لکھا وہ بہت قطعیت کے ساتھ کہا اور اسی طرح انہوں نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر کے دکھادیا۔قاضی عبدالودود نے تحقیق کے میدان میں نہایت نمایاں کارنامے انجام دیئے ہیں۔انہوں نے اپنے وقت کا زیادہ تر حصہ مطالعہ کتب میں صرف یا حافظہ قوی تھا اس لئے جو کچھ پڑھتے وہ حفظ ہوجایا کرتا تھا اسی بنا پر کوئی غلطی ان کی نظر سے بچ نہیں پاتی تھی علمائے ادب کی بھی غلطیوں کوانہوں نے بڑی بےخوفی سے گرفت کی ہے۔ان کے اہم تحقیقی کارناموں میں غالب بحیثیت محقق،یادداشت ہائے قاضی عبدالودود،جہان غالب آوارہ گرد اشعار اور تعین زمانہ شامل ہیں۔دیوان جوشش،دیوان رضا،قطعات رضا اورتذکرہ ان

طوفان مرتب کر کے انہوں نے تدوین کا معیاری نمونہ پیش کیا۔ اشتر وسوزن، قاطع برہان تذکرہ مسرت افزا، عیارستان کی ترتیب ان کے دوسرے اہم کارنامے ہیں۔ انہوں نے پٹنہ سے ایک تحقیقی رسالہ معاصر نکالا، جس نے تحقیق کی نہایت قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ رسالہ تحقیق کا صرف ایک شمارہ نکل سکا۔ قاضی صاحب نے جو زبان استعمال کی، اس میں یقیناً دلکشی مفقود ہے۔ لیکن وہ خالص تحقیقی زبان سے جسے ہم ریاضی کی زبان بھی کہہ سکتے ہیں، کفایت لفظی سے وہ بہت کام لیتے ہیں اور کہیں بھی الفاظ کا غیر ضروری استعمال نہیں کرتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اردو تحقیق ان کے احسان سے دبی ہوئی تو غلط نہ ہوگا۔ قاضی صاحب کی وفات 1874ء میں ہوئی۔

امتیاز علی خاں عرشی (1981-1905)

اردو کے چند اہم محققین میں ان کا بھی شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی تحقیق و تصنیف اور تالیف میں بسر کی۔ اس میدان میں ان کے کارنامے ادبی اہمیت کے حامل ہیں وہ ماہر غالبیات کے لحاظ سے بھی جانے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ رامپور کے ایک عظیم علمی ادارے رضا لائبریری سے وابستہ ہو گئے جہاں ان کو نادر و نایاب کتابوں کا بیش قیمت ذخیرہ مطالعہ کیلئے حاصل ہوا۔ اس ذخیرے سے وہ خود بخوبی فیض یاب ہوئے اور علمی دنیا کو بھی اس سے حتی المقدور فیض پہنچایا۔ ان کا اصل میدان عربی زبان وادب تھا، لیکن اردو میں بھی ان کے کارنامے نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ غالب ان کا خاص موضوع ہے۔ انہوں نے دیوان کو زمانی اعتبار سے مرتب کیا اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب کا کون سا کلام کس زمانے کا ہے، بلاشبہ یہ زبردست کارنامہ ہے۔ ان کی اس فکر سے غالب کے ذہنی افکار کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اسے تدوین کلام اچھا نمونہ کہا جاتا ہے۔ یہ دیوان نسخہ عرشی کے نام سے موسوم ہے۔ احمد علی خاں یکتا کا تذکرہ دستور الفصاحت، مکاتیب غالب (1937)، دیوان غالب (1958)، فرہنگ غالب (1947) بھی انھوں نے بہت محنت و جانفشانی سے ترتیب دیا۔ اس کے علاوہ بہت سے تحقیقی مضامین ان کی یادگار ہیں۔

پروفیسر نورالحسن ہاشمی ()

نے تدوین کلام کی طرف بطور خاص توجہ کی اور اردو تحقیق خصوصی دلچسپی لی۔ ان کا تحقیقی مقالہ دلی کا دبستان شاعری اردو تحقیق کی بنیادی کتابوں میں شمار ہوتا ہے۔ اسی کتاب پر علی گڑھ یونیورسٹی نے پی۔ ایچ ڈگری تفویض کی تھی۔ کلیات ولی، نوطرز مرصع، کلیات علی حسرت مرتب کر کے انہوں نے اردو ادب کی اہم خدمات انجام دی ہیں۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں (2010-1919)

ممتاز محقق، نامور نقاد اور شہرت پذیر ماہر لسانیات پروفیسر ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اردو زبان وادب کی بہت ہی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں شعر وادب کی دنیا میں ان کے کارنامے کبھی فراموش نہیں کئے جاسکتے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا وطن قصبہ قائم گنج ضلع فرخ آباد (اتر پردیش) ہے، جہاں ان کی ولادت 1919 میں ہوئی تھی، دہلی ڈھاکہ (بنگلہ دیش) میں تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم اے اردو اور پی ایچ۔ ڈی کی اسناد حاصل کیں۔ مزید تعلیم کے لئے یورپ گئے اور پیرس یونیورسٹی سے لسانیات میں ڈی لٹ کی ڈگری لے کر واپس آئے وطن لوٹ کر آل انڈیا ریڈیو سے بسلسلہ ملازمت منسلک

ہو گئے۔لیکن یہ ان کا بالکلیہ پسندیہ مشغلہ نہیں تھا۔ بلکہ اصل رجحان ان کا درس وتدریس کی طرف تھا۔ ریڈیو ملازمت سے مستعفی ہو کر وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لیکچرار ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے، کچھ دن بعد علی گڑھ یونیورسٹی میں شعبہ لسانیات میں پہلے پروفیسر وصدر بنائے گئے۔ 1973 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ یونیورسٹی آف کیلی فورنیا (امریکہ) اور کشمیر یونیورسٹی سرینگر میں وزیٹنگ پروفیسر بھی رہے۔ جامعہ اردو علی گڑھ کے اعزازی وائس چانسلر اور علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات کے پروفیسر ایمریٹس کے جلیل القدر عہدوں پر فائز ہوئے اور علی گڑھ کو اپنا مستقر ٹھہرا کر تصنیف وتالیف میں مصروف ہوئے۔ علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے 1984 میں نوازا گیا۔ پروفیسر مسعود حسین خاں شاعری بھی کرتے ہیں۔ دونیم اور روپ بنگال ان کے شعری مجموعے ہیں ان میں ثانی الذکر کا ہندی ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ بکٹ کہانی، عاشورنامہ، اور مثنوی کدم راؤ پدم راؤ سائنسی اصولوں پر ترتیب دے کر انہوں نے نہایت قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ حیدرآباد قیام کے دوران قدیم اردو کے نام سے انہوں نے ایک تحقیقی جریدہ جاری کیا تھا، جس کا مقصد یہ تھا کہ نئے اصولوں کی بنیاد پر قدیم مثنویکی اشاعت، ایک نعت کی تیاری کا کام بھی انہوں نے انجام دیا۔ اقبال کی نظری اور عملی شعریات میں اقبال کی شاعری کا لسانیات کی روشنی میں مطالعہ کیا گیا ہے۔ شعروزبان اردوزبان وادب اور اردو کا المیہ ان کے مضامین کے مجموعے ہیں۔ لسانیات کو یہاں بھی مرکزیت حاصل ہے۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو ان کا سب سے اہم تحقیقی کارنامہ ہے، اس میں اردو کے آغاز وارتقاء کے مسئلہ پر مدلل بحث کی گئی ہے۔ لسانیات کے میدان میں ''مقدمہ تاریخ زبان اردو'' ڈاکٹر مسعود کا اہم کارنامہ ہے یہ ان کا تحقیقی مقالہ ہے، جس میں انھوں نے اردوزبان کے آغاز وارتقاء پر مدلل بحث کی ہے۔ ''قدیم اردو'' کے نام سے انھوں نے ایک تحقیقی جریدہ بھی جاری کیا تھا، جس کا مقصد جدید اصولوں کی بنیاد پر قدیم متون کی تحقیق واشاعت تھی۔ اس کے علاوہ ان کے تدوینی کاموں میں قصہ ''مہرافروز دلبر'' (1955)، ''بکٹ کہانی'' (1979)، ''عاشورنامہ'' اور مثنوی ''پرت نامہ وکدم راؤ پدم راؤ'' وغیرہ ہیں، جن کو انھوں نے سائنٹفک اصولوں پر مرتب کر کے ایک قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔

گیان چند جین: (1923ء۔2007)

جین اردو کے ایک نامور ادیب اور محقق ہونے کے ساتھ بلند پایہ استاد اور ماہر لسانیات بھی ہیں۔ انھوں نے اردو زبان وادب پر بے شمار تحقیقی وتدوینی کتابیں تصنیف کی ہیں جو پوری دنیا میں حوالے جاتی کتابوں کے طور پر کام میں لائی جاتی ہیں۔ لسانیات کے علاوہ انھوں نے تنقید وتحقیق کے میدان میں ''تحقیق غالب، تحقیق اقبال، تحقیق کا فن، اردو کی نثری داستانیں، ایک بھاشا: دو لکھاوٹ دوادب، اردو مثنوی شمالی ہند میں، لسانی مطالعہ، رموز غالب، تجزیے، تحریریں اور قاضی عبدالودود بحیثیت مرتب متن'' وغیرہ یادگار چھوڑیں۔

تنویر احمد علوی: (1923)

تنویر احمد علوی کو ان کے مدلل انداز کے تحقیقی کاموں سے شہرت ملی۔ انھوں نے قدیم دواوین کی تحقیق وتدوین کو اپنے لیے منتخب

کیا۔کسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے ان کا انداز منطقی اور استدلالی ہوتا ہے۔اس سلسلہ میں ان کی کاوشوں میں ''کلیات شاہ نصیر کی تین جلدیں،کلیات ذوق کی دو جلدیں شائع ہوئیں۔اس کے ان کی تصنیف ''اصول تحقیق وترتیب متن''، تفہیم وتعبیر اور تحقیقی وتدوینی مباحث کے لحاظ سے عمدہ کارنامہ ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی:(2019-1929)

اردو ادب کی تاریخ میں جمیل جالبی کا کوئی ثانی نہیں۔وہ بیک وقت محقق اور مورخ کے فرایض انجام دیتے ہیں۔ان کے وسیع علم اور گہری نظر کے باعث اردو دنیا انہیں عزت واحترام کی نظر سے دیکھتی ہے۔ان کی اہم کتاب ''تاریخ ادب اردو'' ہے جس میں اردو کی ابتدا سے اٹھارہویں صدی تک کے ادب کی معروضی اور منطقی تاریخ پیش کی گئی ہے، جو حقائق پر مبنی ہے۔اس کے علاوہ تحقیق و تدوین سے متعلق ان کی دیگر کتابوں میں تاریخ ادب اردو (1977)،ادبی تحقیق (1996)،قدیم اردو کی لغت (1973)، دیوان حسن شوقی (1971)، دیوان نصرتی (1972)،مثنوی نظامی دکنی المعروف بہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (1973) اہم ہیں۔

رشید حسن خاں:(2006-1930)

دور حاضر کے محققین میں رشید خاں کا نام ادب سے لیا جاتا ہے۔وہ تاعمر تحقیقی کاموں میں مصروف رہے اور نتیجتاً درجن بھر سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں۔ان کی مشہور کتابوں میں ادبی تحقیق،تدوین، تحقیق،روایت (1999) اور لفظیات غالب اہمیت کی حامل ہیں اور ان کے تدوینی کارناموں میں مثنویات شوق،فسانہ عجائب، باغ و بہار،گلزار نسیم، دیوان حالی اور زٹل نامہ وغیرہ اہم ہیں۔وہ جدید املا اور تحقیق کے جدید اصولوں کے بنیاد گذار بھی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی تحقیق کا انداز دوسرے محققین سے جداگانہ ہے۔ان کی تحقیقی کتابوں میں ضروری یا امکانی مقامات پر رموز اوقاف اور اعراب سازی بھی ملتی ہے اور املا وتلفظ سے متعلق بھی وضاحت ملتی ہے۔

محمود الٰہی:(1930)

محمود الٰہی نے بیک وقت تخلیق، تحقیق اور تدوین کے فرائض انجام دیے،لیکن ان کا خاص تحقیقی میدان قصیدہ نگاری ہے۔انھوں نے بیگم مہدی کے نام مہدی افادی کے خطوط کو ''صحیفہ محبت'' کے نام سے ترتیب دے کر شائع کیا۔اس کے علاوہ انھوں نے میر تقی میر کے ''نکات الشعراء'' کی ترتیب وتدوین اور ''فسانہ عجائب'' کے بنیادی متن پر بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ تحقیق کر کے ترتیب دیا۔

حنیف نقوی:(2008-1936)

حنیف نقوی کا شمار اردو کے معتبر محققین میں ہوتا ہے۔''شعرائے اردو کے تذکرے'' ان کا تحقیقی مقالہ تھا، جو اردو تحقیق کے سلسلہ میں معتبر حوالی جات کی حیثیت رکھتا ہے۔ان کی تحقیقی روش میں جوش، جذبہ،لگن، ذہانت، دیانت، وسعت علمی اور صبر وتحمل کا عمل دخل رہتا ہے۔ان کے تحقیقی مقالات میں ''تلاش وتعارف'' (1987) غالب: احوال و آثار (1990) جبکہ رجب علی بیگ سرور: چند تحقیقی مباحث (1991) تحقیق و تدوینی کارنامے ہیں۔انھوں نے فضلی کی کربل کتھا (1983) کا ایک انتخاب تفصیلی مقدمے و فرہنگ کے ساتھ شائع کیا۔انھوں نے ''مآثر غالب'' (مرتبہ قاضی عبدالودود) کو معتبر حوالوں اور ضروری حواشی کے ساتھ

دوبارہ مرتب کر کے شائع کیا۔

پروفیسر نذیر احمد (1915-2008)

نذیر احمد کا اصل میدان فارسی ہے۔ان کی تحقیق کا دائرہ فارسی ادبیات کے ساتھ اردو زبان و ادب تک پھیلا ہوا ہے۔انھوں نے فارسی کے قدیم متون اور لغات کی تحقیق و تدوین کے ساتھ اردو کے قدیم متون خصوصاً دکنی متون کی تحقیق اور ان کی ترتیب و تنظیم کا کارنامہ انجام دیا انھوں نے بہت سے تحقیقی مضامین قلمبند کئے، جن کو خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوئی۔ان کا شمار قابل محقق، متنی نقاد، ماہر لغات اور ماہرِ غالبیات میں ہوتا ہے۔غالب سے متعلق ان کا سب سے 'اہم کام 'نقد برہان قاطع' ہے۔نذیر احمد کو اردو ادب کے دکنی سرمایے سے خصوصی دلچسپی ہے۔ابراہیم عادل شاہ ثانی کی نورس کو انہوں نے نہایت سلیقے اور ہنر مندی سے مرتب کیا ہے۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر اور صدر شعبہ فارسی بھی رہے اور اسی عہدے سے باعزت سبکدوش ہوئے۔نذیر احمد کا مزاج تحقیقی ہے، وہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ اسی کام میں صرف کرتے ہیں اسی لئے ان میں فنی ہنر مندیوں کا کمال نظر آتا ہے۔

مختار الدین احمد آرزو (1924-)

ابتدائی تعلیم پٹنہ سے حاصل کر کے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور یہاں سے عربی میں ایم اے اور پی ایچ.ڈی کی اسناد حاصل کیں۔والدہ کی آرزو تھی کہ ان کو جامعہ ازہر بھی بھیجا جائے لیکن یہ زمانہ دوسری عالم گیر جنگ کا تھا، اس لئے والدہ کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔ بالآخر علی گڑھ یونیورسٹی سے وابستہ ہوگئے اور یہیں نمایاں خدمات انجام دیکر بحثیت صدر اور پروفیسر شعبۂ عربی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے ریٹائر ہو کر بھی ہمہ تن و ہمہ وقت ملی مشاغل میں مصروف ہوگئے۔آرزو صاحب بنیادی طور پر عربی کے عالم تھے لیکن اردو سے بھی انہیں دلچسپی تھی۔اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اردو ادب کی تحقیق وتدوین کے کارنامے بھی انجام دیے۔انھوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا، اس سے متعلق تمام امور کا احاطہ کرنے کی کوشش کی۔'' احوال غالب تذکرہ اردو دیوان حضور خطوط اکبر، مکاتیب اکبر، تذکرہ گلشن ہند از حیدری، تذکرہ شعرائے فرخ آباد از ولی اللہ فرخ آبادی'' کی تدوین و ترتیب کے عمدہ نمونے ان کی یادگار ہیں۔مولوی عبدالحق پر ان کی تحقیقی کتاب کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اس کے علاوہ دوسرے کئی اہم کام زیر تکمیل ہیں۔

خلیق انجم

خلیق انجم نے اپنی پوری زندگی تحقیق، تدوین اور ترتیب کے کاموں کے لیے وقف کردی تھی۔اردو میں متنی تنقید کا تعارف کرانے والے وہ پہلے نقاد اور محقق ہیں۔ان کی تحقیقی اور تنقیدی کتاب متنی تنقید مطبوعہ 1967 خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔رفیع سودا پر بھی ان کا تحقیقی کام لائق قدر ہے۔خطوط غالب کی ترتیب ان کی عرق ریزی کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔رشید حسن خاں کے مضامین (ادبی تحقیق مسائل و تجزیہ) گلزار نسیم، باغ و بہار اور فسانہ عجائب کی ترتیب بھی بڑی اہمیت کی کتب ہیں۔تنویر احمد علوی نے اصول تحقیق نامی کتاب پیش کر کے ایک بڑی کمی کو پورا کیا تھا۔خلیق انجم نے شاہ نصیر اور ذوق کے کلیات بھی ترتیب دئے،قصیدے کے سلسلے میں پروفیسر محمود الٰہی، مرثیہ پر مسیح الزماں، مثنوی پر گیان چند جین اور گوپی چند نارنگ کا کام نہایت غور طلب اور لائق توجہ ہے۔

فرمان فتحپوری اور حنیف نقوی نے شعرائے اردو پر بہت ہی جامع کام کئے ہیں۔انھوں نے تقریباً 85 کتابوں کی تصنیف وترتیب کا کام انجام دیا۔خلیق انجم کی تصنیفات میں مرزا محمد رفیع سودا(1965)،متنی تنقید (1967)،حسرت موہانی (1994) ہیں،جبکہ ان کے ذریعہ ترتیب دی گئی کتابوں میں معراج العاشقین (1957)،غالب کی نادر تحریریں (1961)،کربل کتھا کا لسانی مطالعہ (1970)، بہ اشتراک گوپی چند نارنگ،اصناف ادب (1970)،غالب کے خطوط (چار جلدیں)(93-1984)،رسوم دہلی (1985)،مولانا ابوالکلام آزاد (1906)، دلی کی درگاہ شاہ مرداں (1988)، دلی کے آثار قدیمہ (1988)،محی الدین قادری زور (1990)، آثاالصنادید (تین جلدوں میں 1990)، مولوی عبدالحق (1992)، مرقع دہلی (1993)،فرخانی فتح پوری (1992)، آل احمد سرور (1992)،خواجہ احمد فاروقی (1993)،جگن ناتھ آزاد (1993)،مولوی عبدالحق (جلد دوم 1993)،سرسید (1995) وغیرہ اہمیت کی حامل ہیں۔

گوپی چند نارنگ

ان سربرآوردہ اور دانشوروں میں شمار ہوتے ہیں، جو گذشتہ تقریباً نصف صدی سے لگاتار علم وہنر کے نئے افق کی جستجو اور فضل وکمال کی روایت کو پروان چڑھانے میں اس طرح مستغرق اور سرگرم ہیں کہ ان کی پوری زندگی ایک اضطراب آسا اور بے چین روح کے سفر کی داستان بن گئی ہے۔ پانچ درجن سے زیادہ تصانیف وتالیفات،سیکڑوں مضامین،مقالات قومی اور بین الاقوامی سطح پر اردو زبان کے مراکز سے مسلسل ربط وتعلق اردو انجمنوں اور سیمیناروں کانفرنسوں مذاکروں اور مباحثوں میں شرکت اور بھرپور تعاون، ہزاروں تشنگان ادب سے روابط اور مراسلت،شاگردوں کی اصلاح وتربیت کے فرائض سے گھری ہوئی پروفیسر گوپی چند نارنگ کی ذات ایثار وعمل،خلوص ومحبت کی ایسی پرکشش اور روشن مثال ہے،جس کی نظیر لاسکنا نہایت مشکل امر ہے۔ پروفیسر نارنگ کے علمی و ادبی فیضان کا سلسلہ برابر جاری ہے،انہوں نے نظری اور علمی تحقیق وتنقید پر مبنی شاید ہی کوئی مضمون مقالہ یا کتاب ایسی لکھی ہو جس کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی نہ ہوئی ہو،ان کے پیش کردہ بعض افکار ونظریات پر مہینوں نہیں بلکہ برسوں پورے برصغیر کی ادبی دنیا میں بازگشت ہوتی رہی ہے تاہم ان کی جس کتاب نے دنیائے ادب میں ایک بھونچال جیسی کیفیت پیدا کردی وہ ان کی معرکۃ الآراء تصنیف ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات ہے،عہد حاضر میں اردو تنقید وتحقیق کو نئی تھیوری فراہم کرنے کیلئے جس غیر معمولی بصیرت حوصلے اور جرأت کی ضرورت ہوسکتی ہے وہ اس بھاری بھرکم کتاب کے ہر لفظ سے ظاہر ہے۔ پروفیسر نارنگ نے ادبی خدمات کا فرض جس طرح خلوص اور حسن نیت کے ساتھ ادا کیا ہے شاید اس بات کا یہ ادغام ہے وہ ناموری کی بلندیوں پر فائز ہیں ان کی ناقابل فراموش ادبی خدمات کا قومی اور ملکی سطح پر اعتراف صحیح معنوں میں تقسیم ملک کے بعد پہلی مرتبہ اردو زبان وادب کی عظمت کا بھی اعتراف ہے۔ نارنگ صاحب گنگا جمنی تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں یہی نہیں بلکہ وہ ہندو مسلم لسانی ثقافتی وراثت کی ایک زندہ تصویر ہیں ۔ ہر صدی اپنا یکتا صاحب عہد پیدا کرتی ہے اور وہ بلاشبہ صاحب عہد نارنگ صاحب ہیں۔ ان کی عالمانہ شخصیت میں جو ہمہ گیریت ہے وہ اردو ادب میں عدیم المثال ہے۔ان کی جو خصوصیات انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے وہ ان کے ریسرچ (تحقیقاتی) موضوعات ہیں ان کی فکر میں ندرت، ان کے انتخاب میں شائستگی ہے وہ ان سنگلاخ وادیوں میں سفر

کرتے ہیں، جہاں بڑے بڑے اساتذہ اور دانشوران کرام قدم دھرنے سے ہچکچاتے ہیں۔

6.6 آپ نے کیا سیکھا

- شعرائے اردو کے تذکروں کے بعد اردو میں با قاعدہ تحقیق وتدوین کی روایت انیسویں صدی کے اواخر سے عمل میں آئی۔
- اردو میں تدوین کا آغاز خان آرزو کی تصنیف ''نوادرالفاظ'' سے تسلیم کیا جاتا ہے۔
- ڈاکٹر نصیرالدین ہاشمی نے اہم تحقیقی وتدوینی کام انجام دیے اور ''دکن میں اردو'' نامی اہم کتاب تصنیف کی۔
- بیسویں صدی میں تحقیق وتدوین کے کام میں تیزی آئی، جس میں مولوی شمس اللہ قادری، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، عبدالقادر سروری، نصیرالدین ہاشمی اور مولوی عبدالحق کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔
- انیسویں اور بیسویں صدی اردو ادب میں تحقیق وتدوین کے حوالے سے کافی اہمیت رکھتی ہے۔ انیسویں صدی میں اردو ادب میں جن محققین نے تحقیق کی دنیا میں شہرت حاصل کی، ان میں سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی اور علامہ شبلی نعمانی کے کارنامے ادبی تخلیقات کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔
- بیسویں صدی میں متعدد ادیبوں نے تحقیق وتدوین کے مثالی نمونے ادبی دنیا کی خدمت میں پیش کیے۔ جن میں حافظ محمود خاں شیرانی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، مسعود حسین خان، رشید حسن خاں، مسعود حسن رضوی ادیب، مالک رام، پروفیسر نذیر احمد وغیرہ شامل ہیں۔
- تحقیق وتدوین کا با قاعدہ آغاز دکن کے سر جاتا ہے۔ دکن کے محققین میں قادری، شمسی، زور اور سروری دکنی زبان وادب کی تحقیق میں اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے دکن میں تحقیق کی ابتدا کر کے جدید تحقیق کے اصول وضوابط بھی مرتب کیے اور تحقیقی معیار کو بھی بڑی حد تک معتبر بنایا۔
- شمالی ہند کے محققین ومدونین میں مولوی عبدالحق، مسعود حسن رضوی ادیب، خواجہ احمد فاروقی، مالک رام، حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، مسعود حسین خاں، گیان چند جین، حنیف نقوی، ڈاکٹر جمیل جالبی اور رشید حسن خاں ہیں۔

6.7 اپنا امتحان خود لیجیے

سوال 1: اردو میں تحقیق وتدوین کی ابتدا کب ہوئی؟

سوال 2: تحقیق وتدوین کی باقاعدہ ابتدا کب سے ہوئی؟

سوال 3: جنوبی ہند کے دو محققین ومدونین اور ان کی تصنیفات کے نام بتائیے؟

سوال 4: شمالی ہندی کے اہم محقق مولوی عبدالحق اور ان کے تصنیفی کارناموں پر روشنی ڈالئے۔

سوال 5: گوپی چند نارنگ کی تحقیقی خدمات پر نوٹ لکھئے۔

6.8 سوالات کے جوابات

جواب 1: اردو میں تحقیق وتدوین کی ابتدا شاہ حاتم سے تسلیم کی جاتی ہے، جب انھوں نے ''دیوان زادہ'' کے نام سے اپنے دیوان کا انتخاب تیار کر کے شائع کیا۔ اسی طرح خان آرزو کی ''نوادر الفاظ'' سے اردو میں تدوین کا آغاز سمجھا جاتا ہے۔ بعد کے محققین میں مولوی عبدالحق کا نام سرفہرست ہے، جنھوں نے شعرائے اردو کے کئی تذکروں اور شاعروں کے دواوین کو مرتب کر کے تحقیق وتدوین کا بلند معیار قائم کیا۔ پروفیسر محمود شیرانی نے ''پنجاب میں اردو'' جیسی محققانہ کتاب تصنیف کی اور قدرت اللہ قاسم کے تذکرے ''مجموعۂ نغز'' کو مرتب کیا۔ ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی نے اہم تحقیقی وتدوینی کام انجام دیے اور ''دکن میں اردو'' نامی اہم کتاب تصنیف کی۔ البتہ بیسویں صدی تدوین کے اعتبار سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں ابتدا سے انتہا تک تحقیقی نوادر کی کثرت رہی ہے۔ چنانچہ دکن میں بیسویں صدی کے دوسرے دہے میں تحقیق وتدوین کا کام ذوق و شوق سے ہونے لگا تھا، جس میں مولوی شمس اللہ قادری، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، عبدالقادر سروری، نصیر الدین ہاشمی اور مولوی عبدالحق کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

انیسویں صدی میں اردو ادب میں جن محققین نے تحقیق کی دنیا میں شہرت حاصل کی، ان میں سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی اور علامہ شبلی نعمانی کے کارنامے ادبی تخلیقات کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ سرسید محققانہ ذہن کے حامل مصنف تھے۔ انھوں نے آئین اکبری، تزک جہانگیری اور تاریخ فیروز شاہی کی سائنٹفک بنیادوں پر تدوین کی۔ انیسویں صدی کے وسط میں سرسید نے آئین اکبری، تزک جہانگیری اور تاریخ فیروز شاہی کی سائنٹیفک انداز سے ترتیب وتدوین کر کے تدوین کے فن کا ایک مثالی نمونہ پیش کیا۔ جبکہ بیسویں صدی میں متعدد ادیبوں نے تحقیق وتدوین کے مثالی نمونے ادبی دنیا کی خدمت میں پیش کیے۔ حافظ محمود خاں شیرانی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، مسعود حسین خان، رشید حسن خاں، مسعود حسن رضوی ادیب، مالک رام، پروفیسر نذیر احمد وغیرہ، یہ وہ افراد ہیں جنھوں نے تدوین وترتیب کے معیاری اور اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں۔

جواب 2: اردو میں تحقیق وتدوین کی باقاعدہ ابتدا شاہ حاتم کے ''دیوان زادہ'' سے ہوتی ہے۔ اسی طرح خان آرزو کی ''نوادر الفاظ'' سے اردو میں باقاعدہ تدوین کا آغاز سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد امداد امام اثر کی ''کاشف الحقائق'' (1897)، عبدالسلام ندوی کی ''شعر الہند'' (1938) وغیرہ تحقیقی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ یہ تینوں کتابیں شاعری کی تحقیقی وتنقیدی تاریخ تک محدود ہیں۔ نثر میں اولین تحقیقی کتاب احسن مارہروی کی ''تاریخ نثر اردو'' (1930) ہے جس میں نثر نگاروں کے حالات اور نثری نمونے درج ہیں۔ یحییٰ تنہا کی تالیف ''سیر المصنفین'' (1924) بھی اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں سرسید، آزاد، حالی، نذیر اور شبلی وغیرہ کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ حامد حسن قادری کی تالیف ''داستان تاریخ اردو'' (1941) میں اردو ادب کا تحقیقی جائزہ ہے۔ اسی زمانے میں رام بابو سکسینہ کی ''تاریخِ ادبِ اردو'' 1929 بھی اہمیت کی حامل ہے۔ بعد کے زمانوں میں مولوی عبدالحق کی ''اردوئے قدیم'' (1925) اور محی الدین قادری زور کی ''اردو شہ پارے'' (1929) تحقیقی تصانیف ہیں۔ ہاشمی کی ''دکن میں اردو''، عبدالسلام ندوی کی ''شعر الہند''، تحقیقی جہات کے در وا کرتی ہیں۔ نور الحسن ہاشمی

کی ''دلی کا دبستان شاعری'' (1943) اور ابواللیث صدیقی کی ''لکھنؤ کا دبستان شاعری'' (1944) سندی تحقیق کے اولین نمونے ہیں۔اس کے علاوہ عبدالقادر سروری کی ''اردو مثنوی کا ارتقا'' (1936) میں قدیم مثنویوں کی تاریخ ہے۔حالی کی ''یادگارِ غالب'' (1896) شخصی حالات وکوائف کی تحقیقی کتاب ہے۔اس کے بعد شخصیت کی تحقیق کا سلسلہ چل نکلا اور غلام رسول مہر نے 1935 نے غالب کی زندگی پر ایک مستند کتاب 'غالب' تالیف کی۔

تحقیق وتدوین کی باقاعدہ ابتدا انیسویں صدی سے تسلیم کی جاتی ہے۔انیسویں صدی میں اردو ادب میں جن محققین نے تحقیق کی دنیا میں شہرت حاصل کی ، ان میں سر سید احمد خاں ، محمد حسین آزاد ، مولانا الطاف حسین حالی اور علامہ شبلی نعمانی کے کارنامے ادبی تخلیقات کا بیش بہا سرمایہ ہیں ۔ جب کہ بیسویں صدی میں متعدد ادیبوں نے تحقیق وتدوین کے مثالی نمونے ادبی دنیا کی خدمت میں پیش کیے۔حافظ محمود خاں شیرانی ، قاضی عبدالودود ، امتیاز علی خاں عرشی ، مسعود حسین خان ، رشید حسن خاں ، مسعود حسن رضوی ادیب ، مالک رام ، پروفیسر نذیر احمد وغیرہ ، یہ وہ افراد ہیں جنھوں نے تدوین وترتیب کے معیاری اور اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں۔

جواب 3: (1) نصیرالدین ہاشمی۔ان کا اہم تحقیقی کارنامہ ''دکن میں اردو'' (1925) ''مدراس میں اردو'' اور ''یورپ میں دکنی مخطوطات''، ''خواتین دکن کی اردو خدمات'' (1929)، ''سلاطینِ دکن کی ہندوستانی شاعری'' (1932) ''دکنی کے چند تحقیقی مضامین'' (1963) دکنی ہندو اور اردو (1956) اور ''مقالاتِ ہاشمی'' (1979) وغیرہ ہیں۔ اہاشمی نے ہی نظامی گنجوی کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کی دریافت کی۔

(2) محی الدین قادری زور۔ان کی اہم تحقیقی کتابوں میں ''اردو کے آغاز وارتقا''، ''ہندوستانی لسانیات''، ''ہندوستانی صوتیات''، ''اردو شہ پارے'' (1928) عہد عثمانیہ میں اردو کی ترقی (1934) داستان ادب حیدرآباد (1951) اور ''دکنی ادب کی تاریخ'' (1960) تصانیف ہیں جبکہ تدوینی کارناموں میں ''گلزار ابراہیم مع گلشن ہند'' (1934)، ''مکتوبات شاد عظیم آبادی'' (1939)، ''کلیات قلی قطب شاہ'' (1940)، ''ابراہیم نامہ، ارشاد نامہ'' (1940)، قطب شاہی سلطنت کے پیشوا محمد مومن کی سوانح حیات ''سلطان میر محمد مومن'' (1941) اہمیت کی حامل ہیں۔

جواب 4: مولوی عبدالحق کے تحقیقی کارناموں میں ''سب رس'' (1933) اردو زبان میں علمی اصطلاحات (1961)، اردو صرف و نحو (1934)، اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام (1949)، انتخاب کلام میر بمع مقدمہ ، اردو انگریزی لغت (1977) اور باغ وبہار (ترتیب و تدوین) ہیں۔مرتب کردہ کتابوں میں چمنستان شعراء (1928) ، مخزن نکات (1929) ، ریختہ (1933) ، تذکرہ ہندی (1933) ، مخزن شعر (1933) ، عقد ثریا (1934) ، ریاض الفصحا (1934) ، گل عجائب (1934) نکات الشعر (1751) تذکرہ ریختہ گویاں (1752) چمنستان شعرا (1761) گل عجائب (1779) عقدِ ثریا (1784) تذکرۂ ہندی (1785-1794) ریاض الفصحا (1806-1820) مخزن شعرا (1851) وغیرہ اہمیت کی حامل ہیں۔

جواب 5: گوپی چند نارنگ گنگا جمنی تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں یہی نہیں بلکہ وہ ہندو مسلم لسانی ثقافتی وراثت کی ایک زندہ تصویر ہیں ۔ ہر صدی اپنا یکتا صاحب عہد پیدا کرتی ہے اور وہ بلا شبہ صاحب عہد نارنگ صاحب ہیں ۔ان کی عالمانہ شخصیت میں جو ہمہ گیریت ہے وہ اردو ادب میں عدیم المثال ہے ۔ وہ گذشتہ تقریباً نصف صدی سے لگا تار علم و ہنر کے نئے افق کی جستجو اور فضل وکمال کی روایت کو پروان چڑھانے میں اس طرح مستغرق اور سرگرم ہیں کہ ان کی پوری زندگی ایک اضطراب آسا اور بے چین روح کے سفر کی داستان بن گئی ہے ۔ پانچ درجن سے زیادہ تصانیف وتالیفات ،سیکڑوں مضامین ، مقالات قومی اور بین الاقوامی سطح پر اردو زبان کے مراکز سے مسلسل ربط وتعلق اردو انجمنوں اور سیمیناروں کانفرنسوں مذاکروں اور مباحثوں میں شرکت اور بھر پور تعاون ، ہزاروں تشنگان ادب سے روابط اور مراسلت ،شاگردوں کی اصلاح وتربیت کے فرائض سے گھری ہوئی پروفیسر گوپی چند نارنگ کی ذات ایثار وعمل ،خلوص ومحبت کی ایسی پرکشش اور روشن مثال ہے ، جس کی نظیر لاسکنا نہایت مشکل امر ہے ۔

پروفیسر نارنگ کے علمی وادبی فیضان کا سلسلہ برابر جاری ہے ، انہوں نے نظری اور علمی تحقیق وتنقید پر مبنی شاید ہی کوئی مضمون مقالہ یا کتاب ایسی لکھی ہو جس کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی نہ ہوئی ہو ، ان کے پیش کردہ بعض افکار ونظریات پر مہینوں نہیں بلکہ برسوں پورے برصغیر کی ادبی دنیا میں بازگشت ہوتی رہی ہے تاہم ان کی جس کتاب نے دنیائے ادب میں ایک بھونچال جیسی کیفیت پیدا کردی وہ ان کی معرکۃ الآراء تصنیف ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات ہے ، عہد حاضر میں اردو تنقید وتحقیق کو نئی تھیوری فراہم کرنے کیلئے جس غیر معمولی بصیرت حوصلے اور جرأت کی ضرورت ہوسکتی ہے وہ اس بھاری بھرکم کتاب کے ہر لفظ سے ظاہر ہے ۔ پروفیسر نارنگ نے ادبی خدمات کا فرض جس طرح خلوص اور حسن نیت کے ساتھ ادا کیا ہے شاید اس بات کا یہ ادغام ہے وہ ناموری کی بلندیوں پر فائز ہیں ان کی ناقابل فراموش ادبی خدمات کا قومی اور ملکی سطح پر اعتراف صحیح معنوں میں تقسیم ملک کے بعد پہلی مرتبہ اردو زبان وادب کی عظمت کا بھی اعتراف ہے ۔

6.9 فرہنگ

الفاظ	معانی
نوادر	نادر کی جمع ، عجیب وغریب چیزیں ، عجائبات ، معجزات نیز قیمتی اشیاء
صوتیات	آوازوں سے متعلق ، لحن ، لہجہ ، صدا ، آہنگ کے متعلقات
لسانیات	زبان کے الفاظ ، لغت ، صرف ونحو کا علم ، الفاظ کے مادہ جات اور زبان کی تاریخ وتشکیل کا علم
کدوکاوش	چھان بین ، تلاش ، کوشش ، جستجو
معمار اول	اولین کاریگر ، کسی چیز کی بنیاد رکھنے والا
رموز اوقاف	عبارت یا تحریر میں الفاظ اور فقروں کے درمیان وقفے ، کم یا زیادہ دیر تک ٹھہرنے کے نشانات
اعراب سازی	زبر ، زیر اور پیش ، جزم ، تشدید اور ماترائیں لگانے کا عمل

افق	آسمان کا کنارہ جو زمین سے ملا ہوا دکھائی دیتا ہے
مراسلت	ایک دوسرے کو خط بھیجنا
معرکتہ الآراء	جنگ جو، زور آور، زوردار

6.10 کتب برائے مطالعہ

1.	تحقیق وتدوین	ابن کنول (مرتبہ)	کتابی دنیا، نئی دہلی	2006
2.	لسانی وادبی تحقیق وتدوین	عطش درّانی	نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد	2016
3.	اردو میں تدوین متن، فن اور روایت	عقیل احمد	ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	2020
4.	اصول تحقیق وترتیب متن	تنویر احمد علوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی	1994
5.	تاریخ ادب اردو (جلد اول)	جمیل جالبی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، نئی دہلی	1993
6.	ادبی تحقیق: مسائل ومباحث	حنیف نقوی	اسکرین پلے، وارانسی	2010

اکائی 7: تدوینِ متن: اصول و مسائل

7.1 اغراض ومقاصد

7.2 تمہید

7.3 تدوین کی تعریف

7.4 متن کی تعریف

7.5 تدوین کے مقاصد

7.6 مخطوطہ کی تعریف

7.7 اصطلاحاتِ تدوین

7.8 تدوین کے مسائل

7.9 تدوین کے اصول

7.10 آپ نے کیا سیکھا

7.11 اپنا امتحان خود لیجیے

7.12 سوالات کے جوابات

7.13 فرہنگ

7.14 کتب برائے مطالعہ

7.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- تدوین کی لغوی اور اصطلاحی تعریف پڑھیں گے۔
- متن کسے کہتے ہیں، جان سکیں گے۔
- تدوین کے مقاصد سے آشنا ہو جائیں گے۔
- تدوین کے مسائل سے آگاہی حاصل کریں گے۔
- تدوین کے اصول کا مطالعہ کریں گے۔
- تدوین کی اصطلاحوں سے واقف ہو جائیں گے۔

7.2 تمہید

تدوین بھی تحقیق کا ایک شعبہ ہے، اس میں محقق کسی مصنف کی کتاب کو اس کی منشا کے مطابق ترتیب دیتا ہے۔ کسی کتاب کے

قدیم ایڈیشن کو حواشی کے ساتھ ایک نئی شکل دے کر پیش کرتا ہے یا کسی اہم مخطوطہ کو ترتیب دے کر عوام کی نذر کرتا ہے۔تدوین متن یا ترتیب متن بھی تحقیق کام کی ایک شاخ ہے۔تحقیق کے ساتھ ساتھ تدوین بھی ایک علمی اور تحقیقی فن ہے، جس میں مدون اپنی پوری توجہ، محنت اور لگن کے ساتھ کتاب کو پوری صحت اور منشائے مصنف کے مطابق ترتیب دیتا ہے۔اصول تدوین کے سلسلہ میں اولاً یہ بات جاننا ضروری ہے کہ ادب کی مختلف اقسام کی تدوین کے اصول و مسائل جداگانہ ہیں، اس لیے دورانِ تدوین ہر صنف کے سلسلہ میں اس کے اصول وقواعد سے آشنا ہونا لازم ہے۔تدوین متن ایک دشوار گزار مرحلہ ہے، اس لیے تحقیق کے مقابلے تدوین میں زیادہ مہارتوں کی ضرورت اور محنت ومشقت کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔اس سلسلے میں مدون کو الفاظ ومحاورات پر پوری قدرت ہونے کے ساتھ اسے مختلف قسم کی تحریروں سے بھی واقفیت ہونی چاہیے۔ایک اچھے مدون کے لیے ضروری ہے کہ رسم الخط سے بھی واقفیت رکھتا ہو۔چونکہ فارسی یا اردو کے رسم الخط عربی رسم الخط سے ماخوذ ہیں لہٰذا اس کے نقطے، شوشے، بناوٹ، ہندسے وہی ہوتے ہیں جو عربی کے ہیں، یہی وجہ ہے کہ فارسی اور اردو میں تدوین متن کے درمیان دقتیں پیش آتی ہیں۔تدوین کے دوران تحقیق کی بھی ضرورت پیش آتی ہے اس لیے مدون کو تحقیق کے اصول وضوابط اور طریقۂ کار سے واقفیت لازمی ہے۔اسے کئی زبانوں پر عبور ہونا چاہیے کیونکہ قدیم مخطوطوں میں عربی اور فارسی کی اصطلاحیں، جملے، تواریخ اور ہندسے ہوتے تھے، ان کا سمجھنا صرف ماہر مدون کا ہی کام ہے۔

7.3 تدوین کی تعریف

لفظ تدوین عربی سے ماخوذ ہے۔یہ دَوَنَ سے باب تفعیل کا مصدر ہے۔اس کے معنی جمع کرنے، اندراج کرنے، لکھنے اور ترتیب دینے کے ہیں۔مصباح اللغات میں اس کے معنی اس طرح درج ہیں: ’’دَوَّن الدیوان: ترتیب دینا، رجسٹر میں نام لکھنا۔ جبکہ نوراللغات میں تدوین کے معنی اس طرح درج ہیں: ’’تدوین (مونث) جمع کرنا، مرتب کرنا۔‘‘ تدوین کی تعریف کرتے ہوئے محمد انصاراللہ لکھتے ہیں:

> ’’Editing جس کے لیے ترتیب کے بجائے تدوین کی اصطلاح مناسب تر ہے، ایک بسیط فن ہے اور لطف یہ ہے کہ اس میں گنجائش بھی موجود ہے کہ ’بقدر شوق‘ اس کی وسعتوں میں اضافے بھی ہوسکیں، اس لیے اس فن کی حدوں کا تعین کرتے ہوئے احتیاط کی ضرورت ہے۔تدوین خالصتاً ایک عملی فن ہے اور اس کے برتنے، دیکھنے یا سمجھنے کے لیے بھی اسی نگاہ اور ذہن کی ضرورت ہے۔‘‘ (انصاراللہ، تدوین اور عمل تدوین، سب رس، فروری، 1987، ص:6)

اصطلاح میں کسی شعری یا نثری متون کو اس کے اصول وآداب کے ساتھ یا منشائے مصنف کے مطابق ترتیب دینا تدوین کہلاتا ہے۔کسی ادبی، لسانی یا تاریخی اہمیت کے حامل متن کو منشائے مصنف کے مطابق تحقیق، تصحیح، تحشیہ، تخریج اور مقدمے کے ساتھ پیش کرنے کو تدوین کہا جاتا ہے۔کسی ایسے متن کو جو تاریخی، ادبی اور لسانی اہمیت رکھتا ہو، مصنف کی منشا کے مطابق پیش کرنے کے عمل کو

تدوین کہتے ہیں۔یعنی اصل متن کی بازیافت کا عمل تدوین کہلاتا ہے۔'تدوین' کے مشتقات میں دیوان (واحد) دواوین (جمع) بھی ہے، جس سے دفتر، ناموں کا رجسٹر، اشعار کا رجسٹر وغیرہ مراد ہے۔ڈاکٹر نسیم احمد تدوین کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''صحیح متن کی بازیافت اور اسے منشائے مصنف کے مطابق پیش کرنے کا عمل تدوین کہلاتا ہے۔ یہ ایک مشکل فن اور نہایت صبر آزما کام ہے۔اس میں مہارت حاصل کرنے کے لیے انتھک ریاض، کڑی محنت، عمیق نظر، پختہ ذہن، منصفانہ کردار، مستقل مزاجی درکار ہے۔سہل نگاری اور عجلت پسندی اس کے لیے سم قاتل ہیں۔زیب داستاں کے لیے کچھ بڑھا دینے کی اس میں قطعی گنجائش نہیں، نہ تلون مزاجی، سطحی ذوق اور ذاتی پسند و ناپسند کے لیے اس میں کوئی جگہ ہے۔ یہ کام بڑی دیانتداری اور استقامت طبع کے ساتھ انجام دیا جانا چاہیے۔''(اصول تدوین از ڈاکٹر نسیم احمد فاروقی، مضمون مشمولہ تحقیق و تدین، مرتبہ: پروفیسر ابن کنول، کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی 2006، ص159)

انگریزی میں تدوین کا متبادل Edit ہے۔تدوین کا ہم پلہ لفظ ترتیب بھی ہے۔ان دونوں الفاظ کے مابین زیادہ فرق نہیں ہے بلکہ تدوین کا تعلق کتابوں سے ہے اور ترتیب ایک عام لفظ ہے، اس لیے اس اصطلاح کو ترجیح حاصل ہوگئی۔لفظ تدوین' تحقیق سے بھی الگ نہیں ہے بلکہ تحقیق تدوین ہی کی ایک شاخ ہے۔یہی وجہ ہے کہ تدوین کے لیے بھی انہی صلاحیتوں اور ذہنی رجحانات کی ضرورت ہوتی ہے جو تحقیق کے لیے درکار ہیں۔اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہر اعلیٰ پایہ کے محقق نے تدوین متن کے فرائض بھی انجام دئے ہیں مثلاً محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، مسعود حسن رضوی ادیب، مولانا امتیاز علی عرشی، غلام رسول مہر، مالک رام، مسعود حسین خاں، ڈاکٹر نذیر احمد، نورالحسن ہاشمی، مختارالدین احمد، محمود الٰہی، اکبر حیدری، جمیل جالبی، مشفق خواجہ، گیان چند جین اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی وغیرہ۔مذکورہ سبھی حضرات نے تحقیق کے ساتھ ساتھ نے تدوین متن کا کام بھی انجام دیا ہے۔جو اس بات کا ثبوت ہے کہ تدوین تحقیق ہی کا ایک شعبہ ہے۔البتہ تحقیق کے مقابلے میں تدوین کو ترجیح دی جاتی ہے۔بقول رشید حسن خاں:

> ''تدوین دراصل تحقیق سے آگے کی منزل ہے۔ جو شخص شرائط تحقیق کو پورا کرتا ہو اور ساتھ ہی اصول تدوین سے پوری طرح واقف ہو اور اس کا تجربہ بھی رکھتا ہو، یا اس کو ایسی تربیت ملی ہو جو تجربے کا بدل ہو سکے تو ایسا شخص تدوین کا کام انجام دے سکتا ہے۔''(ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ: رشید حسن خاں، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1978 ص61)

7.4 متن کی تعریف

'متن' بھی عربی کا لفظ ہے۔اس کے لغوی معنوں میں پشت پیٹھ، مضبوط استوار، مستحکم، سخت اور اونچی زمین اور کتاب کی اصل عبارت جس کی شرح کی جائے یا وہ عبارت جو کتاب کے بیچ میں ہو وغیرہ۔نوراللغات میں ''متن'' کا مفہوم اس طرح لکھا گیا ہے:

''متن (ع بالفتح صحیح وفتح اول و دوم غلط بمعنی پشت و استوار) مذکر۔کتاب کی اصل عبارت جس کی شرح کی جائے۔(2) درمیان وسط درمیانی حصہ(3) رضائی۔ لحاف وغیرہ کا وہ حصہ جو حاشیہ کے بیچ میں ہوتا ہے۔(منیر) گذشتہ عیش کی مجموعۂ عالم میں نقلیں ہیں: -پرانی شال کا شاید کہ ہے متن اس رسالہ میں۔'' (نوراللغات ،مولوی نورالحسن نیر۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی،1998 ص:484)

تقریباً یہی معانی فرہنگ آصفیہ میں بھی درج ہیں:

''متن (ع) اسم مذکر (پشت) پیٹھ(2) مضبوط استوار۔مستحکم (3) سخت اوراونچی زمین (4 مجازاً) کتاب کی اصل عبارت جس کی شرح کی جائے۔وہ عبارت جو کتاب کے بیچ میں ہو(5) بیچ۔درمیانی۔وسط۔درمیانی حصہ ہو دہ جیسے دوشالے کا متن۔کتاب کا متن (یہ فتح تائے مثنات) پڑھنا غلط ہے۔'' (فرہنگ آصفیہ،خاں صاحب مولوی سید احمد دہلوی۔ترقی اردو بیورونئی دہلی،1990ء ص:2037)

انگریزی میں متن کے لیے "Text'' کی اصطلاح مستعمل ہے۔ویبسٹر دکشنری میں متن کے درج ذیل معنی درج ہیں:

1. A discourse or composition on which a note or commentary is written,the original words of an author.in distinction from a paraphrase or commentary.
2. A verse or passage of scriptures quoted as the subject of a discourse,or in proof of a doctrine.

یعنی متن؛اول تو یہ کہ کسی لکھارکی اصل تحریر،تبصرہ،رقعہ یا بیان / ڈسکورس جو دیگر اقتباسات یا تبصروں سے ممتاز ہو۔دوسری بات، یہ کہ کسی شعر یا اقتباس کو بھی متن کہیں گے جو اس کے اصل خالق کا ثبوت دے۔''

(Webster Noah,Webster's dictionary,1886,London;Geore bell & Sons,p.1370)

ڈاکٹر تنویر احمد علوی اپنی کتاب ''اصول تحقیق وترتیب متن'' میں متن کی تعریف میں رقم طراز ہیں:

''متن Text کسی ایسی عبارت ''تحریر یا نقوش تحریر کو کہتے ہیں جن کی قرأت یا معنوی تفہیم ممکن ہو۔'' (اصول تحقیق وترتیب متن، ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ،دہلی،2013 ص:23)

متن کی تعریف کرتے ہوئے پروفیسر ایم کا ترے لکھتا ہے:

"By a text we undestand a document written in ai language know more or less to the inquirer and assumed to have a meaning which has been or can be ascertained."

(Introduction to Indian textual critisicm by S.M. Karte)

(ترجمہ:-متن سے ہماری مراد ایسے دستاویز سے ہے جو ایک ایسی زبان میں لکھا گیا ہو جس سے محقق کم وبیش واقف ہوتا ہے اور یہ متن ایسے معنی کا متحمل تصور کیا جاتا ہے جسے جانچ اور پرکھ لیا گیا ہو یا جسے جانچا پرکھا جا سکے)

'متن' وہ عبارت کہلاتی ہے جس کا کوئی مطلب نکلتا ہو اور اس کے معنی سے ذہن مطمئن ہو جائے۔ عبارتِ متن کاغذ کے اوراق پر بھی ہوسکتی ہے اور کسی دیوار، مٹی کے ٹھیکروں، چٹانوں، درخت کی چھالوں اور چمڑے کے ٹکڑوں پر بھی ہوسکتی ہے، یعنی بامعنی جملے اگر تحریری شکل میں کسی بھی حالت میں ہوں وہ متن کہلائیں گے۔ متن کی عبارت کے لیے ضروری نہیں کہ وہ کتنی مقدار میں ہے، مختصر عبارت بھی متن کہلاتی ہے اور طویل عبارت بھی۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

(1) متن کا تحریری شکل میں ہونا ضروری ہے۔

(2) متن' دیواروں، مٹی کے ٹھیکروں، چٹانوں، چمڑے کے ٹکڑوں، درخت کی چھالوں اور لکڑی یا پتھر کی تختیوں پر کندہ اور تحریری حالت میں ہوسکتی ہے۔

(3) متن کا بامعنی ہونا اس کی اولین شرط ہے۔

(4) نامکمل اور مہمل عبارت اور تحریریں متن کے دائرے سے خارج ہیں۔

(5) متن کی عبارت قدیم بھی ہوسکتی ہے اور عصر حاضر کے کسی مصنف کی بھی۔

(6) متن نظم اور نثر دونوں صورتوں میں ہوسکتی ہے۔

(7) متن کے لیے کوئی زبان مخصوص نہیں، وہ کسی بھی زبان میں ہوسکتی ہے۔

(8) وہ شے متن قرار دی جائے گی جو تحریری شکل میں موجود ہو۔

(9) متن ایسی تحریر کو کہیں گے جو کسی کاغذ، دھات کے ٹکڑوں، مٹی یا لکڑی کی بنی ہوئی تختیوں، پتوں، پتھروں یا چمڑوں اور چٹانوں پر چھپی ہوئی صورت میں موجود ہو۔

(10) متن کے لیے ضروری نہیں کہ وہ نثر ہی ہو یا نظم بلکہ وہ کسی بھی صورت میں ہوسکتا ہے۔

(11) متن کے لیے زمانے کی بھی کوئی قید نہیں، وہ قدیم بھی ہوسکتا ہے اور جدید بھی۔

(12) متن کے لیے قلت یا کثرت بھی معنی نہیں رکھتا، وہ کم یا زیادہ بھی ہوسکتا ہے۔

مندرجہ قول سے ثابت ہوتا ہے کہ متن کا تحریری شکل میں ہونا ضروری ہے اور ساتھ ہی اس کا بامعنی ہونا بھی، بے معنی اور مہمل تحریریں متن کہلانے کی مستحق نہیں ہیں۔ ناقدین نے متن کی کئی اقسام بتائی ہیں، جن میں املائی متن، تقریری متن، سمعی متن، خطی متن اور مطبوعہ متن وغیرہ شامل ہیں۔ املائی متن میں ایک شخص بولتا ہے اور دوسرا شخص تحریر کرتا جاتا ہے۔ بہت سے متون تقریری شکل میں ہوتے ہیں بعد میں کسی مدون کے ذریعہ تحریری شکل میں لایا جاتا ہے۔ خطی متن وہ کہلاتا ہے جو تحریری شکل میں ہو خواہ وہ مصنف کے ذریعہ تحریر کیا گیا ہو یا کسی کاتب نے لکھا ہو، جبکہ مطبوعہ متن وہ متن کہلاتا ہے جسے مصنف نے اپنی زندگی میں خود ترتیب دے کر شائع کیا ہو یا مصنف کے اشارے پر کسی دوسرے شخص نے ترتیب دیا ہو۔

متذکرہ بالا تعریفات، نکات اور معروضات کو پڑھ کر اندازہ ہو گیا ہوگا کہ متن ایسی عبارت یا تحریر کا نام ہے، جو کسی چیز پر چھپی ہوئی ہو، کسی بھی زبان میں ہو، نظم ہو یا نثر، قدیم ہو یا جدید، کم وہ یا زیادہ البتہ وہ معانی سے خالی نہ ہو۔ گویا ہر طرح کی زیر غور تحریر یا تقریر، شاعری، نثری کلام، تاریخ، مکتوبات، خطوط، فیصلے، فتوے، خطبات، تذکرے، بیاض، لغت، قاموس، صوتیات وغیرہ متن کہلائیں گے۔

7.5 تدوین کے مقاصد

تدوین یا ترتیب متن کا مقصد محض اس کے سوا کچھ نہیں کہ دستیاب شدہ متن کو اس کے اصولوں اور ضوابط کے مطابق نیز منشائے مصنف کے مطابق اس طرح ترتیب یا جائے کہ اس وہ مصنف کی روحِ متن کا ترجمان بن جائے اور اس کی عبارت میں کوئی نقص یا کجی کا امکان باقی نہ رہے۔ تدوین کا عمل بھی تحقیق کا ہی ایک حصہ ہے، پھر بھی دونوں کے طریق کار میں فرق ہے اور دونوں کے دائرۂ کار علیحدہ علیحدہ ہیں۔ ضروری نہیں کہ ایک اچھا محقق ایک ماہر مدون بھی ثابت ہو۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص تحقیق کے میدان میں مہارت رکھتا ہو لیکن تدوین میں اس کے تجربات اور مشاہدات اس قدر پختہ نہ ہوں کہ وہ تدوین کے حقوق بھی ادا کرسکے۔ درج ذیل اقتباس سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

> ''اگر ایک شخص صحیح طریقے سے حقائق کی کھوج لگانے، مناسب انداز سے واقعات کی ترتیب دینے اور خالص منطقی ڈھنگ سے نتائج نکالنے کی صلاحیت رکھتا ہے، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ متن کو بھی پورے آداب کے ساتھ مرتب کرسکتا ہے۔ اس کی تحقیقی صلاحیت پر حرف بھی نہیں آتا۔ تحقیقی کام کرنے والے کے لیے یہ لازم نہیں کہ وہ ترتیبِ متن پر بھی اسی طرح دسترس رکھتا ہو البتہ تدوین کا کام کرنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کو آدابِ تحقیق سے بھی اسی قدر واقفیت ہو اور لگاؤ بھی ہو۔ اس کے بغیر تدوین کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا جاسکتا۔'' (رشید حسن خاں، تحقیق: مسائل

اور تجزیہ 1978،ص:89-88)

یعنی تدوین میں کسی قدیم متن یا مخطوطے کے مختلف نسخوں کو یکجا کرنے کے بعد تلاش وتحقیق کے ذریعہ اس کی اصل شکل تک رسائی حاصل کی جاتی ہے۔اس متن کو جدید املا کے اصولوں کے تحت اعراب، رموزِ اوقاف، حواشی، ضمیمہ، فرہنگ، اشاریہ، مقدمے، مشکل الفاظ کی وضاحت، محاورات اور مقامی بولیوں کی تشریح وتعبیر کر کے متن کو قاری کے لیے آسان بنایا جاتا ہے۔تدوین کے مقاصد میں درج ذیل نکات شامل ہیں:

- متن کو منشائے مصنف کے مطابق ترتیب دینا۔
- ترتیب کے دوران صحت عبارت کا خیال رکھنا۔
- متن کو معیاری املا کے مطابق ترتیب دینا۔
- متن کے انتساب سے متعلق تحقیق کرنا
- متن کو الحاقیات سے پاک کرنا
- متن میں شامل مجمل یا ناقص حوالوں کی وضاحت کرنا
- متن سے متعلق تحقیقی حقائق پیش کرنا
- متن میں وارد غیر معروف اشخاص، کتب اور مقامات کے بارے میں حواشی لکھنا
- غیر معروف اور مشکل الفاظ اور اصطلاحات کی فرہنگ تیار کرنا
- متن میں وارد اقتباسات، اقوال، اشعار اور آیاتِ قرآنی واحادیث کی تخریج کرنا۔
- کسی قدیم متن کی صحیح قرأت ممکن بنانا۔
- مصنف کے اغلاط وسہو کی نشاندہی کرنا
- قدیم یا دکنی متون کے لسانی امتیازات، رسم الخط نیز تلفظ کی وضاحت کرنا۔

چونکہ تدوینِ متن میں قلمی نسخوں اور قدیم مخطوطوں کو ان کے خاص اصول وضوابط کے تحت ترتیب دیا جاتا ہے، اس لیے ذیل میں مخطوطہ کی بابت بعض معروضات عرض کیے جاتے ہیں۔

7.6 مخطوطہ کی تعریف

لغوی اعتبار سے مخطوطہ عربی زبان کا لفظ ہے، جو خط یخط سے ماخوذ ہے۔ خط کے معنی لکھنے کے ہیں اور مخطوطہ کے معنی ’لکھے ہوئے‘ کے ہیں۔اس کی جمع مخطوطات ہے۔انگریزی میں اس کا متبادل Manuscript اور ہندی میں ’پانڈولپی‘ ہے۔اصطلاحی معنوں میں مخطوطہ اس کتاب کو کہتے ہیں جو ہاتھ سے لکھی ہوئی ہو۔

قلمی نسخوں کو عام طور پر درج ذیل تین زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(1) مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ یا اس کا دستخط کردہ یا اصلاح کردہ۔

(2) اس کی زندگی کے بعد کے نسخے جو اس کے نسخوں سے نقل کیے گئے ہوں۔

(3) مذکورہ دونوں قسم کے نسخوں کے نقلوں کی نقلیں۔

اول الذکر دونوں مخطوطوں میں مدون متن تدوین کے اصولوں اور منشائے مصنف کے تحت ترتیب کا عمل بروئے کار لاتا ہے لیکن تیسرے قسم کے نسخے زیادہ تر پریشانیوں کا سبب بنتے ہیں۔ کیونکہ ایسی صورت میں منشائے مصنف تک رسائی بہت دشوار گزار ہوتی ہے۔ چونکہ یہ نقل کی نقل ہوتی ہے اس لیے اس میں اغلاط کا امکان زیادہ ہوتا ہے اور مدون کو ان اغلاط کی درستگی کرنی ہوتی ہے، برخلاف پہلے اور دوسرے قسم کے مخطوطوں کے، کیونکہ وہ مصنف کے عہد سے زیادہ قریب ہوتے ہیں اور ان کا تعلق براہ راست مصنف کے نسخہ یا اس کے نقل سے ہوتا ہے۔ پہلے دونوں قسم کے مخطوطے چونکہ مصنف کے ہاتھ کے لکھے ہوتے ہیں، یا ان کے دستخط کردہ ہوتے ہیں، اس لیے ان کو ہی بنیاد بنا کر ترتیب دیا جاتا ہے، اور وہی قابلِ وثوق مخطوطے گردانے جاتے ہیں۔

7.7 اصطلاحاتِ تدوین

دورانِ تدوین درج ذیل بعض اصطلاحات سے واقفیت ضروری ہے:

ترمیم:- نامعلوم وجوہات کی بنا پر ہونے والی تبدیلیاں جن میں نظروں کا دھوکہ اور قلم کی لغزش یا کاتب کی شعوری اور غیر شعوری کوششوں کا بھی دخل ہوسکتا ہے۔ ایسے الفاظ کو مدون اپنی لیاقت کے مطابق ترمیم کرسکتا ہے۔

تعبیر:- اگر مصنف نے اپنی تحریر میں کوئی ایسی عبارت لکھی ہے جو مبہم اور غیر واضح ہے جس سے تحریر کے معانی و مفاہیم تک ذہن نہیں پہنچ پاتے تو ایسی صورت میں خود مصنف یا کاتب اس مبہم لفظ کی وضاحت کے لیے بعض عبارتوں کا اضافہ کردیتے ہیں، اسے تعبیر کہا جاتا ہے۔

تنسیخ:- وہ عبارت کہلاتی ہے جس عبارت کو مصنف شعوری طور پر منسوخ کردیتا ہے۔

تصحیح:- اگر مصنف نے اپنی تحریر میں کسی لفظ کی تصحیح کی ہے، اسے تدوین کی اصطلاح میں تصحیح کہتے ہیں۔

تصحیف:- اگر مصنف کے علاوہ کسی دیگر شخص نے متن میں شعوری طور پر کوئی تبدیلی یا ترمیم کی ہے تو اسے تصحیف کہا جاتا ہے۔

تکملہ:- یہ متن سے متعلق وہ حصہ ہوتا ہے جو متن میں شامل نہ کر کے اسے متن کے بعد یعنی کتاب کے آخر میں شامل کردیا جاتا ہے۔

خاتمہ:- کتاب کے آخر کی وہ اختتامی عبارت جو مصنف یا کاتب کے ذریعہ لکھی ہوئی ہوتی ہے۔ بعض قدیم مطبوعہ کتب و رسائل میں خاتمے کے عنوان سے مرتبین و ناشرین کی عبارتیں بھی ملتی ہیں، جو نسخے سے متعلق بعض امور کی وضاحت کرتے ہیں۔

ترقیمہ:- کاتب کی طرف لکھی جانے والی وہ عبارت جو کتاب کی تکمیل کے بعد آخر میں لکھی جاتی ہے۔ اس میں کاتب اپنا نام اور کتابت مکمل ہونے کی تاریخ درج کرتا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ یہ نسخہ کب اور کہاں تیار ہوا، اس کا کاتب کون تھا، وہ کون سے محرکات تھے جن کے سبب اس نے یہ کام انجام دیا۔

تعلیقات:- کتاب کی تکمیل کے بعد وہ باتیں جو متن سے متعلق ہیں اور بعد میں مصنف کے ذہن میں آئی ہیں، انہیں ضمیمہ کے طور پر کتاب کے آخر میں درج کر دیا جاتا ہے۔

تخریج:- دوران تدوین ایسی عبارت کی نشاندہی کرنا جس کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ عبارت مصنف کی نہیں بلکہ کسی دوسرے شخص کی ہے اور کسی صورت متن میں شامل ہو گئی ہے۔ ایسی عبارت کو مدون دورانِ تدوین خارج کر سکتا ہے۔

7.8 تدوین کے مسائل

تدوین متن کے دوران پیش آنے والی دشواریاں درج ذیل ہیں:

(1) ایک سے زیادہ نقطے والے حروف کے پے در پے آنے سے تحقیق میں دشواریاں در آتی ہیں۔

(2) نقطے والے حروف کو ملا کر لکھنے سے ان نقطوں کے آگے پیچھے ہو جانے سے الفاظ کے تعین کی دشواریاں۔

(3) اگر حروف ایک دوسرے سے جدا ہوں تو نقطوں سے زیادہ پیچیدگی پیدا نہیں ہوتی، لیکن جب حروف کی نشاندہی صرف شوشے اور ان پر لگنے والے نقطوں سے ہو رہی ہو اور نقطوں کا خاصا اہتمام نہ ہو تو ایسی صورت میں الفاظ کے تعین میں دشواری آتی ہے۔

(4) قدیم تحریروں میں مستعمل ہونے والے خط' خط شکستہ میں نہ تو نقطوں کا التزام کیا جاتا تھا اور نہ ہی شوشوں اور مفرد حرفوں کی شکلیں اپنی اصل پر باقی رہتی ہیں، اس طرح مدون کو دشواری کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ سارا معاملہ مدون کی قیاس آرائی اور صلاحیت پر منحصر ہوتا ہے۔

(5) بعض اوقات حروف کو اختصار کے ساتھ لکھنے اور شوشوں اور مشدد الفاظ کے املا کو جگہ کی قلت کے سبب ان کے ہجاؤں کے تعین میں دشواریاں آتی ہیں۔

(6) بعض اوقات وہ حروف جو ایک دوسرے سے ملا کر نہیں لکھے جاتے، ان کی وجہ سے بھی متن کی صحت میں مشکلات آتی ہیں۔

(7) کبھی کبھی صاف و سلیس کتابت کی عدم موجدگی کے سبب متن کتاب کی قرات میں دشواری آتی ہے۔

(8) مصنف اور کاتب کی غیر ارادی طور پر ہونے والی غلطیاں بھی مدون کے لیے دشواری کا سبب بنتی ہیں۔

مذکورہ بالا دشواریوں کے پیش آنے کے سبب مدون کو بہت محنت اور عرق ریزی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس حیثیت سے یہ فن آسان نہیں ہے۔ تدوین متن کے وقت املا اور تلفظ پر زیادہ زور صرف کرنا پڑتا ہے، لہٰذا جس عہد کا مخطوطہ ہو، اس عہد کے املا اور تلفظ سے اس کی آشنائی ضروری ہے۔ تدوین ایک عملی فن ہے اور اس میں اس کو بیک وقت محقق، شارح، ناقد اور مصحح متن بننا پڑتا ہے۔ مدون کے پیش نظر سب سے پہلا مسئلہ متن کی فراہمی کا ہوتا ہے، پھر اس کی تحقیق، اس کے بعد اس کی تصحیح، ترتیب اور بعد میں تنقید و توضیح کا مرحلہ پیش ہوتا ہے۔ مدون کی خصوصیات کے ضمن میں رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''تدوین کے لیے مدون کے مزاج کا تحقیق آشنا ہونا ضروری ہے۔ اس کے بعد یہ ضروری

ہے کہ تدوین کی شرائط سے اور اس کے اصولوں سے آدمی کماحقہ واقف ہو اور عملی مسائل سے بھی کم آشنا نہ ہو۔ یعنی اسے یہ معلوم ہو کہ تدوین کا طریقہ کیا ہے، صحتِ متن کا مفہوم کیا ہے، اختلافِ نسخ کا مطلب کیا ہے، اور ایسے ہی دوسرے متعلقات۔ وہ زبان، قواعدِ شاعری وغیرہ سے بھی بہ خوبی واقف ہو۔ فارسی اچھی طرح جانتا ہو۔ جس عہد کی تصنیف کو مرتب کرنا چاہتا ہے، اس عہد کی زبان کا خاص طور پر اس نے مطالعہ کیا ہو۔ اس کے علاوہ اس عہد کے اہم مصنفین کے کلام کا مفصل مطالعہ کیا ہو اور اس طرح کہ اس عہد کے مصنفین کے یہاں زبان و بیان کی جو خصوصیات پائی جاتی ہیں وہ سب سامنے آجائیں۔ خاص طور پر یہ کہ لفظوں کے استعمال، جملوں کی ترکیب، تذکیر و تانیث اور متروکات کے لحاظ سے اس خاص مصنف اور پھر اس کے ہم عصروں کے یہاں خاص خاص الفاظ کے متعلق کیا خاص باتیں ملتی ہیں، کیا طرزِ عمل تھا ان لوگوں کا املا کے مسائل سے اچھی طرح باخبر ہو۔''

(رشید حسن خاں 1978، ص: 94)

مذکورہ بالا بیان سے چند معروضات سامنے آتے ہیں جس کی تفصیل کے طور کہا جا سکتا ہے کہ مدون کے لیے لازمی ہے کہ وہ جس عہد کے مخطوطہ کی تدوین کر رہا ہے اس عہد کے دیگر مخطوطوں کو پڑھنے کی اس میں صلاحیت موجود ہو۔ مدن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس عہد کی دوسری تحریروں اور مخطوطوں سے بھی واقفیت رکھتا ہو۔

چونکہ مختلف مضامین کی اصطلاحیں اور لغات و محاورات ایک دوسرے سے جدا جدا ہوتے ہیں، اس لیے مدون کے لیے ضروری ہے کہ ان تمام اصطلاحات، لغات اور محاورات سے شناسا ہو۔ ادب کی ہر صنف اپنے برتنے والوں سے جدا جدا واقفیت کا تقاضا کرتی ہے مثلاً نظم، نثر اور تاریخ ادب اردو میں سے ہر ایک اسلوب اور بیان جداگانہ نوعیت کا حامل ہوتا ہے، اس لیے ہر صنف کو اس کے اعتبار سے ترتیب دیا جانا چاہیے۔ مدون کے لیے ضروری ہے کہ وہ مصنف کے اور اس کے عہد کے تلفظ اور املا سے واقفیت رکھتا ہو اور اس کی تحریروں کو بہ آسانی پڑھ سکتا ہو تا کہ دوران ترتیب اگر کتاب اور کتاب کے درمیان تلفظ یا املا کا کوئی فرق ہو تو اس کی نشاندہی کر سکے۔ مدون کو متن کی طرزِ نگارش، اسلوب بیان، علمی ماحول اور اس کی علمی حیثیت سے بھی واقف ہونا ضروری ہے۔ مرتب کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جس عہد کی تصنیف کو ترتیب دے رہا ہے اس عہد کی علمی، سیاسی، سماجی، اور تہذیبی تاریخ بھی جانتا ہو۔ اس زمانہ کے شعراء و مصنفین، صوفیا اور سلاطین اور دیگر مشاہیر کے کارناموں کو بھی جانتا ہو۔ مخطوطات کی تدوین کے وقت اس عہد کے مقام اور مقامی بولیوں کے اثرات پر بھی روشنی ڈالی ضروری ہے کیونکہ مختلف مقامات کے تلفظ جدا جدا ہوتے ہیں، جن سے معانی میں اشتباہ کا اندیشہ ہے، اسی لیے ضروری ہے کہ مخطوطہ تحریر کیے جانے کا مقام اور اس مقام کی بولیوں سے باخبر ہو تا کہ مشتبہ الفاظ اور محاورات کی تصحیح کی جا سکے۔ مذکورہ بالا معروضات کے سلسلے میں قاضی عبدالودود کا کہنا ہے کہ:

''وہ اصحاب جو موزوں اور ناموزوں میں تمیز نہیں کر سکتے، دواوین وغیرہ کی ترتیب کا کام

اپنے ذمہ نہ لیں، دنیا میں اور بھی بہت سے کام ہیں، ایک نہ ہوسکا تو کیا ہوا۔'' (قاضی عبدالودود، اصولِ تحقیق 1982، ص:223)

تدوینِ متن کا اصل منشا یہ ہے کہ مخطوطہ یا مصنف کے ذریعہ لکھی ہوئی تحریر کو اس کی منشا کے مطابق پیش کر دیا جائے اور متداولہ کلام یا اس کی تصانیف وغیرہ میں جو دوسروں کا کلام شامل ہو گیا ہے اس کی نشاندہی کر دی جائے۔ تدوین کا اگرچہ صبر آزما اور مشکلوں بھرا ہے مگر ادبی تحقیق اس کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی۔ بقول ڈاکٹر تنویر احمد علوی:

> ''یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کسی متن کی تصحیح و ترتیب کا اصل مسئلہ تحقیق و تنقید کے بنیادی مسائل میں سے ہے۔ اس کے بغیر نہ تحقیق کا قدم آگے بڑھ سکتا ہے اور نہ تنقید کو صحیح جہت میسر آسکتی ہے۔ اس لیے کہ تحقیق کی اساس بہرحال ان متون پر ہے جن سے حقائق کے تجسس، مسائل کی تفہیم اور معیاروں کے تعین میں مدد لی جاتی ہے۔ اب اگر یہ متنی وسائل باوثوق سطح پر قابلِ استناد ہوں تو اخذ کردہ نتائج کے عمل کو کیسے مبنی برحقیقت قرار دیا جا سکتا ہے۔'' (متن اور روایت متن مشمولہ آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق، مرتبہ تنویر احمد علوی، اردو اکادمی دہلی 1990، ص:96)

مدون کے پیش نظر چونکہ بیشتر مخطوطے ہی ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ مخطوطے قدیم ہوتے ہوں گے، اس لیے ان کے متن کو مرتب کرنا نہایت مشکل امر ہے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ مخطوطے خستہ اور بوسیدہ حالت میں ہوتے ہیں اور واحد نسخہ ہونے کی صورت میں پریشانی مزید بڑھ جاتی ہے۔ نیز کاتب کے خط کی نوعیت اور املا لکھنے کا قدیم طریقہ یا رسم الخط وغیرہ مشکلات کھڑی کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھار مخطوطہ سے اس کے تصنیف کا عہد بھی متعین نہیں ہو پاتا، ایسی صورت میں مدون یا مرتب کو بڑی دشواری ہوتی ہے۔ تدوین کے دوران ایک مشکل اس وقت آن کھڑی ہوتی ہے جب مخطوطے کے کئی نسخے مل جاتے ہیں، تب یہ فیصلہ کرنا دشوار گزار ہوتا ہے کہ کس نسخہ کو بنیاد بنایا جائے۔ ان حالات میں غلط نسخے کو بنیاد بنانے کے بجائے سائنٹفک طریقہ کار سے مدد لینا چاہیے۔ تنویر احمد علوی لکھتے ہیں:

> ''معلومہ قلمی نسخوں میں سب سے اہم وہ قلمی نسخے ہو سکتے ہیں جو مولف کے اپنے دستِ قلم کے مرہونِ منت ہوں اور جن کے بارے میں اس امر کی کافی وشافی شہادت موجود ہو کہ یہ صاحبِ تصنیف کا اپنا خطی نسخہ ہے۔ ایسے کسی نسخے یا نسخوں میں موجود متن کو اساسی متن قرار دیا جانا چاہیے۔ دوسرے درجہ ایسے قلمی نسخے آسکتے ہیں جو مصنف کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ اس کا فیصلہ نہایت احتیاط سے کیا جانا چاہیے کہ واقعتاً کوئی نسخہ مصنف کی نظر سے گزرا ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں بطور خاص وہ نسخے رکھے جاسکتے ہیں جو مصنف کے ایما سے بڑے اہتمام کے ساتھ تیار کیے گئے ہوں یا ان کی تیاری میں اس کے کسی عزیز، شاگرد، مرید یا

دوست کا ہاتھ رہا ہو۔'' (متن اور روایت متن مشمولہ آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق، مرتبہ تنویر احمد علوی، اردو اکادمی دہلی، 1990، ص: 97)

بیشتر مخطوطوں کی موجودگی میں کسی ایک نسخہ کو بنیاد قرار دینے کے بعد جو مسئلہ درپیش ہوتا ہے وہ اس کی قرأت کا ہوتا ہے۔ یہ مرحلہ انتہائی نازک اور پیچیدہ ہوتا ہے کیونکہ اس میں قدیم عہد کے الفاظ، املا اور رسم الخط کا استعمال ہوتا ہے۔ کاتب کے انداز کتابت اور زبان کی قدامت وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن سے مدون کو عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے مدون یا مرتب کو وسیع العلم اور قدیم مخطوطوں کی قرأت کا ماہر ہونا چاہیے۔ اس کو قدیم املا سے واقفیت ہونا ضروری ہے ساتھ ہی لسانیات کے ارتقائی مراحل سے مکمل آگاہی بھی حاصل ہونا ضروری ہے۔ مدون یا مرتب کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس عہد کی مقامی بولیوں، اس عہد میں مروجہ اصطلاحات اور محاورات سے بھی واقف ہو۔ مخطوطہ کی قرات کے بعد مدون یا مرتب کو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اس متن میں کوئی الحاقی کلام تو شامل نہیں ہے، اس سلسلے میں داخلی اور خارجی شواہد سے کام لینا چاہیے۔ مذکورہ بالا تمام امور کی حتمی تصدیق کے بعد مدون کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے پیش نظر تمام نسخوں کی کیفیت بیان کرنے کے بعد کسی ایک نسخہ کو اپنی تحقیق کے لیے بنیاد قرار دے۔ ساتھ ہی اس کو بنیاد بنانے کے دلائل اور شواہد بھی بیان کرے۔ اگر وہ متعدد نسخوں کو اپنی تحقیق کی بنیاد بنانا چاہتا ہے تو اختلاف نسخ یعنی مختلف نسخوں کے مختلف متون کی وضاحت و صراحت حواشی کے ذیل میں کر دے۔

7.9 تدوین کے اصول

تدوین دراصل تحقیق کے آگے کی منزل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیق کے مقابلے میں تدوین کا کام کرنے والے پر زیادہ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ادبی تحقیق کی طرح تدوین کے بھی بعض اصول ہیں، جن کے مدنظر متن کی ترتیب و تصحیح کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ بنیادی طور پر تدوین متن کے اصول دو طرح کے ہوتے ہیں: (1) عمومی (2) خصوصی

عمومی اصول سے وہ اصول مراد ہیں جو ہر مدوّن کو اپنے پیش نظر رکھنے ضروری ہوتے ہیں خواہ وہ کسی بھی متن کی تدوین کرنا چاہتا ہو۔

خصوصی اصول سے وہ اصول مراد ہیں جو اس موضوع سے متعلق ہوتے ہیں، جس سے وہ کتاب یا مخطوطہ تعلق رکھتا ہے۔

عمومی اصول کے ذیل میں تدوین کا پہلا اصول یہ ہے کہ جس متن کی تدوین کی جا رہی ہے اس کے بارے میں تحقیق کر لی جائے کہ اس کے کتنے نسخے ہیں اور کہاں کہاں موجود ہیں۔ یعنی مدون کا سب سے پہلا کام مخطوطہ یا متن کی تلاش ہے، خواہ وہ ایک مقام پر ہوں یا الگ الگ مقامات پر، ان منتشر اجزا کو یکجا کرنا ہوتا ہے۔ پھر اس متن کو منشائے مصنف کے مطابق اس طرح ترتیب دینا ہوتا ہے کہ اول تو وہ اس کی تصحیح کرتا ہے۔ اس عمل کے دوران اس متن کی پوری تحقیق اور تفتیش کی جاتی ہے، اسے تنقیدی زاویوں سے دیکھا جاتا ہے، پھر اپنی رائے پیش کی جاتی ہے۔ حسب ضرورت متن میں واقع الفاظ، اصطلاحات، مقامات، اشخاص اور مبہم جملوں کی وضاحت بھی حواشی لگا کر کرنا ہوتی ہے۔ اس کی ابتدا میں ایک جامع مقدمہ تحریر کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ

تدوین کا عمل فراہمی متن، ترتیبِ متن، تصحیحِ متن، تحقیقِ متن، اور توضیحِ متن پر محیط ہے۔اس پورے عمل کے دوران مدون کو بھی محقق کی طرح دشوار گزار راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ محقق کی طرح ہی مدون پر بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ منصفانہ او رغیر جانبدارانہ سلوک کرے۔اس کا اصل مقصد و مدعا مصنفِ کتاب کی روح متن تک پہنچنا ہوتا ہے۔جس کے لیے اسے حاصل شدہ مواد کو مختلف تحقیقی اور تنقیدی زاویوں سے دیکھنا پڑتا ہے۔مدون کو سب سے پہلے متن کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ایک محقق جس متن کی تدوین کا ارادہ رکھتا ہے اسے سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس بات کا ثبوت کرلے کہ اس کے اس تحقیقی کام سے اردو ادب کو کیا فائدہ ہوسکتا ہے۔یا جس متن کو ترتیب دینا چاہتا ہے، اس متن کی ادبی حیثیت کیا ہے۔ان بنیادی باتوں سے مطمئن ہونے کے بعد اسے مواد کی تلاش میں سعی کرنی ہے۔اس سلسلے میں پہلے اسے پتہ لگانا ہوتا ہے کہ مطلوبہ مواد کن لائبریریوں میں دستیاب ہے۔مطلوبہ مواد یکجا کرنے کے بعد یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ اس سے متعلق دیگر زبانوں میں تو کوئی مواد موجود نہیں۔اس طرح تمام مواد اور دیگر زبانوں کے مواد کو اکٹھا کرنے کے بعد محقق کو دیکھنا ہوتا ہے کہ مواد میں کوئی فرق تو نہیں ہے۔اس طرح کی صورت حال میں جو مواد مصنف کے عہد سے زیادہ قریب ہوگا اسے تحقیق کی بنیاد بنایا جائے گا، جبکہ بقیہ دوسرے مواد بھی محقق کے زیرِ نظر رہیں گے۔کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ محقق کو ملنے والا مواد مطبوعہ ہوتا ہے اور کبھی غیر مطبوعہ۔مطبوعہ مواد کو پڑھنے میں آسانی ہوتی ہے، جبکہ غیر مطبوعہ مواد یا مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا مواد کئی دشواریوں کو جنم دیتا ہے۔

دوسرا اصول ''انتخاب نسخ'' کا ہے، یعنی دستیاب نسخوں میں سے تدوین کے لیے بعض نسخوں کو منتخب کرلیا جائے مثلاً اگر کسی متن کے ۵/ نسخے دستیاب ہوئے ہیں تو ان میں سے ۲/ یا ۳/ نسخوں کو ان کی اہمیت کے اعتبار سے منتخب کرلیا جائے۔اس انتخاب میں درج ذیل طریقہ اپنایا جائے:

(1) سب سے اچھا اور بہترین نسخہ وہ مانا جائے گا جو مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہو جس کو بخط مصنف بھی کہتے ہیں۔

(2) اس کے بعد وہ نسخہ زیادہ معتبر ہوگا جو مصنف کے نسخے سے نقل کیا گیا ہو، جسے خود مصنف نے پڑھا یا سنا ہو۔

(3) وہ نسخہ جو مصنف کے نسخے سے نقل کیا گیا ہو، لیکن خود مصنف نے اس کو نہ پڑھا ہو۔

(4) وہ نسخہ جو مصنف کے زمانے میں نقل کیا گیا ہو۔

(5) وہ نسخہ جو مصنف کے زمانے سے زیادہ قریب ہو۔

دستیاب نسخوں میں چند اہم نسخوں کے انتخاب میں درج ذیل امور ملحوظ رکھے جاتے ہیں۔

اگر مطبوعہ نسخے دستیاب ہوئے ہیں تو ان کی درجہ بندی اس طرح کی جائے گی:

(1) وہ نسخہ مستند مانا جائے گا جس کی تصحیح اور اشاعت مصنف کے زیرِ نگرانی ہوئی ہو۔

(2) پھر وہ نسخے آئیں گے جن کو مصنف کی زندگی میں اس سے متعلقہ کسی شخص نے مرتب کیا ہو۔

(3) پھر وہ نسخے معتبر ہوں گے جو مصنف کی حیات میں شائع ہوئے ہوں۔

(4) پھر وہ نسخے جو مصنف یا مولف کی وفات کے بعد خاص اہتمام سے مصنف کے کسی عزیز یا شاگرد نے شائع کیے ہوں۔

مخطوطوں کی ''قرأت'' کا مرحلہ بہت نازک ہوتا ہے۔ چوں کہ قدیم ادب میں حروف کو بغیر نقطہ اور اعراب کے لکھا کرتے تھے جبکہ عہدِ حاضر میں حالات تبدیل ہو چکے ہیں، اس لیے عہد بہ عہد تبدیل ہوتے ہوئے طرزِ تحریر پر بھی نظر رکھنی چاہئے تاکہ کہیں سے غلطی کا امکان باقی نہ رہے۔

متن کی فراہمی کے بعد دوسرا اہم مرحلہ یہ ہے کہ مدون جس متن کو مرتب کرنا چاہتا ہے، اسے چاہئے کہ وہ مصنف کے تلفظ، املا، اصطلاحات اور محاوروں کو حتی المقدور محفوظ کرنے کی کوشش کرے، زیادہ سے زیادہ وہ اس املا، اصطلاحات اور محاوروں کی وضاحت کرتا جائے کیونکہ تلفظ اور املا نہ صرف یہ کہ مصنف کی علمیت کا اظہار کرتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی ان کی تاریخی اہمیت بھی ہوتی ہے جو بڑے اہم نتائج کا سبب بنتے ہیں۔ مدون کو چاہیے کہ قدیم عہد کے محاورات اور روزمرہ کو آج کے دور سے ہم آہنگ کرتا جائے۔

تدوین کا تیسرا اصول ''مقابلہ و موازنہ'' ہے۔ مدون کو چاہیے کہ منتخب شدہ تمام نسخوں کے متن کو ملائے اور ان کی عبارت کو آپس میں مقابلہ کرے کہ تمام نسخوں کی عبارت ایک سی ہے یا اس میں کچھ فرق ہے۔ اگر کوئی اختلاف نہ ہو تو فبہا، لیکن اگر کوئی اختلاف ہے جس کی وجہ سے عبارت کے معنیٰ، تلفظ اور املا کو سمجھنے میں کوئی دشواری آئے گی تو اس کو حاشیے میں نقل کرنا ضروری ہے، کیونکہ اردو کا قدیم رسم الخط جدید رسم الخط سے الگ تھا۔ املا میں اختلاف ہونے کی صورت میں اصل متن میں صحیح عبارت نقل کرے اور دیگر اختلافِ نسخ کو حاشیے میں نقل کردے۔

قدیم عہد میں اردو رسم الخط' ترکی رسم الخط کی طرح اعراب بالحروف یعنی الف، یے اور واؤ کے ذریعے زبر، زیر اور پیش کی حرکات کے اظہار کا طریقہ رائج تھا، جو عہد جدید میں ناپید ہو چکا ہے، پھر بھی بہت سارے الفاظ مثلاً ''اوس'' بجائے ''اُس''، ''سونا'' بجائے ''سننا''، ''دیکھائی'' بجائے ''دکھائی''، ''بورا'' بجائے ''برا'' وغیرہ لکھنے کا طریقہ متروک ہو چکا ہے۔ اسی طرح قدیم متن میں واؤ معروف و مجہول کے علاوہ واوِ عطف، یائے معروف و مجہول اور ہائے ہوز و ہائے مخلوط میں کوئی تفریق نہیں کی جاتی تھی۔ اس وقت یائے معروف اور یائے مجہول میں تمیز کرنے کا کوئی اصول نہیں تھا۔ اسی طرح قدیم متون میں تائے قرشت (ت) اور تائے مدورہ (ۃ) میں کوئی فرق نہیں روا رکھا جاتا تھا۔ ایسا ہی معاملہ ہائے مدورہ (ہ) اور ہائے مخلوط (ھ) کا ہے، جس میں عام طور پر کوئی تمیز نہیں برتی جاتی تھی۔ کلاسیکی مخطوطات خصوصاً دکنی مخطوطات میں ان دونوں کے لیے دوچشمی (ھ) کا ہی استعمال کیا جاتا تھا، جیسے بہانہ کو بھانہ اور بہار کو بھار اور اس کے برعکس پنکھا کو پنکہا اور نبھانا کو نبہانا وغیرہ۔ اسی طرح قدیم متون میں نقطہ لگانا ضروری نہیں تھا، جس سے قاری کے لیے منقوط اور غیر منقوط حروف میں تمیز کرنا دشوار ہے اور نقطوں میں ذرا سی بے احتیاطی سے متن کی قرأت غلط ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دو مختلف الفاظ کو ملا کر لکھنے کا رواج بھی قدیم متون میں ملتا ہے، جیسے اہلخانہ، نامجات وغیرہ۔ لہٰذا ایسی صورت میں مدون کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کو جدید املا کے اصولوں کے تحت لکھے تاکہ قرأت میں دشواری نہ ہو۔

تدوینِ متن کے لیے چوتھی اہم چیز ''حواشی'' ہے، یعنی مدون اختلاف نسخ کو بیان کرنے کے لیے حاشیہ نگاری کا کام انجام دے۔ حاشیہ درج کرنے کے تین طریقے رائج ہیں۔ اول یہ کہ ہر صفحہ کے نیچے اس کا حاشیہ درج کرتا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک باب ختم ہو جانے کے بعد اس باب کے تمام حواشی درج کر دیے جائیں۔ یا پھر پوری کتاب کے تمام حواشی ایک ساتھ کتاب کے

آخر میں درج کر دیے جائیں۔

پانچواں اصول یہ ہے کہ اگر متن قدیم ہے تو اس کی فرہنگ سازی کا اہتمام کیا جائے، جس میں متعلقہ متون کے مشکل الفاظ، اصطلاحات، واردِ متن تلمیحات، نامانوس الفاظ اور متروک الاستعمال الفاظ کے معنی، تشریح اور مفہوم کی وضاحت کر دی جائے۔ ان کے علاوہ محاوروں کا مفہوم، متن میں مستعمل مشکل جملے، مصرعے اور فقروں کی تخریج وتشریح کر دی جائے۔

کتاب کی تکمیل کے بعد مرتب متن ایک مفصل مقدمہ تحریر کرے، جس میں اس کتاب اور متعلقات کتاب کو زیرِ بحث لائے۔ جس میں کتاب کی ادبی اہمیت، اس کا لسانی تجزیہ، مصنف کے حالات زندگی اور زیرِ نظر تمام نسخوں کی مکمل کیفیت بیان کرے۔ متعلقہ متن کو یکجا کرنے کی صورت حال، متن سے متعلق دیگر نسخوں کی صراحت یا جن لوگوں نے متعلقہ کتاب کی ترتیب و تدوین میں تعاون کیا ہے، ان کا شکریہ ادا کرے۔

قدیم املا میں یائے معروف اور یائے مجہول کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا تھا۔ مصنفین کے لیے یہ آزادی تھی کہ انھیں جس طرح چاہیں لکھیں لیکن یہ صورت حال عام قاری کے لیے انتہائی پیچیدہ صورت اختیار کر لیتی ہے۔

قدیم تحریروں میں 'کاف' اور 'گاف' کے مابین خط امتیاز کھینچنے کی کوئی روایت موجود نہیں تھی۔ اس وقت کے مصنفین اکثر و بیشتر ''گاف'' کو بھی ایک ہی مرکز سے لکھ دیا کرتے تھے۔ اس عدم امتیاز کے سبب لفظوں کی ہیئت تبدیل جاتی ہے اور قارئین مصنف کی منشا سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اب جبکہ کاف اور گاف کے مابین فرق کرنے کے اصول متعین ہو گئے ہیں، مدون کو چاہیے کہ اس فرق کی وضاحت کر دے۔

تدوین کے دوران یائے معروف، یائے مجہول، تذکیر و تانیث وغیرہ میں امتیاز پیدا کرنا چاہیے تاکہ قدیم اور جدید تحریروں کے فرق کو ملحوظ رکھا جا سکے۔ یائے معروف اور یائے مجہول اردو رسم خط کی غیر ترقی یافتہ شکلیں تھیں۔ اب چونکہ حالات بدل گئے ہیں، اس لیے حرف ''ے'' کی ان دو مختلف علامتوں کے مابین امتیاز پیدا کرنے کی بنا پر متن کو غلط پڑھ لیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے تذکیر و تانیث میں دشواری پیدا ہو جاتی ہے۔

خصوصی اصولوں کے ذیل میں اصولوں کا تعین موضوع کی مناسبت سے ہوتا ہے کیونکہ ہر موضوع کے تقاضے الگ الگ ہوتے ہیں۔ اگر کوئی نثری کتاب کی تدوین کر رہا ہے تو اس کے تقاضے الگ ہوں گے اور شعری متون کی تدوین کے تقاضے الگ ہوں۔ اگر کوئی شعری متون کی تدوین کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے لازمی ہے کہ محاسنِ شعر اور شعر کے دیگر رموز و نکات سے اچھی طرح واقفیت رکھتا ہو۔ شعری متن کے ساتھ مصنف کی دیگر تصانیف کا مطالعہ، مصنف کے معاصرین کی تحریروں کا مطالعہ بھی کرنا ہوگا۔ تاکہ اس کو منشائے مصنف متعین کرنے میں دشواری نہ ہو۔

7.10 آپ نے کیا سیکھا

- تدوین تحقیق کا ایک شعبہ ہے۔ اس میں محقق کسی مصنف کی کتاب کو اس کی منشا کے مطابق ترتیب دیتا ہے۔ کسی کتاب کے قدیم ایڈیشن کو حواشی کے ساتھ ایک نئی شکل دے کر پیش کرتا ہے یا کسی اہم مخطوطہ کو ترتیب دے کر عوام کی نذر کرتا ہے۔

- ہر اعلیٰ پایہ کے محقق نے تدوین متن کے فرائض بھی انجام دیے ہیں مثلاً محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، مسعود حسن رضوی ادیب، مولانا امتیاز علی عرشی، غلام رسول مہر، مالک رام، مسعود حسین خاں، ڈاکٹر نذیر احمد، نورالحسن ہاشمی، مختار الدین احمد، محمود الٰہی، اکبر حیدری، جمیل جالبی، مشفق خواجہ، گیان چند جین اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی وغیرہ۔
- مخطوطہ عربی زبان کا لفظ ہے، جو خط بخط سے ماخوذ ہے۔ خط کے معنی لکھنے کے ہیں اور مخطوطہ کے معنی 'لکھے ہوئے' کے ہیں۔ اس کی جمع مخطوطات ہے۔ انگریزی میں اس کا متبادل Manuscript اور ہندی میں 'پانڈولپی' ہے۔ اصطلاحی معنوں میں مخطوطہ اس کتاب کو کہتے ہیں جو ہاتھ سے لکھی ہوئی ہو۔
- تدوین کے لیے سب سے اچھا اور بہترین نسخہ وہ مانا جائے گا جو مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہو جس کو بخط مصنف بھی کہتے ہیں۔
- اول نسخہ کے بعد وہ نسخہ زیادہ معتبر ہوگا جو مصنف کے نسخے سے نقل کیا گیا ہو، جسے خود مصنف نے پڑھا یا سنا ہو۔
- تدوین کے دوران تحقیق کی بھی ضرورت پیش آتی ہے اس لیے مدون کو تحقیق کے اصول وضوابط اور طریقۂ کار سے واقفیت لازمی ہے۔ اسے کئی زبانوں پر عبور ہونا چاہیے کیونکہ قدیم مخطوطوں میں عربی اور فارسی کی اصطلاحیں، جملے، تواریخ اور ہندسے ہوتے تھے، ان کا سمجھنا صرف ماہر مدون کا ہی کام ہے۔
- 'متن' وہ عبارت کہلاتی ہے جس کا کوئی مطلب نکلتا ہو اور اس کے معنی سے ذہن مطمئن ہو جائے۔ عبارتِ متن کاغذ کے اوراق پر بھی ہو سکتی ہے اور کسی دیوار، مٹی کے ٹھیکروں، چٹانوں، درخت کی چھالوں اور چمڑے کے ٹکڑوں پر بھی ہو سکتی ہے، یعنی بامعنی جملے اگر تحریری شکل میں کسی بھی حالت میں ہوں وہ متن کہلائیں گے۔
- مختلف مضامین کی اصطلاحیں اور لغات و محاورات ایک دوسرے سے جدا جدا ہوتے ہیں، اس لیے مدون کے لیے ضروری ہے کہ ان تمام اصطلاحات، لغات اور محاورات سے شناسا ہو۔
- تدوین میں حسب ضرورت متن میں واقع الفاظ، اصطلاحات، مقامات، اشخاص اور مبہم جملوں کی وضاحت بھی حواشی لگا کر کرنا ہوتی ہے۔ اس کی ابتدا میں ایک جامع مقدمہ تحریر کرنا ہوتا ہے۔
- نثری کتاب کی تدوین کے تقاضے الگ ہیں اور شعری متون کی تدوین کے تقاضے الگ۔ اگر کوئی شعری متون کی تدوین کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے لازمی ہے کہ محاسنِ شعر اور شعر کے دیگر رموز و نکات سے اچھی طرح واقفیت رکھتا ہو۔ شعری متن کے ساتھ مصنف کی دیگر تصانیف کا مطالعہ، مصنف کے معاصرین کی تحریروں کا مطالعہ بھی کرنا ہوگا۔ تاکہ اس کو منشائے مصنف متعین کرنے میں دشواری نہ ہو۔

7.11 اپنا امتحان خود لیجیے

سوال 1: تدوین کے لغوی اور اصطلاحی معنی بتائیے؟

سوال 2: تدوین متن کے مقاصد کیا ہیں؟

سوال 3: بعض اہم مدونین کے نام بتائیے؟

سوال4: متن کسے کہتے ہیں؟

سوال5: بنیادی طور پر تدوین متن کے اصول کتنے ہیں؟

7.12 سوالات کے جوابات

جواب1: لفظ تدوین عربی سے ماخوذ ہے۔ یہ دَوَنَ سے باب تفعیل کا مصدر ہے۔ اس کے معنی جمع کرنے، اندراج کرنے، لکھنے اور ترتیب دینے کے ہیں۔ مصباح اللغات میں اس کے معنی اس طرح درج ہیں: ''دَوَّن الدیوان: ترتیب دینا، رجسٹر میں نام لکھنا۔

اصطلاح میں کسی شعری یا نثری متون کو اس کے اصول و آداب کے ساتھ یا منشائے مصنف کے مطابق ترتیب دینا تدوین کہلاتا ہے۔ کسی ادبی، لسانی یا تاریخی اہمیت کے حامل متن کو منشائے مصنف کے مطابق تحقیق، تصحیح، تحشیہ، تخریج اور مقدمے کے ساتھ پیش کرنے کو تدوین کہا جاتا ہے۔ کسی ایسے متن کو جو تاریخی، ادبی اور لسانی اہمیت رکھتا ہو، مصنف کی منشا کے مطابق پیش کرنے کے عمل کو تدوین کہتے ہیں۔ یعنی اصل متن کی بازیافت کا عمل تدوین کہلاتا ہے۔ 'تدوین' کے مشتقات میں دیوان (واحد) دواوین (جمع) بھی ہے، جس سے دفتر، ناموں کا رجسٹر، اشعار کا رجسٹر وغیرہ مراد ہے۔

لفظ تدوین' تحقیق سے بھی الگ نہیں ہے بلکہ تحقیق تدوین ہی کی ایک شاخ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تدوین کے لیے بھی انہی صلاحیتوں اور ذہنی رجحانات کی ضرورت ہوتی ہے جو تحقیق کے لیے درکار ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہر اعلیٰ پایہ کے محقق نے تدوین متن کے فرائض بھی انجام دئے ہیں مثلاً محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، مسعود حسن رضوی ادیب، مولانا امتیاز علی عرشی، غلام رسول مہر، مالک رام، مسعود حسین خاں، ڈاکٹر نذیر احمد، نورالحسن ہاشمی، مختارالدین احمد، محمود الٰہی، اکبر حیدری، جمیل جالبی، مشفق خواجہ، گیان چند جین اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی وغیرہ۔

جواب2: تدوین یا ترتیب متن کا مقصد محض اس کے سوا کچھ نہیں کہ دستیاب شدہ متن کو اس کے اصولوں اور ضوابط کے مطابق نیز منشائے مصنف کے مطابق اس طرح ترتیب یا جائے کہ اس وہ مصنف کی روحِ متن کا ترجمان بن جائے اور اس کی عبارت میں کوئی نقص یا کجی کا امکان باقی نہ رہے۔ تدوین کا عمل بھی تحقیق کا ہی ایک حصہ ہے، پھر بھی دونوں کے طریق کار میں فرق ہے اور دونوں کے دائرۂ کار علیحدہ علیحدہ ہیں۔ ضروری نہیں کہ ایک اچھا محقق ایک ماہر مدون بھی ثابت ہو۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص تحقیق کے میدان میں مہارت رکھتا ہو لیکن تدوین میں اس کے تجربات اور مشاہدات اس قدر پختہ نہ ہوں کہ وہ تدوین کے حقوق بھی ادا کر سکے۔ یعنی تدوین میں کسی قدیم متن یا مخطوطے کے مختلف نسخوں کو یکجا کرنے کے بعد تلاش و تحقیق کے ذریعہ اس کی اصل شکل تک رسائی حاصل کی جاتی ہے۔ اس متن کو جدید املا کے اصولوں کے تحت اعراب، رموزِ اوقاف، حواشی، ضمیمہ، فرہنگ، اشاریہ، مقدمے، مشکل الفاظ کی وضاحت، محاورات اور مقامی بولیوں کی تشریح و تعبیر کر کے متن کو قاری کے لیے آسان بنایا جاتا ہے۔ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

● متن کو منشائے مصنف کے مطابق ترتیب دینا۔ ● ترتیب کے دوران صحت عبارت کا خیال رکھنا۔ ● متن کو معیاری املا

کے مطابق ترتیب دینا۔ ● متن کے انتساب سے متعلق تحقیق کرنا۔ ● متن کوالحاقیات سے پاک کرنا۔ ● متن میں شامل مجمل یا ناقص حوالوں کی وضاحت کرنا۔ ● متن سے متعلق تحقیقی حقائق پیش کرنا۔ ● متن میں وارد غیر معروف اشخاص، کتب اور مقامات کے بارے میں حواشی لکھنا۔ ● غیر معروف اور مشکل الفاظ اور اصطلاحات کی فرہنگ تیار کرنا۔ ● متن میں وارد اقتباسات، اقوال، اشعار اور آیاتِ قرآنی واحادیث کی تخریج کرنا۔ ● کسی قدیم متن کی صحیح قرأت ممکن بنانا۔ ● مصنف کے اغلاط وسہو کی نشاندہی کرنا۔ ● قدیم یادکنی متون کے لسانی امتیازات، رسم الخط نیز تلفظ کی وضاحت کرنا وغیرہ۔

جواب 3 اردو کے بعض اہم مدونین میں محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، مسعود حسن رضوی ادیب، مولانا امتیاز علی عرشی، غلام رسول مہر، مالک رام، مسعود حسین خاں، ڈاکٹر نذیر احمد، نورالحسن ہاشمی، مختار الدین احمد، محمود الٰہی، اکبر حیدری، جمیل جالبی، مشفق خواجہ، گیان چند جین اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی وغیرہ کا نام اہمیت کا حامل ہے۔

جواب 4: 'متن' وہ عبارت کہلاتی ہے جس کا کوئی مطلب نکلتا ہو اور اس کے معنی سے ذہن مطمئن ہو جائے۔ عبارتِ متن کاغذ کے اوراق پر بھی ہو سکتی ہے اور کسی دیوار، مٹی کے ٹھیکروں، چٹانوں، درخت کی چھالوں اور چمڑے کے ٹکڑوں پر بھی ہو سکتی ہے، یعنی بامعنی جملے اگر تحریر شکل میں کسی بھی حالت میں ہوں وہ متن کہلائیں گے۔ متن کی عبارت کے لیے ضروری نہیں کہ وہ کتنی مقدار میں ہے، مختصر عبارت بھی متن کہلاتی ہے اور طویل عبارت بھی۔

متن کا تحریری شکل میں ہونا ضروری ہے اور ساتھ ہی اس کا بامعنی ہونا بھی، بے معنی اور مہمل تحریریں متن کہلانے کی مستحق نہیں ہیں۔ ناقدین نے متن کی کئی اقسام بتائی ہیں، جن میں املائی متن، تقریری متن، سمعی متن، خطی متن اور مطبوعہ متن وغیرہ شامل ہیں۔ املائی متن میں ایک شخص بولتا ہے اور دوسرا شخص تحریر کرتا جاتا ہے۔ بہت سے متون تقریری شکل میں ہوتے ہیں بعد میں کسی مدون کے ذریعہ تحریری شکل میں لایا جاتا ہے۔ خطی متن وہ کہلاتا ہے جو تحریر شکل میں ہو خواہ وہ مصنف کے ذریعہ تحریر کیا گیا ہو یا کسی کاتب نے لکھا ہو، جبکہ مطبوعہ متن وہ متن کہلاتا ہے جسے مصنف نے اپنی زندگی میں خود ترتیب دے کر شائع کیا ہو یا مصنف کے اشارے پر کسی دوسرے شخص نے ترتیب دیا ہو۔ متن ایسی عبارت یا تحریر کا نام ہے، جو کسی چیز پر چھپی ہوئی ہو، کسی بھی زبان میں ہو، نظم ہو یا نثر، قدیم ہو یا جدید، کم وہ یا زیادہ البتہ وہ معانی سے خالی نہ ہو۔ گویا ہر طرح کی زیر غور تحریر یا تقریر، شاعری، نثری کلام، تاریخ، مکتوبات، خطوط، فیصلے، فتوے، خطبات، تذکرے، بیاض، لغت، قاموس، صوتیات وغیرہ متن کہلائیں گے۔

جواب 5: تدوین متن کے اصول دو ہیں:

(1) عمومی۔ عمومی اصول کے ذیل میں تدوین کا پہلا اصول یہ ہے کہ جس متن کی تدوین کی جارہی ہے اس کے بارے میں تحقیق کر لی جائے کہ اس کے کتنے نسخے ہیں اور کہاں کہاں موجود ہیں۔ یعنی مدون کا سب سے پہلا کام مخطوطہ یا متن کی تلاش ہے، خواہ وہ ایک مقام پر ہوں یا الگ الگ مقامات پر، ان منتشر اجزا کو یکجا کرنا ہوتا ہے۔ پھر اس متن کو منشائے مصنف

کے مطابق اس طرح ترتیب دینا ہوتا ہے کہ اول تو وہ اس کی تصحیح کرتا ہے۔اس عمل کے دوران اس متن کی پوری تحقیق اور تفتیش کی جاتی ہے،اسے تنقیدی زاویوں سے دیکھا جاتا ہے، پھر اپنی رائے پیش کی جاتی ہے۔حسب ضرورت متن میں واقع الفاظ،اصطلاحات،مقامات،اشخاص اور مبہم جملوں کی وضاحت بھی حواشی لگا کر کرنا ہوتی ہے۔اس کی ابتدا میں ایک جامع مقدمہ تحریر کرنا ہوتا ہے۔اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ تدوین کا عمل فراہمی متن، ترتیبِ متن، تصحیحِ متن، تحقیقِ متن، اور توضیحِ متن پر محیط ہے۔اس پورے عمل کے دوران مدون کو بھی محقق کی طرح دشوار گزار راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔کیونکہ محقق کی طرح ہی مدون پر بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ منصفانہ اور غیر جانبدارانہ سلوک کرے۔اس کا اصل مقصد و مدعا مصنفِ کتاب کی روح متن تک پہنچنا ہوتا ہے۔جس کے لیے اسے حاصل شدہ مواد کو مختلف تحقیقی اور تنقیدی زاویوں سے دیکھنا پڑتا ہے۔مدون کو سب سے پہلے متن کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ایک محقق جس متن کی تدوین کا ارادہ رکھتا ہے اسے سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس بات کا ثبوت کرلے کہ اس کے اس تحقیقی کام سے اردو ادب کو کیا فائدہ ہوسکتا ہے۔ یا جس متن کو ترتیب دینا چاہتا ہے،اس متن کی ادبی حیثیت کیا ہے۔

(2) خصوصی۔خصوصی اصولوں کے ذیل میں اصولوں کا تعین موضوع کی مناسبت سے ہوتا ہے کیونکہ ہر موضوع کے تقاضے الگ الگ ہوتے ہیں۔اگر کوئی نثری کتاب کی تدوین کررہا ہے تو اس کے تقاضے الگ ہوں گے اور شعری متون کی تدوین کے تقاضے الگ ہوں۔اگر کوئی شعری متون کی تدوین کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے لازمی ہے کہ محاسنِ شعر اور شعر کے دیگر رموز و نکات سے اچھی طرح واقفیت رکھتا ہو۔شعری متن کے ساتھ مصنف کی دیگر تصانیف کا مطالعہ،مصنف کے معاصرین کی تحریروں کا مطالعہ بھی کرنا ہوگا۔تاکہ اس کو منشائے مصنف متعین کرنے میں دشواری نہ ہو۔

7.13 فرہنگ

الفاظ	معانی
اندراج	فہرست وغیرہ میں داخل کیے جانے یا لکھے جانے کا عمل،فہرست بنانا
بسیط	کشادہ،کھلا
مشتقات	کوئی لفظ جو کسی دوسرے لفظ یا اصل سے بنایا گیا ہو،اخذ کیا ہوا،نکلا ہوا
تلون مزاجی	غیر مستقل مزاج،جس کی طبیعت ایک حالت پر قائم نہ رہے،جلد بدل جانے والا
استوار	قائم، پختہ،ایک اصول اور ضابطے پر قائم، منظّم و مرتب
کندہ	کھدا ہوا،نقش کیا ہوا،لکھا ہوا
معروضات	عرض کی ہوئی چیزیں، گذارشات، درخواستیں، بیانات
قاموس	ایک عربی لغت جس کا مصنف محمد بن یعقوب فیروز آبادی ہے
کجی	ٹیڑھا پن، تنگ مزاجی، ہٹ دھرمی

خط شکستہ	ایک قسم کا خط (Font) جو بہت جلد لکھا جاتا ہے اور مشکل سے پڑھا جاتا ہے
مصحح	تصحیح کرنے والا، غلطیاں اور نقص کی نشان دہی کرنے والا، پروف پڑھنے والا
بوسیدہ	کہنہ، پرانا، گلا ہوا یا سڑا ہوا
متروک	جسے چھوڑ دیا جائے، وہ لفظ یا محاورہ جس پہلے مستعمل ہو مگر اب غیر فصیح سمجھ کر استعمال میں نہ لایا جاتا ہو
معاصرین	معاصر کی جمع، ہم عصر، ہم زمانہ، ایک ہی عہد کے لوگ

7.14 کتب برائے مطالعہ

1.	اردو میں تدوین متن، فن اور روایت	عقیل احمد	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	2020
2.	اصول تحقیق و ترتیب متن	تنویر احمد علوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی	1994
3.	لسانی و ادبی تحقیق و تدوین	عطش درّانی	نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد	2016
4.	تحقیق شناسی	رفاقت علی شاہد	القمر انٹر پرائزز، لاہور	2003
5.	اردو میں اصولِ تحقیق	سلطانہ بخش (مرتب)	اردو اکیڈمی، لاہور	2012

بلاک:3 اردو کے اہم محققین (الف)

اکائی:8 حالی اور شبلی

اکائی:9 مولوی عبدالحق اور امتیاز علی عرشی

اکائی:10 حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود

بلاک 3 کا تعارف

اکائی 8 ''حالی اور شبلی'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں حالی وشبلی کے حالات زندگی پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ساتھ ہی ان کی اہم تصنیفات وتالیفات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔اسی حصے میں حالی اور شبلی کے تحقیقی کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے اوصاف وامتیازات کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اکائی 9 ''مولوی عبدالحق اور امتیاز علی عرشی'' پر مبنی ہے۔جس میں مولوی عبدالحق وامتیاز علی عرشی کے حالات زندگی پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ساتھ ہی ان کی اہم تصنیفات وتالیفات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔اسی حصے میں مولوی عبدالحق وامتیاز علی عرشی کے تحقیقی کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے اوصاف وامتیازات کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اکائی 10 ''حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبد الودود کے حالات زندگی پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ساتھ ہی ان کی اہم تصنیفات وتالیفات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔اسی حصے میں حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود کے تحقیقی کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے اوصاف وامتیازات کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اکائی 8 : حالی اور شبلی

ساخت:

8.1 اغراض ومقاصد

8.2 تمہید

8.3 الطاف حسین حالی: شخصیت اور تحقیقی کارنامے

8.3.1 حالی کا سوانحی تعارف اور حالات زندگی

8.3.2 حالی کی اہم تصنیفات وتالیفات

8.3.3 حالی کے اہم تحقیقی کارنامے۔اوصاف وامتیازات

8.4 علامہ شبلی نعمانی: شخصیت اور تحقیقی کارنامے

8.4.1 شبلی کے سوانحی کوائف اور حالات زندگی

8.4.2 شبلی کی تصنیفات وتالیفات

8.4.3 شبلی کے تحقیقی کارنامے۔اوصاف وامتیازات

8.5 آپ نے کیا سیکھا

8.6 اپنا امتحان خود لیجئے

8.7 سوالات کے جوابات

8.8 فرہنگ

8.9 کتب برائے مطالعہ

8.1 اغراض ومقاصد:

اس اکائی کے ذریعہ آپ/کو

- الطاف حسین حالی اور شبلی کے سوانحی کوائف اور ان کے حالات زندگی سے واقف ہوں گے۔
- الطاف حسین حالی اور شبلی کی تصنیفات کی معلومات حاصل ہوگی۔
- الطاف حسین حالی کے تحقیقی کارناموں اور ان کی ادبی خدمات کے ساتھ ان کے اوصاف اور امتیازات کے بارے میں جان سکیں گے۔
- علامہ شبلی نعمانی کے تحقیقی کارناموں اور ان کی ادبی خدمات کے ساتھ ان کے اوصاف اور امتیازات کے بارے میں جان سکیں گے۔

8.2 تمہید:

اردو زبان و ادب میں تحقیق کو فروغ دینے میں الطاف حسین حالی نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ حالی صرف ایک فرد نہیں بلکہ وہ ایک خاص تہذیبی مزاج کے نمونہ تھے۔ وہ ایک ایسی عظیم ثقافتی تحریک کے عنصر تھے جو عہد آفریں تھی۔ حالی نے سر سید احمد خان کے اثرات قبول کئے۔

سرسید اردو زبان کی ایسی شخصیت تھے جنھوں نے اردو میں تحقیق کا آغاز کیا۔ تحقیق کی روایت کے مطابق سرسید کی تاریخی تحقیق ''آثار الصنادید'' (۱۸۴۷) کو اردو تحقیق کا سنگ بنیاد کہا جاتا ہے۔ سرسید کے زمانے میں ہی ان کے رفقاء میں الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی کے ساتھ کئی اہم شخصیتوں نے اردو میں باقاعدہ تحقیقی کام شروع کئے اور اردو زبان و ادب کی تاریخ میں اپنی حیثیت منوالی۔

انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستان میں ایک نئی تہذیبی صبح طلوع ہونے لگی تھی حالی بھی اس صبح نو کی ایک شوخ کرن کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے جس کی روشنی سرسید کے توسط سے پھیلی۔ سرسید کا اثر حالی کی شخصیت اور ان کی ادبی زندگی پر بڑا گہرا پڑا۔ حالی کی عمر سرسید سے بیس سال کم اور اکبرالہ آبادی سے نو سال زیادہ تھی۔ عین عنفوان شباب میں حالی کو ۱۸۵۷ کے غدر کا سامنا کرنا پڑا اور ملک ایک بڑے انقلاب سے دو چار ہوا۔

اردو تحقیق کے معیار و میزان کو سامنے رکھتے ہوئے حالی لسانی اور ادبی اختراعات کی تجربہ گاہ میں بھی متوسط راہ و رفتار کو پسند کرتے رہے وہ انقلابی تبدیلی کے بجائے تدریجی ترقی کو سراہتے اور فوقیت دیتے تھے۔ حالی نے اردو کی لسانی ترکیب اور مزاج کے متعلق جو تحقیق کی تھی اور اس کی نشو و نما کے تعلق سے جو خیالات پیش کئے تھے ان کا لحاظ انھوں نے اپنی تحریروں میں بھی رکھا۔ ان کی طرز نگارش اور اسلوب اظہار سادہ و سلیس تھا۔ وہ ہمیشہ گرانبار فارسی اور عربی ترکیبوں اور ثقیل الفاظ کے استعمال سے احتراز کرتے تھے۔ عام کھڑی بولی کے لفظوں کے برتاؤ کے علاوہ دوسری زبانوں کے سہل لفظوں کو مروج کیا۔ انھوں نے نثر میں مقفٰی انداز اختیار کیا لیکن سادگی کو قائم رکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی اردو زبان و ادب کے اہم محقق ناقد، مفکر، شاعر اور زبان داں تھے۔

شمس العلما علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷۔۱۹۱۴) دنیائے اردو زبان و ادب کی ایک کثیر الجہت صفات سے مملو شخصیت تھے۔ وہ ادیب، نقاد، شاعر، عالم، محقق اور مقرر تھے۔ علامہ اقبال انھیں استاد الکل کا درجہ دیتے تھے۔ حالی کے نزدیک

ادب اور مشرقی تاریخ کا ہو دیکھنا مخزن
تو شبلی سا وحید عصر یکتائے زمن دیکھیں

مہدی افادی نے تو انھیں تاریخ کا معلم اول کہا تھا۔ وہ اپنے عہد کے مسلمان مورخین میں ایسی تنہا شخصیت تھے جنھوں نے تاریخ نویسی کے رجحانات اور اس کی انداز طرز و فکر میں جدید رویوں کی آمیزش کی۔ ذوق تحقیق کا جوہر ان کے اندر اس طرح نمایاں تھا کہ سینکڑوں کتابوں، مخطوطوں اور نوادرات کی مدد سے چھان بین کا کوئی پہلو نہیں چھوڑتے تھے۔ انھوں نے مصادر کے اسناد کو تحقیق کی کسوٹی پر جانچا پرکھا۔ روایتی طریق کار کو اپنایا لیکن اس میں جدید سائنسی طریقۂ تحقیق کو مدنظر رکھا۔ نتائج کا استنباط کرتے وقت

عجلت سے کبھی بھی کام نہیں لیا۔تحقیق کے کسی گوشے کو ان چھوا نہیں رکھا۔

شبلی کئی زبانیں جانتے تھے۔عربی، فارسی، اردو پر انھیں ایسی قدرت حاصل تھی کہ شاعری ہو یا نثر، ہر دو اصناف میں اس کے نمونے مل جائیں گے جن کا درجہ اعلیٰ سے اعلیٰ ترین ہے۔شبلی کے تحقیقی کارناموں کی فہرست طویل ہے اس طرح ان کے تنقیدی کام بھی کئی ایک ہیں۔جن میں ''موازنہ انیس و دبیر'' آج بھی قابل مطالعہ کتاب کہی جاتی ہے۔ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر نے بالکل صحیح کہا ہے کہ شبلی نے محض ادبی تنقید ہی نہیں کی۔اس نے تاریخ، شاعری علم کلام میں بھی معرکے کا کام کیا ہے اور ان شعبوں میں اردو کے لئے نئی راہیں نکالی ہیں۔ان کے خیال میں جنگ آزادی اور جنگ عظیم اول کے درمیانی دور میں اور کوئی ادیب ایسا نہیں ہے جو اتنی وسیع نظر رکھتا ہو اور جس میں اتنی خوبیاں ہوں۔

علامہ شبلی نعمانی کو علی گڑھ میں سرسید، حالی اور پروفیسر آرنلڈ اور دوسرے بہت سے اہل علم اصحاب سے ملنے اور علمی مجلسوں میں شرکت کے بکثرت مواقع ملے۔اس طرح وہ حیدرآباد دکن، ندوۃ العلما، اور اعظم گڑھ جیسے مقامات پر رہ کر تحقیقی، تصنیفی، تالیفی کام کیے جن کو اردو زبان و ادب میں غیر معمولی خدمات کی شکل میں دیکھا جاتا ہے۔

8.3 الطاف حسین حالی: شخصیت اور تحقیقی کارنامے

8.3.1 حالی کا سوانحی تعارف اور حالاتِ زندگی

الطاف حسین حالی کی پیدائش ۱۸۳۷ء میں ہوئی۔پانی پت ان کی جائے پیدائش ہونے کے سبب یہ ان کا وطن بھی رہا ہے۔حالی کی تعلیم و تدریس خالص مشرقی تہذیب کے مطابق ہوئی انھوں نے عربی کی تعلیم حاصل کی اور پورا قرآن حفظ کیا اور پھر فارسی اور عربی کی اگلی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے دہلی کا سفر کیا۔انھوں نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے گریز کیا۔ان کے والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا جو اس زمانے میں محکمہ نمک میں ملازم تھے۔اپنے خاندانی حالات کے حوالے سے حالی کا کہنا ہے کہ ساتوی صدی ہجری اور تیرہویں صدی عیسویں میں جبکہ غیاث الدین بلبن دلی کی حکومت پر متمکن تھا شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ ''پیر ہرات'' کی اولاد سے ایک بزرگ ملک بھی تھا جو علوم متعارفہ میں اپنے معاصرین سے ممتاز تھا، ہرات سے ہندوستان وارد ہوئے تھے جن کا سلسلۂ نسب ۲۸ واسطوں سے ابوایوب انصاری تک، ۱۸ واسطوں سے شیخ الاسلام تک اور ۱۰/ واسطوں سے ملک محمود شاہ انجو ملقب بہ آق خواجہ تک جو غزنوی دور میں فارس و کرمان و عراف و عجم کا خرماں روا تھا، پہنچتا ہے۔

حالی نے مزید لکھا ہے کہ سلطان غیاث الدین ہی کی بدولت قصبۂ پانی پت میں معتمد بہ اراضی بطور معاشی مدد کے اور بہت سی زمینیں اندرون آبادی قصبہ پانی پت میں برائے سکونت ملی تھی۔ان کا کہنا ہے کہ پانی پت میں ایک محلّہ انصاریوں کا مستور ہے وہ انھیں بزرگ کی اولاد سے منسوب ہونے کی وجہ سے باپ کی طرف سے وہ اسی شاخ انصار سے علاقہ رکھتے ہیں۔لیکن والدہ کی طرف سے ان کا کہنا تھا کہ وہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی اولاد تھیں،ان کی والدہ کا تعلق سادات شہداپور کے علاوہ سے تھا۔

حالی کی بدقسمتی تھی کہ ان کی ولادت کے بعد ان کی والدہ کا دماغ مختل ہو گیا تھا اور والد کا انتقال اس وقت ہو گیا جب وہ صرف نو سال کے تھے۔

حالی کو باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع میسر نہ آیا حالانکہ ان کے دل میں تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ حد سے زیادہ تھا۔ ایک بزرگ سید جعفرعلی سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اور ان کے ہی زیر سایہ فارسی زبان وادب کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہے۔ پھر عربی پڑھی۔ ایک امام مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری سے صرف ونحو پڑھی۔ لیکن معاشی مجبوریوں کے تحت انھیں صرف سترہ برس کی عمر میں تلاش معاش کے لئے گھر سے نکلنا پڑا۔ لیکن ذہن نے ساتھ نہ دیا اور دلی آکر بھی انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی بجائے وہی عربی فارسی سے واسطہ پڑا۔ وہاں انھوں نے مولوی نوازش علی سے عربی فارسی کی مزید تعلیم حاصل کی۔ وہ ڈیڑھ برس وہاں رہ کر پھر ۱۸۵۵ء میں پانی پت لوٹ آئے لیکن معاشی پریشانیاں لاحق تھیں۔ ۱۸۵۶ء میں حصار میں قلیل تنخواہ پر صاحب کلکٹر کے دفتر میں ملازمت مل گئی لیکن حالات ناسازگار ہونے کے سبب سال بھر بعد پھر پانی پت واپس آگئے۔ ان کے چار برس پانی پت میں بیکاری کے گزرے لیکن اس عرصے مولوی عبدالرحمٰن، مولوی محبّ اللہ اور مولوی قلندرعلی سے کسی ترتیب ونظام کے بغیر منطق، فلسفہ، حدیث اور تفسیر پڑھتے رہے۔ علم وادب کی کتابوں سے شغف پیدا ہوا۔ شرح ولغات کا مطالعہ برابر جاری رکھا۔ اب ان کے اندر اتنی صلاحیت پیدا ہوگئی تھی کہ کبھی کبھی عربی نظم اور نثر بھی لکھ لیا کرتے تھے۔

ان کا اکثر دلی جانا ہوتا تھا جہاں وہ مرزا اسداللہ غالب کی خدمت میں حاضری دیتے تھے۔ غالب سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ غالب انھیں بے حد عزیز بھی رکھتے تھے۔ حالی سے ایک بار انھوں نے کہا ”اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کروگے۔“

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد کئی برس تک بیکار رہنے کے بعد ایک بار پھر تلاش معاش میں گھر سے نکلے اور اس بار حسن اتفاق سے ۱۸۶۳ء میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے جو رئیس دہلی وتعلقہ دار جہانگیرآباد ضلع بلند شہر تھے، ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے حالی کو بطور مصاحبت اپنے ساتھ رکھا۔ شیفتہ کے انتقال کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازمت مل گئی جہاں انھیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ شدہ تحریروں کی عبارتیں درست کرنے کا کام مل گیا۔ یہاں سے انھیں انگریزی زبان بھی تھوڑی بہت شدبد ہوئی اور فارسی عربی اور اردو کے ساتھ اس زبان سے بھی تعلق پڑا۔

حالی کی زندگی پر سرسید کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ حالی صرف سرسید کے ہمنوا اور ہم قدم نہ تھے بلکہ ان کے حلقۂ احباب میں حالی کا ایک خاص مقام تھا۔ ۱۸۹۱ء میں علی گڑھ کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے سرسید نے حالی کے تعلق سے کہا تھا۔

”ہم کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے اور فخر کرنا چاہیے کہ ہماری قوم میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا۔ آئندہ زمانہ میں جب کہا جاوے گا کہ فخر قوم، فخر شعرا، فخر علما، اور زندہ کرنے والا اور راہ بتانے والا اندرونی جذبات کا اور اس سے نجات دلانے والا قوم کا کون ہے تو کہا جاوے گا کہ حالی۔“ (بحوالہ یادگار حالی، صفحہ ۱۰۳)

حالی نے نثر میں کئی کتابیں لکھیں، کئی مضامین لکھے، عربی، فارسی اور اردو میں شاعری کی۔ لیکن آہستہ آہستہ پوری توجہ اردو زبان وادب کی جانب مبذول ہوئی اور قارئین کا ایک ایسا بڑا حلقہ پیدا کیا جو زبان وادب کا صاف ستھرا ذوق اور فہم رکھتا تھا۔ حالی کے سیاسی، سماجی، ادبی اور تحقیقی شعور وادراک کو اس ہندوستان کے آئینے میں دیکھنا چاہیے جو انیسویں صدی کے وسط میں تھا۔ مولانا

حالی کو ۱۹۰۴ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا تھا۔

دنیاوی جاہ و جلال اور نمود و نمائش سے بے نیاز حالی ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو اپنے وطن پانی پت میں انتقال فرما گئے۔

8.3.2 حالی کی تصنیفات:

الطاف حسین حالی کی نثری تصانیف کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ ''تریاق مسموم'' ۱۸۶۷ء

۲۔ ''طبقات الارض'' ترجمہ: پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۸۶۸ء

۳۔ ''اصول فارسی'' ۱۸۶۸ء

۴۔ ''مولود شریف'' ۱۸۷۰ء

۵۔ ''تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے'' ۱۸۷۲ء

۶۔ ''شواہد الالہام'' سن ندارد

۷۔ مجالس النساء۔ دو حصے ۱۸۵۸ء

۸۔ سوانح عمری حکم ناصر خسرو۔ ۱۸۸۲

۹۔ حیات سعدی۔ ۱۸۸۲ء

۱۰۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ ۱۸۹۳ء

۱۱۔ یادگار غالب۔ ۱۸۹۷ء

۱۲۔ حیات جاوید۔ ۱۹۰۱ء

۱۳۔ سوانح عمری مولانا عبدالرحمٰن۔ سن ندارد

ان نثری کتابوں کے علاوہ ان کے مضامین کا مجموعہ ''مضامین حالی'' کے نام ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا۔ مزید مضامین ''مقالات حالی'' کے نام سے دو حصوں میں شائع ہوئے۔ حالی نے اپنے معاصرین کو جو خطوط لکھے تھے وہ ''مکتوبات حالی'' کے نام سے ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔ علاوہ ازیں ان کی شاعری کے کئی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ''مسدس حالی'' اردو شاعری کی معرکہ آرا کتاب ہے۔ حالی کی تمام کتابوں کے متعدد اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

8.3.3 حالی کے اہم تحقیقی کارنامے۔ اوصاف و امتیازات

اردو زبان و ادب میں شاعری کو شروع سے فوقیت حاصل رہی ہے۔ نثر کی طرف ادباء و شعراء کی توجہ نہیں کے برابر رہی۔ البتہ مذہبی رسائل اور کتابچے نثر میں نظر آ جاتے تھے۔ تحقیق کا میدان تو بالکل خالی تھا۔ تحقیق کی سب سے پہلی مثال مولانا الطاف حسین حالی نے پیش کی۔ انھوں نے تین سوانح عمریاں لکھیں جو بے حد مقبول ہوئیں۔ ان تین سوانح عمریوں کے علاوہ دو اور سوانح

عمریاں سوانح عمر حکیم ناصر خسرو(۱۸۸۲ء)اور سوانح عمرہ مولانا عبدالرحمٰن (سن ندارد) موجود ہیں لیکن اِن کو زیادہ شہرت نہ مل سکی۔

ان کی لکھی ہوئی تین سوانح عمریاں حیات سعدی (۱۸۸۲ء)، یادگار غالب (۱۸۹۷ء)، حیات جاوید (۱۹۰۱ء) تحقیقی کارناموں میں اہمیت کا درجہ رکھتی ہیں۔

''حیات سعدی'' اردو کی پہلی ایسی تحقیقی تصنیف ہے جس میں تحقیق، جامعیت، حسن ترتیب کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ سعدی شیرازی کا نام برصغیر ہی نہیں پوری دنیا میں (اب تو مختلف زبانوں میں ترجمے کی صورت) مشہور ہے۔ ان کی دو کتابیں گلستاں اور بوستاں کی حکایتیں تو زبان زد عام و خاص ہوا کرتی تھیں۔ ان کے ان گنت اشعار اور مصرعے ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوا کرتے تھے۔ سعدی جیسی عالمگیر شخصیت کی سوانح عمری لکھتے وقت حالی نے ہر ممکن ذرائع سے حالات و کوائف جمع کئے۔ چونکہ حالی فارسی زبان سے خوب اچھی طرح واقف تھے اس لئے سعدی کے تعلق سے انھوں نے درجنوں کتابوں کی مدد سے تحقیق کے ذریعہ سعدی کی سوانح مرتب کی۔ سعدی کی تصانیف سے ان کے حالات زندگی کے متعلق جانکاری حاصل کی۔ اس کتاب میں حالی نے سعدی کے وطن شیراز کا ذکر قدرے اختصار سے کیا ہے جو اس کتاب کا ابتدائی حصہ ہے۔ پھر سعدی کے حالات پوری تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ سعدی کے لئے انھوں نے احتراماً شیخ کا لفظ ہر جگہ استعمال کیا ہے اور ان کی قدر و منزلت کے تعین میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ سعدی کے حالات کے بعد ان کی تصانیف پر بھرپور روشنی ڈالی ہے اور کم و بیش ہر تصنیف کا جائزہ بڑے ہی منصفانہ اور مہذبانہ طریقے سے لیا ہے۔ اس سوانح میں صرف سعدی کا ذکر ہی نہیں بلکہ فارس (ایران) کی پوری تاریخ کے ساتھ شہر شیراز کا ذکر بڑے ہی تحقیقی انداز میں کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے ہر ورق بلکہ سطر سے حالی کی تحقیقی عرق ریزی نمایاں ہے۔ انھوں نے شیراز کے متعلق سے لکھا ہے:

> ''شیراز جو کہ صدہا سال ایران کا پایۂ تخت رہا ہے۔ مسلمان ایرانیوں نے جس طرح قُم کو ''دارالمومنین'' اور یزد کو ''درالعُبّاد'' کا خطاب دیا۔ اسی طرح شیراز کو ''دارالعلم'' کے لقب سے ملقب کیا ہے۔''

اس کتاب کی تحقیقی حیثیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے جب حالی کہتے ہیں کہ شیراز کے اکثر مشائخ اور علماء و شعراء پاکیزہ طبع اور لطیف و ظریف ہوئے ہیں۔ شیخ (یعنی شیخ سعدی) نے بھی بوستاں کے دیباچے میں اہل شیراز کو ان تمام اشخاص پر ترجیح دی ہے جن سے وہ حالت سفر میں ملا تھا۔ وہ اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ شیخ کی بے نظیر شہرت اور مقبولیت سے ثابت ہے کہ شیخ کا وجود بھی شیراز کے لئے کچھ کم باعث افتخار نہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی نے سعدی کے تعلق سے جتنا کچھ اردو زبان میں تحقیقی معیار و اعتبار کے لحاظ سے تحریر کر دیا اس کے آگے پھر کچھ زیادہ نہ لکھا جا سکا۔ 'حیات سعدی' کی ترتیب سے اردو سانح اور اسلوب میں ایک نیا انداز فکر ونظر کے ساتھ تحقیقی رویہ سامنے آیا ہے اور بے تکلف سادہ نثر میں اضافہ ہوا ہے۔ حاؔلی کا یہ تحقیقی کارنامہ ناقابل فراموش ہے۔

حالی کی دوسری اہم تحقیقی کتاب ''یادگار غالب'' ہے جو ۱۸۹۷ میں نامی پریس، کانپور سے شائع ہوئی۔ گو کہ یہ بھی سوانح

عمری ہے لیکن اس کتاب سے غالب کی زندگی اور ان کے کلام کو پورے طور پر سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔''یادگار غالب'' نفسیاتی الجھنوں اور ذہنی پریشانیوں کی داستان بھی ہے۔غالب کی پوری زندگی کرب وآزار اور کشمکش میں گزری جس کے شاہد حالی رہے تھے۔انھوں نے اس کے پہلے حصے میں غالب کے حالات زندگی اور دوسرے حصے میں غالب کے کمالات نظم ونثر کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔جس عرق ریزی سے انھوں نے سوانح کی ترتیب میں تحقیقی طریقۂ کار کو اپنایا ہے وہ حالی کا ہی حصہ کہا جا سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ غالب کے کلام کی بلندی کا اصل احساس''یادگار غالب'' نے ہی دلایا۔اردو شاعری کے پڑھنے والے غالب سے واقف تو تھے لیکن ان کی عظمت ورفعت کا ان میں اندازہ اس وقت ہوا جب حالی کی یہ کتاب سامنے آئی۔اسی کتاب کی بنیاد پر بعد کے غالب کے شارحین نے وہ قصر فلک بوس تعمیر کئے جو آج ہمارے سامنے ہیں۔

چونکہ حالی اپنے وطن پانی پت سے دہلی جایا کرتے تھے اور غالب سے ان کی صرف ملاقات ہی نہیں تھی بلکہ ان کے علم وفضل سے استفادہ بھی کرتے تھے، حالی نے حق شاگردی ادا کیا ہو یا نہ ہو لیکن اکثر ملاقاتوں میں جو وقوعات سامنے آئے، ان کا ذکر بڑے ہی دلچسپ اور مستند انداز سے انھوں نے کیا ہے۔اس سوانح میں تصنع اور لغو کا کہیں بھی گزر نہیں۔غالب کے حالات مختصر طور پر محمد حسین آزاد کی کتاب''آب حیات'' میں ملتے تو ہیں لیکن تشنہ ہیں۔حالی نے یہ کتاب یہ سوچ کر لکھی کہ غالب جیسی بے نظیر ہستی اور عبقری شخصیت کی یادگار ہمیشہ کے لئے محفوظ رہ سکے۔حالی نے وہ زمانہ دیکھا تھا جب ۱۸۵۷ء میں قیامت صغری برپا ہوئی۔اس زمانے میں حالی دہلی میں قیام پذیر تھے۔ان حالات کا آنکھوں دیکھا حال اور اس کے ساتھ غالب اور دوسرے معاصرین کے ساتھ ابتری کی کیفیات، حالی کی اس سوانح عمری سے واضح ہیں۔حالی نے غالب کی سوانح عمری لکھی لیکن اس میں اپنے ان تمام معاصرین کا بھی ذکر کیا ہے جن سے ان کے مراسم تھے، ایسے معاصرین جو انیسویں صدی کے سب سے نمایاں افراد کہے جا سکتے ہیں۔

غالب کی شاعرانہ خوبیوں کو حالی نے بڑے ہی منصفانہ طریقے سے واضح کیا ہے۔انھوں نے متوازن اور معتدل راہ اپنائی اور غالب کی شاعرانہ خصوصیات کو بڑے ہی تحقیقی اور لسانی پیرایۂ اظہار میں واضح کیا۔تجزیہ وتشریح کی بے مثال قابلیت کا ثبوت اس کتاب میں ملتا ہے۔یہی سبب ہے اہم ناقدین کا یہ متفقہ ماننا ہے کہ حالی نے یادگار غالب جیسی کتاب لکھ کر غالب کے صحیح مقام کا تعین کیا ورنہ غالب بھی زمانہ برد ہوگئے ہوتے۔حالی سے غالب کا موازنہ فارسی کے بعض شعراء سے بھی کیا، ان کا کہنا ہے کہ خسرو اور فیضی کے بعد غالب جیسی ادبی قابلیت اور جامع صفات شخصیت ہندوستان میں پیدا نہ ہوسکی۔

حالی نے غالب کے فن اور ادبی کمالات کو پہچاننے کی پوری کوشش کی۔اس سے حالی کے ادبی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ حالانکہ غالب کے متعدد شاگرد تھے لیکن حالی کی ذہنی فراست نے ان کی صلاحیتوں کو جانچا، پرکھا، ان کے شب وروز کے حالات سے واقفیت حاصل کی، ان کی زندگی کے نشیب وفراز سے باخبر رہ کر ان کا بھرپور مشاہدہ کیا۔۔غرض حالی نے غالب کو پورے طور پر جانا اور سمجھا۔غالب کی شہرت ومقبولیت میں''یادگار غالب'' کا معتد بہ حصہ ہے۔''یادگار غالب'' لکھ کر حالی نے غالب کی نثر ونظم کو ادبی حلقوں سے روشناس کرایا۔ان کے کلام کی تشریح کر کے ان کے ادبی قد کو صحیح مقام عطا کیا۔یہ اردو زبان کی خوش قسمتی ہے کہ غالب کو حالی جیسا سوانح نگار، محقق اور نقاد نصیب ہوا۔

حالی نے تحقیق کے میدان میں جو کارنامے انجام دیے ہیں اس کی سب سے عمدہ مثال ''حیات جاوید'' ہے۔ حالی کی لکھی ہوئی یہ تیسری سوانح عمری ہے لیکن اس کی حیثیت ان معنوں میں بنیادی ہے کہ اس میں سرسید احمد خان کی شخصیت کو بڑے واشگاف انداز سے پیش کیا ہے۔ حالی کی زندگی میں وہ سال ایک انقلاب انگیز سال تھا جب انھوں نے نواب مصطفیٰ خان کے ہمراہ پہلی دفعہ سرسید سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت حالی کی عمر تقریباً چالیس برس رہی ہوگی۔

ایک ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ''حیات جاوید'' ۱۹۰۱ء میں سرسید کے انتقال کے بعد نامی پریس، کانپور سے شائع ہوئی۔ وہ اس کتاب کو لکھنے میں کئی سال گزار دیے اور سرسید کی زندگی میں پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا سکے جس کا ان کو بڑا قلق تھا۔ حالی کو اس کتاب کی ترتیب میں جن مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہ ان کی پہلے کی تحریر کردہ دونوں سوانح عمریوں سے قطعی مختلف تھے لیکن سرسید سے بیکراں عقیدت اور ان کی جادوئی شخصیت کے آگے وہ سرنگوں ہو گئے۔ ''حیات جاوید'' صرف سرسید کا زندگی نامہ نہیں بلکہ انیسویں صدی کی تمدنی، تہذیبی، سیاسی، ادبی اور تعلیمی زندگی کی تاریخ ہے۔ سرسید احمد خان انیسویں صدی کے سب سے بڑے مجدد تھے، ایک ایسی جامع اوصاف شخصیت جن کی زندگی گوناگوں مشاغل، مسائل اور ہنگاموں کا مرکز اور ہزارہا عزائم ومہمات کا منبع رہی ہے۔ سرسید کا اپنے زمانے سے نبرد آزما ہونا خود ایک بڑا مسئلہ تھا۔ ایسے عہد میں جب قوم آمادۂ تنزل تھی اور تعصّبات عام تھے۔ انگریزی تعلیم کی چاروں طرف مخالفت کی جا رہی تھی۔ ترقی تہذیب وتمدن کو کفر والحاد سے تعبیر کیا جانے لگا تھا۔ ایسے پرآشوب حالات میں سرسید نے قوم کی اصلاح اور اس کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے، اس کی عظمت کو صحیح مقام دلانے کے لئے کمر باندھی۔ حالی کو اس کا اعتراف تھا کہ مسلمانوں کی رہنمائی اور اصلاح کا جو حق سرسید نے ادا کیا ہے اور جس طرح اپنی پوری زندگی کو قومی خدمت کے لئے وقف کر دیا ہے وہ ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہی نہیں، ایک عہد کی صداقت ہے۔ حالؔی نے ''حیات جاوید'' لکھ کر ایسی شخصیت کا اعتراف کیا ہے جو اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے ہشت پہل تھی۔ مذہب، معاشرت، تعلیم، سیاست، ادب، تنقید معاشرت، سماجی مسائل، غرض حیات انسانی کا کوئی ایسا پہلو نہ تھا جو سرسید کی نظروں سے مخفی ہو۔ ایسے شخص کے حالات کو قلم بند کرنا جس کی حیثیت دریائے بے پایاں کی طرح ہو۔ ان پر لکھنا حالؔی کا ایسا تحقیقی کارنامہ ہے جسے کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔

''حیات جاوید'' کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں سرسید کی زندگی، حالات اور کارنامے تاریخی ترتیب کے مطابق دیے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں سرسید کے کارناموں کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔

حالی نے ''حیات جاوید'' کے دیباچے میں لکھا ہے:

> ''ہم کو اس کتاب میں اس شخص کا حال لکھا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا۔ تقلید کی جڑ کاٹی ہے۔ بڑے بڑے علمائے مفسرین کو للتاڑا ہے۔ اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے۔ قوم کو پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور ان کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں۔ جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا تو دوسرے نے زندیق کا خطاب دیا۔''

''حیات جاوید'' ایسے زمانے کی سوانح عمری ہے جس زمانے میں اردو جیسی زبان سے یہ توقع رکھنا کہ اس میں اعلیٰ درجے کی سوانح عمری ہوگی، ایک بے بنیاد توقع رہی ہوگی۔ خود فارسی کی ہزار سالہ ادبیات میں ایسی کوئی مکمل سوانح عمری موجود نہیں جو جدید اصول سیرت نگاری کے معیار پر پوری اترے، ایسی صورت میں حآلی کا کارنامہ اس لئے اہم ہے کہ اس میں سوانح کے ساتھ، تحقیق، تنقید، تجزیہ، ادبی کلامیہ سب شامل ہیں۔ سرسید کی اندرونی و بیرونی زندگی اور خارجی واقعات کے بیان وامتزاج سے یہ سوانح عمری ایک پوری صدی کی تاریخ بن گئی ہے۔ سرسید کی سب سے بڑی عظمت ہے کہ انھوں نے مسلمان قوم کو تذبذب کے تصور سے نکالا ان کی منزل کا تعین کیا اور انھیں ایک ایسے راستے پر لگا دیا جو خوشحالی اور بلندی ترقی کو جاتا تھا۔ 'حیات جاوید کا مرکزی خیال یہی تصور ہے اور حالی کی تمام سلیقہ مندی اور صلاحیت اسی محور کے گرد گھومتی ہے۔ سرسید کے زمانے کی معاشرت، رسوم ورواج اور اوضاع واطوار زندگی، تعلیمی واقعات، شرفا سوسائٹی کے قصے، ان سب کے بیان نے سوانح عمری 'حیات جاوید' کو اس صدی کا اہم استعارہ بنا کر جاودانی عطا کر دی۔

''مقدمہ شعر وشاعری'' دراصل الطاف حسین حالی کا اپنے دیوان کے شروع میں لکھے گئے دیباچے کا حصہ رہا ہے جو طویل سے طویل تر ہوتا گیا اور طویل مقدمہ کی شکل اختیار کر گیا جس کو بعد میں کتابی شکل دے کر اس کا نام ''مقدمہ شعر وشاعری'' رکھ دیا گیا۔ اس کتاب کو ۱۸۹۳ میں نامی پریس، کانپور نے شائع کیا۔ چونکہ اردو میں پہلی بار تنقیدی مسائل سے سوال و جواب کا سلسلہ وجود میں آیا تھا اس لئے ''مقدمہ شعر وشاعری'' اردو تنقید میں خشت اول کی حیثیت رکھتا ہے حالانکہ اس میں تحقیقی عناصر بھی شامل ہیں نیز اردو شاعری کا تجزیاتی اور تحقیقی مطالعہ بھی ہے۔ مقدمہ کے پہلے حصے میں شعر کا تاثر، ماہیت یعنی شاعری اور اس کے لوازم سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں شعری اصناف میں غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی کو موضوع گفتگو بنا کر ایک نئے انداز فکر ونظر کے ساتھ ناقدانہ اور محققانہ تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان کا اسلوب بیان تمام معاصرین سے افضل تر کہا جا سکتا ہے۔۔ ''مقدمہ شعر و شاعری'' اردو شاعری کا ایسا اعلامیہ ہے جس نے جدید اردو تنقید کو جنم دیا۔ حالی نے اپنے تحقیقی اور تنقیدی انداز نظر کے مطابق شعر کی جو خوبیاں بیان کی ہیں وہ اصل سے بے حد قریب ہیں۔ سادگی، اصلیت اور جوش، ان تینوں اجزاء کی شاعری میں ضرورت پر زور دیتے ہوئے ان کی اہمیت کو سمجھایا ہے۔ آل احمد سرور کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ غزل کے خلاف حالی نے بڑے بڑے اعتراضات کئے ہیں مگر دراصل ان کا اعتراض لکھنؤ اسکول پر رہا ہے جس نے شاعری کو غزل میں غزل کو رعایت لفظی اور نازک خیالی میں محدود کر دیا۔ انھوں نے قدماء کی اس لئے تعریف کی ہے وہ الفاظ کے طلسم سے نہیں بلکہ دل کی بات سنا کر انسان کو مسحور کرتے ہیں۔

حآلی نے اپنے تحقیقی وتنقیدی انداز نظر سے اردو شاعری کو پرکھنے کی بھرپور کوشش کی وہ شاعری کو شخصی اور صنعتی کوچوں سے نکال کر زندگی سے قریب کرنے کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک فرد کی ذات کی بھی اہمیت تھی لیکن اس کے ساتھ زندگی کی صداقتوں کے اظہار کو بھی لازمی قرار دیا۔ ''مقدمہ شعر وشاعری'' صرف تنقید کی ہی نہیں، اردو کی لسانی وادبی تحقیق کا ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ جس میں لسانی مسائل سے بھی بحث کی گئی ہے۔ اردو زبان اور ہندی بھاشا کے تنازعات پر بھی کھل کر بات کی گئی ہے۔ اردو زبان وادب کی ترقی کے لئے حالی نے کارآمد اور مفید مشورے بھی دیے ہیں۔ حالی نے صحت تلفظ، متروک الفاظ اور مقامی اثرات کی بحثوں کو

چھیڑا ہے۔غرض یہ کتاب نہ صرف تنقیدی سرمایہ ہے بلکہ تحقیق کے بعض اہم گوشوں پر بھی گفتگو کرنے کے راستے وا کرتی ہے۔فراق گورکھپوری نے تو مقدمہ شعروشاعری کوارسطو کی بوطیقا کے ہم پلّہ ٹھہرایا ہے۔

''مقدمہ شعروشاعری'' کوحالی کی تنقیدی وتحقیقی بصیرت کا مظہر ہونے کے ساتھ ساتھ جدید اردو تنقید کا منشور سمجھنا چاہئے جس کی بدولت اردو تنقیدی بصیرت ، فہم وادراک ،شعور ووجدان کے لئے راہیں ہموار ہوئیں اور زبان وادب کا سچا شعور بیدار ہوا۔

8.4 علامہ شبلی نعمانی: شخصیت اور تحقیقی کارنامے

8.4.1 شبلی کے سوانحی کوائف اور حالات زندگی

محمد شبلی نام ،نعمانی لقب اور راجپوت نسل سے تعلق تھا۔شبلی نعمانی کی پیدائش ضلع اعظم گڑھ کے موضع بندول میں ۴ جون ۱۸۵۷ءکو ہوئی تھی ۔ ۱۸۵۷ء ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم سال کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے والد شیخ حبیب اللہ کے زیر سایہ پرورش پائی۔ شک صاحب ایک کھاتے پیتے زمیندار، کامیاب وکیل اور تجارت پیشہ رئیس تھے۔۔شبلی نعمانی نے ابتدائی تعلیم ۱۸۶۳ء یعنی چھ سال کی عمر سے شروع کی ۔ان کے معلموں میں حکیم عبداللہ اور مولوی شکراللہ کے نام بڑے اہم ہیں۔۱۸۷۳ء میں شبلی نعمانی کو مدرسہ چشمۂ رحمت، غازی پور بھیجا گیا جہاں انھیں مولانا فاروق چریا کوٹی کی شاگردی نصیب ہوئی۔۱۸۷۴ء میں مزید تعلیم کی غرض سے رام پور روانہ ہوگئے جہاں انھوں نے مولانا ارشاد حسین سے فقہ اور اصول فقہ کا درس لیا۔اسی برس لاہور گئے جہاں فیض الحسن سہارنپوری سے عربی ادب کی تعلیم حاصل کی۔ جب لاہور سے ایک سال کے اندر واپس ہوئے تو صرف ایک ماہ کے لئے دارالعلوم دیوبند گئے۔ایک ماہ تمام کیا اور وہاں کے کتب خانے سے استفادہ کیا۔ ۱۸۷۶ء میں سہارنپور کے لئے روانہ ہوئے۔ جہاں مولانا احمد علی محدث سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔علم وفضل میں ذہن نہایت چست اور خلاقانہ تھا اور دین سے گہرا لگاؤ۔یہی سبب ہے کہ اسی برس یعنی صرف ۱۹ برس کی عمر میں حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔ مدینہ منورہ پہنچ کر وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کیا۔

۱۸۷۷ء میں جب روس نے ترکی پر حملہ کیا تھا جس سے عالم اسلام میں سکتے کی حالت میں تھا۔مولانا شبلی نعمانی نے ترکوں کی ہمدردی اور معاونت کی غرض سے تین ہزار روپئے اکٹھا کئے اور ترکی کے دارالخلافہ قسطنطنیہ کا سفر کیا۔۱۸۷۸ء میں اعظم گڑھ میں نجی طور پر درس وتدریس کا فریضہ انجام دیتے رہے۔۱۸۸۰ء میں وکالت کا امتحان دیا اور کامیابی حاصل کی اور اگلے سال سے وکالت کا شغل اختیار کیا۔اسی دوران وہ سرسید احمد خاں سے ملنے علی گڑھ گئے جہاں انھوں نے ان کی شان میں ایک عربی قصیدہ پیش کیا۔ ۱۸۸۲ء میں قائم مقام قرق امین کے عہدے پر چند مہینوں کے لئے ملازمت کی لیکن دل نہ لگا تو وکالت کی غرض سے شہر بستی چلے گئے ۔ وکالت کا پیشہ ان کے مزاج کے مطابق نہ ہونے کے سبب اسے خیر باد کہا اور جنوری ۱۸۸۳ء میں ان کی علی گڑھ کے ایم اے او کالج میں عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے تقرری ہوئی۔ اپنے وطن سے انھیں شدید محبت تھی یہی وجہ ہے کہ ۲۰ جون ۱۸۸۳ء کو اعظم گڑھ میں نیشنل اسکول کی بنیاد رکھی جو اب شبلی نیشنل پی جی کالج کے نام سے ایک اہم تعلیمی ادارہ کی حیثیت سے مشہور ہے۔

انھوں نے اپنے آبائی وطن موضع بندول میں بھی ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی تھی۔اسی عرصے ان کی ملاقات پروفیسر آرنلڈ سے ہوئی جن سے شبلی نے فرنچ زبان سیکھی ،مغربی اور جدید علوم وتحقیقات کی واقفیت حاصل کی جس کے عوض آرلنڈ کو انھوں نے عربی پڑھائی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ان کے روابط اکبرالہ آبادی سے پیدا ہوئے اور دونوں میں دوستی ہوئی۔ایم اے او کالج میں جن مشاہیر کو شبلی سے شرف تلمذ حاصل ہوا ان میں مولانا شوکت علی،مولانا محمد علی جوہر،مولانا ظفر علی خان،سید سجاد حیدر یلدرم اور شیخ محمد عبداللہ معروف بہ پاپا میاں وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔سرسید سے ان کے تعلقات بڑے گہرے تھے اور زیادہ تر سفر سرسید کے ساتھ رہتے۔ ۱۸۹۰ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے الہ آباد تشریف لائے اور یہاں لوگوں سے خطاب کیا۔۲۶ اپریل ۱۸۹۲ میں وہ تاریخ اسلام کی نادر ونایاب کتابوں کی تلاش وتحقیق کی غرض سے روم ومصر وشام کے سفر پر روانہ ہوئے۔۷ مئی کو عدن اور ۲۳ مئی کو قسطنطنیہ پہنچے۔ترکی ادباء وشعراء سے ملاقاتیں کیں۔غازی عثمان پاشا شیخ ظاہر مغربی جیسی شخصیتوں سے ملاقات اور وہاں کے اسٹوڈنٹ یونین کی جانب سے استقبالیہ تقریب میں شرکت کی۔خلافت عثمانیہ نے انھیں ۱۸ اگست کو ''تمغۂ مجیدیہ'' سے سرفراز کیا۔اپنے قیام کے دوران وہ جولائی میں بیروت،اگست میں بیت المقدس اور اکتوبر میں قاہرہ پہنچے۔قاہرہ میں جامعہ ازہر کا معائنہ کیا۔۱۸۹۲ء کا پورا سال ان کی علمی وادبی سرگرمیوں اور سیر وسفر میں گزرا۔ پھر نومبر میں علی گڑھ واپس آئے۔۱۸۹۴ء میں حکومت نے ان کو ''شمس العلماء'' کے خطاب سے نوازا۔ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید احمد خان کا انتقال ہوا۔جس سے وہ حد درجہ غمگین ہوئے اور مئی میں علی گڑھ کی ملازمت سے مستعفی ہوکر جون میں اعظم گڑھ آ گئے اور شبلی منزل میں قیام کیا۔ یہی شبلی منزل اب دارالمصنفین ہے۔انھیں صحافت سے بھی دلچسپی تھی اور مضامین لکھنے کا سلسلہ تو چل ہی رہا تھا۔تصنیفی وتالیفی کام تو بدستور جاری تھا۔ ۱۹۰۱ میں حیرآباد پہنچے اور ناظم محکمہ تعلیم مقرر ہوئے۔۱۹۰۳ میں انجمن ترقی اردو کے پہلے سکریٹری کا عہدہ سنبھالا۔ ۱۹۰۴ء میں مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کے ساتھ ماہنامہ ''الندوہ'' شائع کرنا شروع کیا۔جس کا پہلا شمارہ اگست میں آیا۔ بعد میں مولانا ابوالکلام آزاد کو مدیر تعاون کے طور پر شامل کیا۔اس طرح کئی اور اہم نام اس میں شامل ہوئے۔ ۱۹۰۵ میں ندوہ کے معتمد مقرر ہوئے۔شبلی نعمانی کی بدولت ندوۃ العلما نے بہت سے مفید کام کیے۔ لیکن جولائی ۱۹۱۳ میں یہاں سے ان کا جی اوب گیا اور وہ واپس اعظم گڑھ آ گئے شبلی نعمانی کی پوری زندگی علمی،تحقیقی اور تاریخی کاموں میں گزری۔ان کا انتقال ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ کو ہوا اور شبلی منزل ،اعظم گڑھ کے ایک گوشے میں سپرد خاک کیے گئے۔

8.4.2 شبلی کی تصنیفات

۱۔ المامون۔ایم اے او کالج،علی گڑھ۔۱۸۸۷ء

۲۔ سیرۃ النعمان۔ پہلا حصہ ۱۸۹۳/۱۸۸۹ (امام ابوحنیفہؒ کی سوانح عمری) مطبع مفید عام،آگرہ

۳۔ الفاروق۔جنوری ۱۸۹۸ء

۴۔ الغزالی۔اگست ۱۹۰۲ء۔مطبع نامی،کانپور

۵۔ علم الکلام۔۱۹۰۳ء۔ مطبع مفید عام، آگرہ

۶۔ الکلام۔۱۹۰۴ء

۷۔ سوانح مولانا روم۔۴/۱۹۰۵ء

۸۔ موازنہ انیس و دبیر۔۱۹۰۷ء

۹۔ شعر العجم (پہلا حصہ)۱۹۰۸ء

شعر العجم (دوسرا حصہ)۱۹۰۹ء

شعر العجم (تیسرا حصہ)۱۹۰۹ء

شعر العجم (چوتھا حصہ)۱۹۱۲ء

شعر العجم (پانچواں حصہ)۱۹۱۸ء

۱۰۔ سیرۃ النبیؐ۔ چھ جلدیں

۱۱۔ سفرنامہ روم ومصر وایران

8.4.3 شبلی کے تحقیقی کارنامے۔اوصاف وامتیازات

علامہ شبلی نعمانی جن کی پوری تعلیم پرانے مکتبی انداز میں ہوئی تھی جن کو مغربی زبانوں کی کچھ یوں ہی برائے نام شُد بدتھی، اردو زبان وادب میں تحقیقی ذوق اور تجسس پیدا کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوئے۔ انھوں نے تحقیق کے میدان میں دیرپا اثرات چھوڑے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ علی گڑھ کے قیام اور سرسید احمد خان کی صحبت کا فیضان تھا کہ علمی کاموں سے بے پایاں شیفتگی پیدا ہوئی۔ حالی کی طرح انھوں نے بھی چند سوانح عمریاں لکھیں لیکن ان کے علاوہ انھوں نے تذکرہ نویسی اور تحقیقی مقالات کے ذریعہ قابل قدر ادبی، تحقیقی، تصنیفی اور تالیفی کام انجام دیے۔

شبلی کے تحقیقی کام کی بہترین مثال ان کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں ہیں۔ المامون (۱۸۸۷)، سیرۃ النعمان (۱۸۹۳۔۱۸۸۹)، الفارق (۱۸۹۸)، الغزالی (۱۹۰۲) سوانح مولانا روم (۱۹۰۵) اس کے علاوہ سیرۃ النبی ﷺ جیسی تحقیقی کتاب (جس کی آخری جلدان کے شاگرد رشید علامہ سید سلیمان ندوی نے مکمل کی) یہ سب وہ کتابیں ہیں جن میں شبلی کی بے پناہ ادبی تحقیقی اور خلاقانہ صلاحتیں نمایاں ہیں۔

''المامون''، شبلی نعمانی کی پہلی تحقیقی تصنیف ہے جو مشہور عباسی خلیفہ مامون رشید کی سوانح عمری ہے۔ اس کا دیباچہ سرسید احمد خان نے لکھا ہے۔ کہنے کو تو یہ سوانح عمری ہے لیکن عہد عباسیہ کی تہذیبی، سماجی اور سیاسی زندگی کی یہ ایک مستند تاریخ ہے۔ اس کتاب کے دو حصے قائم کئے گئے ہیں جس میں پہلے حصے میں اسلام کی خلافت کے تعلق سے اپنے مفروضات رکھے گئے ہیں، پھر خاندان بنوامیّہ سے ہوتا ہوا یہ خاندان بنوعباس تک کیوں کر پہنچا؟ اور اس وقت کے ناگفتہ بہ حالات میں ہارون رشید کا ایک بیٹا قتل کیا جاتا ہے اور دوسرا بیٹا مامون خلیفۂ عہد پر مقرر کیا جاتا ہے۔ ان سب کی پوری تفصیل درج کتاب ہے۔ اس طرح دوسرے

حصے میں ملک کے انتظامی امور سے متعلق ضروری احوال کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔اسی حصے میں مامون رشید کی خانگی زندگی،اس کی رہائش اور مصروفیات،اس کے کردار وافعال کا بھی بھرپور بیان ملتا ہے۔ بیچ بیچ میں شبلی نعمانی اس عہد کی طرز معاشرت اور ملکی حالات پر بھی تبصرہ کرتے چلتے ہیں۔اس کتاب سے ایک عہد کی پوری سچائی،ایک شخص کی زندگی کی تمام صداقتیں سامنے آجاتی ہیں۔اس کتاب کی تیاری میں انھوں نے جس تحقیقی اندازنظر کو اپنایا ہے وہ ایک مشاق لکھاری کا ہی کارنامہ کہا جاسکتا ہے۔'المامون' زمانۂ علی گڑھ کی یادگار تصنیف ہے۔

شبلی نعمانی ایک ایسے عالم تھے جن کو تحقیق وتفتیش کا شوق جنون کی حد تک تھا۔انھوں نے اسلامی تاریخ کا وسیع مطالعہ کیا تھا۔عربی اور فارسی زبانوں سے بخوبی آشنا ہونے کا سبب صرف یہی تھا کہ وہ تاریخ کے اصل ماخذوں کا براہ راست مطالعہ کرتے تھے۔

''سیرۃ النعمان'' علامہ شبلی نعمانی کی ایسی تحقیقی کتاب ہے جو ان کے اپنے دینی مسلک اور نظریات کی ترجمانی کرنے والی ایک عبقری شخصیت امام ابوحنیفہ کی سوانح حیات ہے۔شبلی نعمانی فقہی جزئیات میں امام ابوحنیفہؒ کے پیروکار تھے۔ان سے انھیں شدید عقیدت تھی۔روحانی وباطنی شیفتگی کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ اپنے نام کے ساتھ نعمانی کی نسبت لگاتے ہیں۔شبلی نعمانی نے اس سوانح عمری کو دوحصوں میں تقسیم کیا ہے۔اس کا پہلا حصہ ۱۸۸۹ء میں اور دوسرا حصہ ۱۸۹۰ میں لکھا گیا تھا۔ پہلے حصے میں امام ابوحنیفہ کے حالات زندگی و پوری تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ان کے کردار کے فضائل اور خصوصیات کو بڑے ہی استغراق کے ساتھ پیش کیا ہے۔سوانح کی ترتیب میں انھوں نے توازن اور اعتدال سے کام لیا۔اس سے پہلے امام ابوحنیفہ پر اردو میں کوئی کتاب موجود نہ تھی یہ کام شبلی نعمانی نے بڑی تحقیق اور عرق ریزی سے کیا کہ ان کے احوال وآثار کو یکجا کردیا۔

دوسرے حصے میں شبلی نعمانی نے امام ابوحنیفہ کی طرز اجتہاد اور اصول استنباط سے بحث کرتے ہوئے علم العقائد،حدیث اور فقہ وغیرہ کی مدد سے ان کے علوم وافکار اور دوررس نظریاتی ممکنات کے تناظر میں ایک طویل جائزہ پیش کیا ہے۔اس کی ترتیب میں شبلی نعمانی کا مذہبی شعور اور علمی ہنرمندی نے پورا پورا ساتھ دیا۔شبلی نعمانی نے جو استدلالی رویہ اپنایا وہ فلسفۂ مذہب کی بنیاد پر قائم کیا ہوا رویہ نظر آتا ہے۔ان کا طریق استدلال اور طرز بیان مذاق وقت کی مناسبت سے میل کھاتا نظر آتا ہے حالانکہ مذہبیات میں حجت اور اختلافات کی کافی گنجائش ہوتی ہے لیکن شبلی نعمانی نے اس کی پرواہ کئے بغیر بڑی صاف گوئی سے امام ابوحنیفہ کے اجتہادی تعبیر و تشریح اور فقہ،حدیث کے تمام امور پر گفتگو کی ہے۔شبلی نعمانی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش بھی کی کہ امام ابوحنیفہ وہ پہلے محدث ہیں جنھوں نے تشریحی اور غیر تشریحی حدیثوں میں فرق اور امتیاز قائم کرکے مذہبی فکر ونظر کو ایک صحیح اور سچی راہ دکھائی۔اس کتاب کی تصنیف میں شبلی نعمانی اپنے ان علوم کو بروئے کار لا سکے جو انھوں نے عربی، فارسی، اور دوسری مغربی زبانوں بالخصوص فرانسیسی کتابوں میں مذہب، دین اسلام،حدیث اور دوسرے علوم اسلامیہ کے تعلق سے ڈھیر ساری معلومات حاصل کررکھی تھی۔اس کتاب سے ان کی علمی ومذہبی فضیلت کے ساتھ تحقیقی اندازنظر عیاں ہے۔

''الفاروق'' شبلی نعمانی کی وہ شہرۂ آفاق تصنیف ہے جس پر خود ان کو بہت ناز تھا۔ یہ کتاب ہندوستان کے کتب خانوں

اور مصر و شام و روم کے علمی خزانوں سے تحقیق و تفتیش کے بعد لکھی گئی۔ اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور کئی زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہوئے۔ شبلی نعمانی اپنی کتابوں کو عموماً دو یا اس سے زائد حصوں میں منقسم کرتے ہیں۔ یہ کتاب بھی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کے حالات زندگی اور سوانح کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی سوانح عمری کئی زبانوں میں لکھی گئی بالخصوص عربی، فارسی اور اردو میں لیکن شبلی نعمانی کی اس کتاب میں تحقیق و تفتیش، دلائل و براہین سے اتنا کام لیا گیا ہے کہ یہ کتاب سب کتابوں پر بھاری ہے۔ حالانکہ شبلی نعمانی نے زیادہ تفصیل پیش نہیں کی ہے لیکن اختصار میں جامعیت موجود ہے۔ حضرت عمرؓ کے قبول اسلام، جنگ احد میں ثابت قدمی، واقعہ قرطاس، مسقیفہ بن ساعدہ اور تمہید میں فن تاریخ اور اس کے اصول و معیار کے متعلق جو کچھ اختصار سے لکھا گیا ہے وہ عام مورخین اور مصنفین کی تحریروں سے اعلانیہ ممتاز نظر آتا ہے۔

دوسرے حصے میں تحقیق و تفتیش کا معیار بلندی پر ہے۔ انھوں نے سیکڑوں کتابوں سے تلاش و جستجو کے بعد تمام تر گوشوں کو جمع کر کے معلومات کا ایک اہم خزانہ فراہم کیا ہے۔ خصوصاً حضرت عمرؓ کی حکومت کے کارنامے اور ان کے تمام شعبہ جات کی خصوصیات، کارکردگی اور سرگرمیوں کو جس طرح نمایاں کیا ہے اس سے شبلی نعمانی کی خاص نکتہ سنجی، دقیقہ بینی، وسعت علم و مطالعہ اور مجتہدانہ ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے حضرت عمرؓ کے تعلق سے ایسی معلومات فراہم کی ہیں جو ان کے دوسرے سوانح نگاروں کی نظروں سے اوجھل تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے اعتراف کیا ہے کہ ''علامہ مصنف کو سب سے اول ان کی قوت دماغی اور جامعیت خیال پر آفرین کہنی چاہئے کہ انھوں نے فاروق اعظمؓ کی لائف کا ایسا وسیع اور جامع خاکہ اپنے ذہن میں قائم کیا یا بہ الفاظ دیگر ان کی عظمت کو اصلی ہیئت میں دیکھا، اس کے بعد مصنف کی تلاش و تجسس کی داد بینی چاہئے کہ جس قدر عنوان قائم کئے ان کو پوری نکتہ سنجی اور موشگافی کے ساتھ معمور کیا اور واقعات کی مدد سے ہر بحث کا حق ادا کر دیا۔''

شبلی نعمانی کی اس کتاب پر اعتراضات وارد ہوئے لیکن انھوں نے اس کا کوئی اثر نہ لیا کیونکہ ہر زمانے میں کتابیں لکھی جاتی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی، اعتراضات ہوتے رہیں گے لیکن مستند کام کرنے والے بہت ہی کم سامنے آئیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ''الفاروق'' ایک اہم اور مستند سوانح عمری ہے جس میں تحقیق کا حق پورے طور پر ادا کیا گیا ہے۔

''الغزالی'' مشہور فلسفی اور معلم اخلاق امام غزالیؒ کی سوانح عمری اور ان کے نظریات و افکار پر مشتمل ایک اہم کتاب ہے جسے شبلی نعمانی نے ۱۹۰۱ء میں تصنیف کی۔ امام غزالی کی یہ سوانح عمری شبلی کے سلسلہ کلامیہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ان کے کمالات میں فلسفہ کو بڑا دخل ہے اور ان کی ذہنی اور روحانی تکمیل میں تصوف کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کتاب کو لکھنے کی تحریک سر سید سے ان کو ۱۸۹۳ میں ملی تھی۔ اس کتاب کی تیاری میں امام غزالی کے حالاتِ زندگی انھیں وافر مقدار میں حاصل نہ ہو سکے تھے اس لئے ان کے تعلق سے سیر حاصل معلومات نہیں ملتی لیکن پھر بھی جو کچھ مواد انھوں نے تحقیق و تفتیش کر کے اکٹھا کیا تھا ان کو اختصار کے ساتھ پیش کیا جو تقریباً تیس صفحوں پر محیط ہے۔ امام غزالیؒ کی سوانح کے ساتھ ان کے فلسفیانہ افکار، مذہبی خیالات، اخلاقی درسیات اور دوسری سرگرمیوں کا ذکر بھی بڑے ہی معتبر حوالوں سے کیا ہے۔ شبلی نعمانی نے اصول تحقیق و تنقید کے مطابق امام غزالیؒ کی شخصیت اور ان کے روحانی، فکری، دینی افکار و خیالات کو دیانتداری کے ساتھ اہل نظر کے سامنے رکھ دیا۔ غلط

استنباط واستدلال کبھی بھی شبلی کا طرز اظہار نہیں رہا۔ یہی سبب ہے کہ ''الغزالی'' کو وہ مقبولیت ملی جو اس کے دوسرے سوانح نگاروں کو نہ مل سکی۔

''سوانح مولانا رومؒ'' شبلی نعمانی کا ایک ایسا تحقیقی کارنامہ ہے جسے پڑھ کر مولانا روم کے حالات زندگی اور ان کے کلام بالخصوص ان کی مثنوی کے تعلق سے کئی کارآمد معلومات حاصل ہوتی ہے۔ شبلی نعمانی نے اپنے زمانۂ قیام حیدرآباد میں یہ کتاب ۱۹۰۴ء تصنیف کی تھی لیکن اس کی اشاعت کی نوبت ۱۹۰۶ء میں آئی۔ اس کتاب سے شبلی نعمانی کے علمی شغف وانہماک کے ساتھ ان کے ذوقِ انتخاب کے معیار ومقدار کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب میں بھی تحقیق وجستجو کی چھاپ پورے طور پر دکھائی پڑتی ہے۔ مثنوی مولانا رومؒ کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ اور اپنی ادبی وعلمی لیاقت کو متوازن رکھتے ہوئے محققانہ بحث کے بعد ایک واضح اور ٹھوس تصور پیش کرنا، یہ سب وہ اوصاف ہیں جو اس کتاب کے مطالعے کے بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ کتاب سلسلہء کلامیہ سے متعلق ہے۔ اس میں مولانا رومؒ کو ایک حکیم کی حیثیت سے اور ان کی مثنوی معنوی کو کلام کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ رومی کا فلسفہء حیات، جذب ومستی، روحانی اور باطنی ایمانیات کو نہایت دلآویز انداز میں تحریر کیا گیا کہ کہ قاری اس کے طلسم میں کھو جاتا ہے۔ مولانا رومؒ کے کلام سے باطنی اور خارجی زندگی کے مسائل میں تاریخی بحث کو پیش نظر رکھا ہے۔ سوانحی ادب میں اس کتاب کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔

''سیرۃ النبیؐ'' شبلی نعمانی کی مایہ ناز تصنیف اور لازوال کارنامہ ہے جس کی طرف وہ سب سے آخر میں متوجہ ہوئے۔ اس کتاب کے کچھ حصے ہی وہ لکھ پائے تھے کہ اس دنیا کو خیر باد کہہ گئے۔ ان کی وصیت کے مطابق اس کتاب کے باقی ابواب/ حصے ان کے شاگرد رشید حضرت سید سلیمان ندوی نے مکمل کیا، یہ بھی اللہ کی مرضی تھی کہ اس کتاب کے ساتھ ان کا بھی خاتمہ بالخیر ہوا۔

شبلی نعمانی کا شروع کے زمانے سے یہ مصمم ارادہ تھا کہ حضرت محمدؐ کی سیرت پر ایسی کتاب لکھی جائے جو دنیائے اسلام کے لئے نظیر تو ہو ہی ساتھ ہی ساتھ مغرب میں حضرت محمدؐ کے تعلق سے عام لوگوں کی پراگندہ ذہنی (نعوذ باللہ) کو بھی دور کیا جا سکے اور ان کی بد دیانیتوں کو نہایت زور قوت کے ساتھ پردہ دری کی جائے۔

شبلی نعمانی کا مقصد فن سیرت میں ایک ایسی جامع اور محققانہ کتاب لکھنا تھا جس میں حضرت محمدؐ کے حالات وواقعات اور کارنامے مستند طور پر بیان کئے جا سکیں اور آپ ﷺ کے پیغام، آپ کی ہدایت وشریعت، اور اسلام کی دعوت وتعلیم صحیح اور معتبر آ خذ کی مدد سے دورِ حاضر کے نداق وفکر کے مطابق موثر اور دلکش زبان واسلوب میں پیش کی جا سکے تا کہ دنیا کو اچھی طرح معلوم ہو سکے کہ پیغمبر اسلامؐ کتنے جامع اور مکمل انسان تھے اور نوع انسانی کو کیا پیغام دے گئے۔ سیرۃ النبیؐ صرف سیرت کی کتاب نہیں بلکہ یہ جدید علم کلام کی اساس بھی ہے۔ سیرۃ النبیؐ کا اکثر مواد قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے موخود ہے۔ روایات کے ردوقبول میں بڑی چھان بین اور مکمل احتیاط کی گئی ہے جو کہ تحقیق وتنقید کے معیار پر پوری اترتی ہے۔ اس کتاب میں نفس واقعہ کو تحقیق وتدقیق کے بعد ایسے موثر اور دلنشین پیرائے میں بیان کیا گیا ہے کہ اعتراضات کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس کتاب میں دقیق اور پیچیدہ علمی وتحقیقی بحثوں کو اس قدر سلجھے، موثر اور سہل اسلوب میں پیش کیا گیا ہے کہ کہیں ژولیدگی کا احساس نہیں ہوتا۔ سیرۃ النبیؐ کا ایک بڑا امتیاز اور اہم خصوصیت اس

کا عالمانہ مقدمہ بھی ہے جو دراصل ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔صحیح اسلامی نقطۂ نظر کو اختیار کرنے کی وجہ سے قدیم طرز کے روایت پرست علماء کو بھی اس پرحرف گیری کا موقع کم ملا۔تلاش وتحقیق کے جدید انداز،عقلی ونقلی دلائل اور سائنٹفک طرز نیز سلیس زبان اوردلکش اسلوب تحریر کے باعث جدید تعلیم یافتہ طبقے کے شکوک وشبہات بھی رفع ہو گئے۔

مجموعی حیثیت سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردوتو کیا دنیا کی کسی بھی زبان میں اس موضوع پراس سے بہتر کوئی کتاب موجود نہیں کیونکہ تحقیق کا وہ معیاراس کتاب کے توسط سے سامنے آیا ہے جو اہل نظر کو ششدر کر کے رکھ دیتا ہے۔

''شعرالعجم'' علامہ شبلی نعمانی کا ایک معرکہ آرا ادبی وتحقیقی کارنامہ ہے بلکہ ادبی تاریخ کا ایک روشن ترین واقعہ ہے۔پانچ جلدوں پر مشتمل یہ کتاب دراصل عالمی ادب کی ترجمان فارسی زبان کے شعروادب کی ایسی ادبی وتاریخی وتحقیقی کتاب ایران میں بھی نہیں لکھی جاسکی۔شبلی نعمانی کو فارسی شعروادب سے حددرجہ شغف اور محبت تھی۔ان کے معاصرین میں یہ خوبی کسی اور کے حصے میں زیادہ نہ آئی۔خود ایران میں جہاں کی زبان ہی فارسی ہے،اس کتاب کی خوب پذیرائی ہوئی۔مشہور ایرانی مصنف سعید نفیسی نے شعرالعجم کی تحسین ان الفاظ میں کی:

''فارسی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ہمیشہ رہنما اور روشنی ثابت ہوگی
کیونکہ شبلی نے اپنی کتاب میں اپنی ناقدانہ موشگافیاں اور مہارت ظاہر کردی ہے۔تعجب کی
بات یہ ہے کہ وہ شخص جو ایران سے بہت دور ہو اور جس نے ایران کی سرزمین پر کبھی قدم
نہ رکھا ہو اور نہ ہی اسے اہل زبان کے ساتھ صحبت میسر رہی ہو وہ اس زبان کے رموز سے
اس قدر آشنا اور اس کی مشکلات کے بارے میں اپنی صائب رائے کس طرح دے سکا۔''

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ اہل فارس بھی ''شعرالعجم'' کی قدر و قیمت کو جان اور سمجھ سکے۔''شعرالعجم'' شبلی نعمانی کی زیادہ اہم بلند پایہ اور ممتاز ادبی تصنیف ہے جو اصلاً فارسی شاعری کی تاریخ ہے مگراس کے باوجود ایک لازوال تنقیدی وتحقیقی کارنامہ ہے۔شبلی نے اس کتاب میں صرف تاریخ ہی درج نہیں کی بلکہ وہاں کی آب وہوا، وہاں کی تہذیب وتمدن، وہاں کی معاشرت، وہاں کے سماجی مسائل کے ساتھ شعراء کا بیان نہایت سلیس اور رواں دواں زبان میں کیا ہے۔اس کتاب میں تحقیق کا انداز ہر صفحے سے نمایاں ہے۔شعرالعجم کی ایک خاص خوبی یہ بھی ہے کہ شبلی نے جن اشعار کا انتخاب کیا ہے وہ شبلی نعمانی کے اپنے ادبی تنقیدی دعووں پر پورا اترتا ہے۔شعراء کے کلام کا تجزیاتی جائزہ فارسی شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں اور شعرفہمی کا صحیح اور عمدہ ذوق رکھنے والوں کے لئے سامان لطف پیدا کرتا ہے۔

شبلی نعمانی نے ''شعرالعجم'' کو پانچ جلدوں میں ترتیب دیا۔انھوں نے شعرائے فارسی کے تین ادوار قائم کئے جن میں قدما، متوسطین اور متاخرین کے نام شامل ہیں۔پہلی جلد میں خاندان سامانیہ کے شعراء رودکی اور دقیقی، پھر غزنوی عہد کے شعراء کے حالات زندگی نیز ان کے کلام کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

دوسری جلد کے شروع میں دور متوسطین کے شاعروں کی خصوصیات اور ان کے اسباب بیان کئے ہیں۔اس جلد میں عطار،

کمال اسماعیل، شیخ سعدی، امیر خسرو، سلمان ساوجی، حافظ شیرازی اور ابن ایمن کے سوانحی کوائف کے ساتھ ان کی شاعرانہ خوبیوں کو اجاگر کیا ہے اور مثال کے طور پر اشعار نقل کئے ہیں۔

تیسری جلد کے شروع میں عہد متاخرین کے شعراء کی شاعرانہ خوبیوں اور خصوصیتوں کا ذکر ملتا ہے اس کے بعد شعراء میں فغانی شیرازی، فیضی، عرفی، نظیری، طالب آملی، مرزا صائب اور ابوکلیم طالب کے سوانح کوائف کے ساتھ ان کے کلام کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ساتھ ہی ساتھ اشعار بھی نقل کئے گئے ہیں تا کہ ان کی خوبیاں اجاگر ہو سکیں۔

چوتھی جلد میں حقیقت شعر کے تعلق سے ایک طویل محاکماتی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ایران کی شاعری، عربی شاعر کا اثر فارسی شاعری پر، نظام حکومت کے اثرات شاعری پر، فوجی زندگی کے اثرات، اختلافات معاشرت کے اثرات، آب و ہوا اور مناظر قدرت غرض کہ اس جلد میں ایران کی پوری معاشرت کی تحقیق اس انداز سے کی گئی ہے کہ پورا ادبی منظرنامہ سامنے آ گیا ہے۔شعر کی حقیقت اور ضرورت کے تعلق سے شبلی نعمانی کا جو تنقیدی رویہ ہے اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جلد کافی محنت اور مشقت سے ترتیب پائی ہوگی۔

پانچویں جلد میں فارسی غزل اور قصیدے کے تعلق سے گفتگو کی گئی ہے۔اس حصے میں فارسی کی عشقیہ، صوفیانہ، اخلاقی اور فلسفیانہ شاعری پر اپنے صوابدید کے مطابق انھوں نے خامہ فرسائی کی ہے۔شبلی نعمانی چونکہ فارسی زبان و ادب سے گہرا تعلق رکھتے تھے اس لئے ان کی دوربین نگاہوں نے فارسی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ اپنے انداز فکر و نظر کے مطابق کیا جس پر خود فارسی والوں کو ناز ہے۔فارسی شاعری کی ایسی تاریخ لکھنے کے لئے جس عرق ریزی اور محنت شاقہ کی ضرورت تھی، اسے شبلی نعمانی نے پورے طور پر ادا کر دیا۔

''موازنۂ انیس و دبیر'' اردو کے تدریسی حلقوں میں علامہ شبلی نعمانی کی تمام تصانیف میں سب سے زیادہ مقبول اور پڑھائی جانے والی تصنیف ہے۔شبلی کی اس کتاب کے اب تک کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔شبلی نعمانی نے کتاب کی ابتدا میں مرثیہ گوئی کی اجمالی تاریخ بیان کرتے ہوئے، فصاحت، ابتذال، بلاغت، واقعہ نگاری، روزمرہ، محاورہ، تشبیہ، استعارہ، حسن تعلیل اور الفاظ کے تناسب اور بحروں کے انتخاب وغیرہ پر بڑے ہی تحقیقی اور مدلل انداز سے لکھا ہے۔ان کا اسلوب بیان اور طرز اظہار اتنا رواں دواں ہے کہ اردو کے عام قاری کے ذہنوں پر چھا جاتا ہے۔

میر انیس کا شمار صف اول کے شعراء میں کیا جاتا ہے اور ان کی مرثیہ نگاری پر مختلف انداز سے نقد و تبصرہ کیا جاتا ہے۔میر انیس کی شہرت صرف ایک مرثیہ گو شاعر کی حیثیت سے تھی، شبلی نے اس کتاب میں دکھایا ہے کہ میر صاحب کا کلام تمام اصناف سخن کا بہترین نمونہ اور گوناگوں امتیازی خصوصیات کا حامل ہے۔اس سے ان کی شاعرانہ عظمت کے علاوہ خود شبلی کی نکتہ سنج طبیعت، بلند ادبی ذوق اور نقد و نظر کی وسعت و گہرائی کا پتہ چلتا ہے۔یہ میر انیس کی خوش قسمتی تھی کہ علامہ کی نگاہ ان پر پڑی اور ان کو پردۂ گمنامی سے نکالا۔

مولانا نے میر انیس کے شاعرانہ محاسن کو نمایاں اور امتیازی مقام دینے کی غرض سے ان کا موازنہ مرزا دبیر کی مرثیہ گوئی

سے کیا اور دبیر کی شاعری کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے انتہائی متوازن، مدلل اور منصفانہ طریقے سے یہ بتایا کہ وہ میر انیس سے کم درجہ کے مرثیہ گو اور شاعر تھے۔ اس پر دبیر کے حامی برہم ہوئے مگر واقعہ یہ ہے کہ شبلی نعمانی نے میر انیس کی عظمت کا جو نقش دلوں پر بٹھا دیا تھا وہ جاوداں ہو گیا۔

موازنہ انیس و دبیر کا غالب حصہ میر انیس کے شعری محاسن اور ان کی شاعرانہ خوبیوں کی پرکھ کے لئے وقف کیا گیا۔ مرزا دبیر اس تجزیاتی مطالعے کے دوران بہت کم دکھائی پڑتے ہیں۔ میر انیس کو مرزا دبیر پر فوقیت دینے کی غرض سے انھوں نے جو تنقیدی عمل اور اصول اپنائے ہیں وہ زیادہ تر مشرقی شعریات کے مسلمات سے ماخوذ ہیں۔ انھوں نے ادبی اصطلاحات کی وضاحت اور ان کی اطلاق تنقید کرتے وقت میر انیس اور مرزا دبیر کا تقابلی مطالعہ نہایت ہی فراست روی سے کیا ہے۔ انھوں نے میر انیس کی طرفداری اور پاسداری میں جن دلائل سے کام لیا ہے وہ ٹھوس ہیں۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ میر انیس کو زبان کے امکانات کا گہرا شعور ہے اور ان کے استعمال کا ایسا سلیقہ جو روزمرہ، فصاحت و بلاغت کے معیار کاملیت پر پورا اترتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ میر انیس کی شاعری فطانت، سلامت روی اور اعتدال سے متصف ہے۔ شبلی نے اعتراف کیا ہے کہ انیس کا اصلی جوہر بندش کی چستی، ترکیب کی دلآویزی، الفاظ کا تناسب اور برجستگی و سلامت ہے اور یہ سب چیزیں مرزا دبیر کے یہاں ہیں لیکن بہت کم ہیں۔ شبلی نعمانی نے میر انیس کے شاعرانہ مقام کے تعین قدر کے لئے جو اصول نقد وضع کئے ان پر اعتراض تو کئے گئے لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ اعتراضات بس برائے اعتراضات ہی رہ گئے اور میر انیس کو وہی مقام ملا جس کے وہ متقاضی اور شبلی نے جس کی نشاندہی کی تھی۔ موازنے کے عمل میں دلیلوں سے ہی کام لیا جاتا ہے، شبلی نے بھی ادبی اصول نقد کے دلیلوں سے کام لیا۔ اور آج تک میر انیس اسی مقام پر متمکن نظر آتے ہیں جہاں ان کو شبلی نعمانی نے بٹھایا تھا۔ اردو تنقید و تحقیق میں ''موازنہ انیس و دبیر'' کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ کتاب ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی لیکن آج بھی اس کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔

شبلی نعمانی نے اور بھی کئی کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں، بطور خاص، ''علم کلام''، ''علم الکلام'' اور ''الکلام'' ان تینوں کتابوں میں شبلی نے الگ الگ نہج سے مذہبی عقاید کے اثبات کے لئے تحقیقی طریقۂ کار کو اپنایا ہے۔ ان تینوں کتابوں کا تعلق خالص مذہبی علوم وفنون سے ہے۔ مذہبیات کے مختلف ابعاد اور موضوعات کو زیر بحث بناتے ہوئے ان پر مدلل گفتگو کی ہے۔ مذہبی علوم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتابیں استناد کا درجہ رکھتی ہیں۔ جن میں مختلف النوع مسائل کا بیان ہے بالخصوص شریعت وطریقت کے ان اصول وضوابط کے تعلق سے بحث کی گئی ہے جن سے عام انسانی زندگی میں سامنا پڑتا ہے۔

شبلی نعمانی کی ادبی تحقیق کے اوصاف و امتیازات کی فہرست طویل ہے۔ ان کے کارنامے ادبی تاریخ کا حصہ ہیں۔ ان کی ادبی سرگرمیوں سے اردو زبان و ادب کو نئی سمت ملی، فکر ونظر کی نئی راہ متعین ہوئی اور کھلے دل و دماغ سے سوچنے اور سمجھنے کی ایسی صلاحیت پیدا ہوئی جو دلائل و براہین پر اتفاق رکھتی ہے۔

8.5 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی کے ذریعہ آپ/کو

- الطاف حسین حالی اور شبلی کے سوانحی کوائف اور ان کے حالات زندگی سے واقفیت حاصل ہوئی۔
- الطاف حسین حالی اور شبلی کی تصنیفات وتالیفات کی معلومات حاصل ہوئی۔آپ کتابوں کے نام سے واقف ہو سکے
- الطاف حسین حالی کے تحقیقی کارناموں اور ان کی ادبی خدمات کے ساتھ ان کے تحقیقی اور تنقیدی اوصاف اور امتیازات کے بارے میں جانکاری ہوئی۔
- علامہ شبلی نعمانی کی اہم تحقیقی تصنیفات کے بارے میں جانکاری حاصل ہوئی۔
- علامہ شبلی نعمانی کے تحقیقی کارناموں اور ان کی ادبی خدمات کے ساتھ ان کے تحقیقی اور تنقیدی اوصاف اور امتیازات کے بارے میں بھرپور علم حاصل ہوا۔

8.6 اپنا امتحان خود لیجیے

- الطاف حسین حالی کی تین ان اہم کتابوں کے نام بتایئے اور ان کا سن اشاعت بھی لکھیے۔
- 'مقدمہ شعر وشاعری' کا اختصار سے جائزہ لیجیے۔
- 'یادگار غالب' کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ اختصار سے لکھیے۔
- 'حیات جاوید' کی سوانحی خوبیوں کو بیان کیجیے۔
- علامہ شبلی نعمانی کی چار ان اہم کتابوں کے نام بتایئے جن کا تعلق تحقیق وتنقید سے ہے۔ان کا سن اشاعت بھی لکھیے۔
- 'موازنہ انیس ودبیر' کا اختصار سے جائزہ لیجیے۔
- 'شعر العجم' کے بارے میں آپ کو جو معلومات حاصل ہوئی ان کا اختصار سے ذکر کیجیے۔
- بحیثیت سوانح نگار علامہ شبلی نعمانی کی خوبیوں کے بارے میں اختصار سے بتایئے۔

8.7 سوالات کے جوابات

- حالی کی تین اہم کتابیں درج ذیل ہیں۔

حیات سعدی۔۱۸۸۲ء

یادگار غالب۔۱۸۹۷ء

حیات جاوید۔۱۹۰۱ء

- ''مقدمہ شعر وشاعری'' دراصل الطاف حسین حالی کا اپنے دیوان کے شروع میں لکھے گئے دیباچے کا حصہ رہا ہے جو طویل سے طویل تر ہوتا گیا اور طویل مقدمہ کی شکل اختیار کر گیا جس کو بعد میں کتابی شکل دے کر اس کا نام ''مقدمہ شعر وشاعری'' رکھ دیا گیا۔اس کتاب کو ۱۸۹۳ میں نامی پریس، کانپور نے شائع کیا۔چونکہ اردو میں پہلی بار تنقیدی مسائل سے سوال وجواب کا سلسلہ وجود میں آیا تھا اس لئے ''مقدمہ شعر وشاعری'' اردو تنقید میں خشت اول کی حیثیت رکھتا ہے حالانکہ اسمیں تحقیقی عناصر بھی شامل ہیں

نیز اردو شاعری کا تجزیاتی اور تحقیقی مطالعہ بھی ہے۔ مقدمہ کے پہلے حصے میں شعر کا تاثر، ماہیت یعنی شاعری اور اس کے لوازم سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں شعری اصناف میں غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی کو موضوع گفتگو بنا کر ایک نئے انداز فکر و نظر کے ساتھ ناقدانہ اور محققانہ تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان کا اسلوب بیان تمام معاصرین سے افضل تر کہا جا سکتا ہے۔ ''مقدمہ شعر و شاعری'' کو حالی کی تنقیدی و تحقیقی بصیرت کا مظہر ہونے کے ساتھ ساتھ جدید اردو تنقید کا منشور سمجھنا چاہئے جس کی بدولت اردو تنقیدی بصیرت فہم و ادراک، شعور وجدان کے لئے راہیں ہموار ہوئیں اور زبان و ادب کا سچا شعور بیدار ہوا۔

- ''یادگار غالب'' حالی کی اہم تحقیقی کتاب ہے جو ۱۸۹۷ میں نامی پریس، کانپور سے شائع ہوئی۔ گو کہ یہ سوانح عمری ہے لیکن اس کتاب سے غالب کی زندگی اور ان کے کلام کو پورے طور پر سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ''یادگار غالب'' نفسیاتی الجھنوں اور ذہنی پریشانیوں کی داستان بھی ہے۔ غالب کی پوری زندگی کرب و آزار اور کشمکش میں گزری جس کے شاہد حالی رہے تھے۔ انھوں نے اس کے پہلے حصے میں غالب کے حالات زندگی اور دوسرے حصے میں غالب کے کمالات نظم و نثر کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔ جس عرق ریزی سے انھوں نے سوانح کی ترتیب میں تحقیقی طریقہء کار کو اپنایا ہے وہ حالی کا ہی حصہ کہا جا سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ غالب کے کلام کی بلندی کا اصل احساس ''یادگار غالب'' نے ہی دلایا۔ اردو شاعری کے پڑھنے والے غالب سے واقف تو تھے لیکن ان کی عظمت و رفعت کا ان میں اندازہ اس وقت ہوا جب حالی کی یہ کتاب سامنے آئی۔ اسی کتاب کی بنیاد پر بعد کے غالب کے شارحین نے وہ قصر فلک بوس تعمیر کئے جو آج ہمارے سامنے ہیں۔

- یک ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ''حیات جاوید'' ۱۹۰۱ء میں سرسید کے انتقال کے بعد نامی پریس، کانپور سے شائع ہوئی۔ انھوں نے اس سوانحی کتاب کو لکھنے میں کئی سال گزار دیے اور سرسید کی زندگی میں پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا سکے جس کا ان کو بڑا قلق تھا۔ حالی کو اس کتاب کی ترتیب میں جن مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا ان کا بیان مشکل ہے۔

''حیات جاوید'' ایسے زمانے کی سوانح عمری ہے جس زمانے میں اردو جیسی زبان سے یہ توقع رکھنا کہ اس میں اعلیٰ درجے کی سوانح عمری ہوگی، ایک بے بنیاد توقع رہی ہوگی۔ خود فارسی کی ہزار سالہ ادبیات میں ایسی کوئی مکمل سوانح عمری موجود نہیں جو جدید اصول سیرت نگاری کے معیار پر پوری اترے، ایسی صورت میں حالؔی کا کارنامہ اس لئے اہم ہے کہ اس میں سوانح کے ساتھ، تحقیق، تنقید، تجزیہ، ادبی کلامیہ سب شامل ہیں۔ سرسید کی اندرونی و بیرونی زندگی اور خارجی واقعات کے بیان و امتزاج سے یہ سوانح عمری ایک پوری صدی کی تاریخ بن گئی ہے۔ سرسید کی سب سے بڑی عظمت ہے کہ انھوں نے مسلمان قوم کو تذبذب کے تصور سے نکالا ان کی منزل کا تعین کیا اور انھیں ایک ایسے راستے پر لگا دیا جو خوشحالی اور بلندی ترقی کو جاتا تھا۔ 'حیات جاوید کا مرکزی خیال یہی تصور ہے اور حالی کی تمام سلیقہ مندی اور صلاحیت اسی محور کے گرد گھومتی ہے۔ سرسید کے زمانے کی معاشرت، رسوم و رواج اور اوضاع و اطوار زندگی، تعلیمی واقعات، شرفا سوسائٹی کے قصے، ان سب کے بیان نے سوانح عمری 'حیات جاوید' کو اس صدی کا اہم استعارہ بنا کر جاودانی عطا کر دی۔

- شبلی کی چار سوانحی کتابوں کے نام مع سن اشاعت درج ذیل ہیں۔

۱۔ المامون۔۱۸۸۷ء

۲۔ سیرۃ النعمان۔ پہلا حصہ ۱۸۹۳/ ۱۸۸۹

۳۔ الفاروق۔جنوری ۱۸۹۸ء

۴۔ الغزالی۔اگست ۱۹۰۲ء

- ''موازنۂ انیس و دبیر'' علامہ شبلی نعمانی کی تمام تصانیف میں سب سے زیادہ مقبول تصنیف ہے۔شبلی کی اس کتاب کے اب تک کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔شبلی نعمانی نے کتاب کی ابتدا میں مرثیہ گوئی کی اجمالی تاریخ بیان کرتے ہوئے،فصاحت،ابتذال، بلاغت،واقعہ نگاری،روزمرہ،محاورہ،تشبیہ،استعارہ،حسن تعلیل اور الفاظ کے تناسب اور بحروں کے انتخاب وغیرہ پر بڑے ہی تحقیقی اور مدلل انداز سے لکھا ہے۔ان کا اسلوب بیان اور طرز اظہار اتنا رواں دواں ہے کہ اردو کے عام قاری کے ذہنوں پر چھا جاتا ہے۔

مولانا نے میر انیس کے شاعرانہ محاسن کو نمایاں اور امتیازی مقام دینے کی غرض سے ان کا موازنہ مرزا دبیر کی مرثیہ گوئی سے کیا اور دبیر کی شاعری کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے انتہائی متوازن، مدلل اور منصفانہ طریقے سے یہ بتایا کہ وہ میر انیس سے کم درجہ کے مرثیہ گو اور شاعر تھے۔اس پر دبیر کے حامی برہم ہوئے مگر واقعہ یہ ہے کہ شبلی نعمانی نے میر انیس کی عظمت کا جو نقش دلوں پر بٹھا دیا تھا وہ جاوداں ہو گیا۔

میر انیس کو مرزا دبیر پر فوقیت دینے کی غرض سے انھوں نے جو تنقیدی عمل اور اصول اپنائے ہیں وہ زیادہ تر مشرقی شعریات کے مسلمات سے ماخوذ ہیں۔انھوں نے ادبی اصطلاحات کی وضاحت اور ان کی اطلاقی تنقید کرتے وقت میر انیس اور مرزا دبیر کا تقابلی مطالعہ نہایت ہی فراست روی سے کیا ہے۔انھوں نے میر انیس کی طرفداری اور پاسداری میں جن دلائل سے کام لیا ہے وہ ٹھوس ہیں۔وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ میر انیس کو زبان کے امکانات کا گہرا شعور ہے اور ان کے استعمال کا ایسا سلیقہ جو روزمرہ، فصاحت و بلاغت کے معیار کاملیت پر پورا اترتا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ میر انیس کی شاعری فطانت،سلامت روی اور اعتدال سے متصف ہے۔شبلی نے اعتراف کیا ہے کہ انیس کا اصلی جوہر بندش کی چستی،ترکیب کی دلآویزی،الفاظ کا تناسب اور برجستگی و سلامت ہے اور یہ سب چیزیں مرزا دبیر کے یہاں ہیں لیکن بہت کم ہیں۔شبلی نعمانی نے میر انیس کے شاعرانہ مقام کے تعین قدر کے لئے جو اصول نقد وضع کئے ان پر اعتراض تو کئے گئے لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ اعتراضات بس برائے اعتراضات ہی رہ گئے اور میر انیس کو وہی مقام ملا جس کے وہ متقاضی اور شبلی نے جس کی نشاندہی کی تھی۔موازنے کے عمل میں دلیلوں سے ہی کام لیا جاتا ہے،شبلی نے بھی ادبی اصول نقد کے دلیلوں سے کام لیا۔اور آج تک میر انیس اسی مقام پر متمکن نظر آتے ہیں جہاں ان کو شبلی نعمانی نے بٹھایا تھا۔اردو تنقید و تحقیق میں ''موازنہ انیس و دبیر'' کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔یہ کتاب ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی لیکن آج بھی اس کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔

- ''شعر العجم''، علامہ شبلی نعمانی کا ایک معرکہ آرا ادبی و تحقیقی کارنامہ ہے بلکہ ادبی تاریخ کا ایک روشن ترین واقعہ ہے۔ پانچ

جلدوں پر مشتمل یہ کتاب دراصل عالمی ادب کی ترجمان فارسی زبان کے شعروادب کی ایسی ادبی وتاریخی وتحقیقی کتاب ایران میں بھی نہیں لکھی جاسکی۔شبلی نعمانی کو فارسی شعروادب سے حد درجہ شغف اور محبت تھی۔ان کے معاصرین میں یہ خوبی کسی اور کے حصے میں زیادہ نہ آئی۔خودایران میں جہاں کی زبان ہی فارسی ہے،اس کتاب کی خوب پذیرائی ہوئی۔

شبلی نعمانی نے''شعرالعجم''کو پانچ جلدوں میں ترتیب دیا۔انھوں نے شعرائے فارسی کے تین ادوار قائم کئے جن میں قدما، متوسطین اور متاخرین کے نام شامل ہیں۔پہلی جلد میں خاندان سامانیہ کے شعراء رودکی اور دقیقی، پھر غزنوی عہد کے شعراء کے حالات زندگی نیز ان کے کلام کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

دوسری جلد کے شروع میں دور متوسطین کے شاعروں کی خصوصیات اوران کے اسباب بیان کئے ہیں۔اس جلد میں عطار، کمال اسماعیل، شیخ سعدی، امیرخسرو، سلمان ساوجی، حافظ شیرازی اورابن ایمن کے سوانحی کوائف کے ساتھ ان کی شاعرانہ خوبیوں کواجاگر کیا ہے اور مثال کے طور پر اشعار نقل کئے ہیں۔

تیسری جلد کے شروع میں عہد متاخرین کے شعراء کی شاعرانہ خوبیوں اور خصوصیتوں کا ذکر ملتا ہے اس کے بعد شعراء میں فغانی شیرازی، فیضی، عرفی، نظیری، طالب آملی، مرزا صائب اورابوکلیم طالب کے سوانح کوائف کے ساتھ ان کے کلام کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ساتھ ہی ساتھ اشعار بھی نقل کئے گئے ہیں تاکہ ان کی خوبیاں اجاگر ہوسکیں۔

چوتھی جلد میں حقیقت شعر کے تعلق سے ایک طویل محاکماتی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ایران کی شاعری، عربی شاعر کا اثر فارسی شاعری پر، نظام حکومت کے اثرات شاعری پر، فوجی زندگی کے اثرات، اختلافات معاشرت کے اثرات، آب و ہوا اور مناظر قدرت غرض کہ اس جلد میں ایران کی پوری معاشرت کی تحقیق اس انداز سے کی گئی ہے کہ پورا ادبی منظرنامہ سامنے آگیا ہے۔شعر کی حقیقت اورضرورت کے تعلق سے شبلی نعمانی کا جوتنقیدی رویہ ہے اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جلد کافی محنت اور مشقت سے ترتیب پائی ہوگی۔

پانچویں جلد میں فارسی غزل اور قصیدے کے تعلق سے گفتگو کی گئی ہے۔اس حصے میں فارسی کی عشقیہ، صوفیانہ، اخلاقی اور فلسفیانہ شاعری پر اپنے صوابدید کے مطابق انھوں نے خامہ فرسائی کی ہے۔شبلی نعمانی چونکہ فارسی زبان وادب سے گہرا تعلق رکھتے تھے اس لئے ان کی دوربین نگاہوں نے فارسی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ اپنے اندازفکر ونظر کے مطابق کیا جس پر خود فارسی والوں کو ناز ہے۔فارسی شاعری کی ایسی تاریخ لکھنے کے لئے جس عرق ریزی اور محنت شاقہ کی ضرورت تھی، اسے شبلی نعمانی نے پورے طور پر ادا کردیا۔

- شبلی کے تحقیقی کام کی بہترین مثال ان کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں ہیں۔المامون (۱۸۸۷)، سیرۃ النعمان (۱۸۹۳۔۱۸۸۹)، الفارق (۱۸۹۸)، الغزالی (۱۹۰۲) سوانح مولانا روم (۱۹۰۵) اس کے علاوہ سیرۃ النبی ﷺ جیسی تحقیقی کتاب (جس کی آخری جلدان کے شاگرد رشید علامہ سید سلیمان ندوی نے مکمل کی) یہ سب وہ کتابیں ہیں جن میں شبلی کی بے پناہ ادبی تحقیقی اور خلاقانہ صلاحتیں نمایاں ہیں۔

شبلی نعمانی ایک ایسے عالم تھے جن کو تحقیق وتفتیش کا شوق جنون کی حدتک تھا۔انھوں نے اسلامی تاریخ کا وسیع مطالعہ کیا تھا۔عربی اور فارسی زبانوں سے بخوبی آشنا ہونے کا سبب صرف یہی تھا کہ وہ تاریخ کے اصل ماخذوں کا براہ راست مطالعہ کرتے تھے۔

''المامون''، شبلی نعمانی کی پہلی تحقیقی تصنیف ہے جو مشہور عباسی خلیفہ مامون رشید کی سوانح عمری ہے۔

شبلی نعمانی ایک ایسے عالم تھے جن کو تحقیق وتفتیش کا شوق جنون کی حدتک تھا۔انھوں نے اسلامی تاریخ کا وسیع مطالعہ کیا تھا۔عربی اور فارسی زبانوں سے بخوبی آشنا ہونے کا سبب صرف یہی تھا کہ وہ تاریخ کے اصل ماخذوں کا براہ راست مطالعہ کرتے تھے۔

''سیرۃ النعمان'' علامہ شبلی نعمانی کی ایسی تحقیقی کتاب ہے جو ان کے اپنے دینی مسلک اور نظریات کی ترجمانی کرنے والی ایک عبقری شخصیت امام ابوحنیفہ کی سوانح حیات ہے۔شبلی نعمانی فقہی جزئیات میں امام ابوحنیفہؒ کے پیروکار تھے۔ان سے انھیں شدید عقیدت تھی۔

''الفاروق''، شبلی نعمانی کی وہ شہرۂ آفاق تصنیف ہے جس پر خود ان کو بہت ناز تھا۔ یہ کتاب ہندوستان کے کتب خانوں اور مصروشام وروم کے علمی خزانوں سے تحقیق وتفتیش کے بعد لکھی گئی۔اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور کئی زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہوئے۔کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی سوانح عمری کئی زبانوں میں لکھی گئی بالخصوص عربی، فارسی اور اردو میں لیکن شبلی نعمانی کی اس کتاب میں تحقیق وتفتیش، دلائل وبراہین سے اتنا کام لیا گیا ہے کہ یہ کتاب سب کتابوں پر بھاری ہے۔حالانکہ شبلی نعمانی نے زیادہ تفصیل پیش نہیں کی ہے لیکن اختصار میں جامعیت موجود ہے۔حضرت عمرؓ کے قبول اسلام، جنگ احد میں ثابت قدمی، واقعہ قرطاس، مسقیفہ بن ساعدہ اور تمہید میں فن تاریخ اور اس کے اصول ومعیار کے متعلق جو کچھ اختصار سے لکھا گیا ہے وہ عام مورخین اور مصنفین کی تحریروں سے اعلانیہ ممتاز نظر آتا ہے۔

''الغزالی''، مشہور فلسفی اور معلم اخلاق امام غزالیؒ کی سوانح عمری اور ان کے نظریات وافکار پر مشتمل ایک اہم کتاب ہے جسے شبلی نعمانی نے ۱۹۰۱ء میں تصنیف کی۔امام غزالی کی یہ سوانح عمری شبلی کے سلسلہء کلامیہ کی ایک اہم کڑی ہے۔اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ان کے کمالات میں فلسفہ کو بڑا دخل ہے اور ان کی ذہنی اور روحانی تکمیل میں تصوف کو خاص اہمیت حاصل ہے۔اس کتاب کو لکھنے کی تحریک سرسید سے ان کو ۱۸۹۳ میں ملی تھی۔اس کتاب کی تیاری میں امام غزالی کے حالاتِ زندگی انھیں وافر مقدار میں حاصل نہ ہو سکے تھے اس لئے ان کے تعلق سے سیر حاصل معلومات نہیں ملتی لیکن پھر بھی جو کچھ مواد انھوں نے تحقیق وتفتیش کر کے اکٹھا کیا تھا ان کو اختصار کے ساتھ پیش کیا جو تقریباً تیس صفحوں پر محیط ہے۔امام غزالیؒ کی سوانح کے ساتھ ان کے فلسفیانہ افکار، مذہبی خیالات، اخلاقی درسیات اور دوسری سرگرمیوں کا ذکر بھی بڑے ہی معتبر حوالوں سے کیا ہے۔شبلی نعمانی نے اصول تحقیق وتنقید کے مطابق امام غزالیؒ کی شخصیت اور ان کے روحانی، فکری، دینی افکار وخیالات کو دیانتداری کے ساتھ اہل نظر کے سامنے رکھ دیا۔غلط استنباط واستدلال کبھی بھی شبلی کا طرز اظہار نہیں رہا۔یہی سبب ہے کہ ''الغزالی'' کو وہ مقبولیت ملی جو اس کے دوسرے سوانح نگاروں کو

نہ مل سکی۔

'سوانح مولانا رومؒ' شبلی نعمانی کا ایک ایسا تحقیقی کارنامہ ہے جسے پڑھ کر مولانا روم کے حالات زندگی اور ان کے کلام بالخصوص ان کی مثنوی کے تعلق سے کئی کارآمد معلومات حاصل ہوتی ہے اس میں مولانا رومؒ کو ایک حکیم کی حیثیت سے اور ان کی مثنوی معنوی کو کلام کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔رومی کا فلسفہء حیات، جذب و مستی، روحانی اور باطنی ایمانیات کو نہایت دلآویز انداز میں تحریر کیا گیا کہ کہ قاری اس کے طلسم میں کھو جاتا ہے۔ مولانا رومؒ کے کلام سے باطنی اور خارجی زندگی کے مسائل میں تاریخی بحث کو پیش نظر رکھا ہے۔سوانحی ادب میں اس کتاب کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔

''سیرۃ النبیؐ' شبلی نعمانی کی مایہ ناز تصنیف اور لازوال کارنامہ ہے۔شبلی نعمانی کا مقصد فن سیرت میں ایک ایسی جامع اور محققانہ کتاب لکھنا تھا جس میں حضرت محمدؐ کے حالات وواقعات اور کارنامے مستند طور پر بیان کئے جاسکیں اور آپ ﷺ کے پیغام، آپ کی ہدایت و شریعت، اور اسلام کی دعوت و تعلیم صحیح اور معتبر مآخذ کی مدد سے دورِ حاضر کے مذاق وفکر کے مطابق موثر اور دلکش زبان واسلوب میں پیش کی جاسکے تاکہ دنیا کو اچھی طرح معلوم ہو سکے کہ پیغمبر اسلامؐ کتنے جامع اور مکمل انسان تھے اور نوع انسانی کو کیا پیغام دے گئے۔سیرۃ النبیؐ صرف سیرت کی کتاب نہیں بلکہ یہ جدید علم کلام کی اساس بھی ہے۔سیرۃ النبیؐ کا اکثر مواد قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے موخود ہے۔روایات کے ردو قبول میں بڑی چھان بین اور مکمل احتیاط کی گئی ہے جو کہ تحقیق و تنقید کے معیار پر پوری اترتی ہے۔اس کتاب میں نفس واقعہ کو تحقیق و تدقیق کے بعد ایسے موثر اور دلنشین پیرائے میں بیان کیا گیا ہے کہ اعتراضات کی گنجائش نہیں رہتی۔اس کتاب میں دقیق اور پیچیدہ علمی و تحقیقی بحثوں کو اس قدر سلجھے، موثر اور سہل اسلوب میں پیش کیا گیا ہے کہ کہیں ژولیدگی کا احساس نہیں ہوتا۔سیرۃ النبیؐ کا ایک بڑا امتیاز اور اہم خصوصیت اس کا عالمانہ مقدمہ بھی ہے جو دراصل ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔صحیح اسلامی نقطۂ نظر کو اختیار کرنے کی وجہ سے قدیم طرز کے روایت پرست علماء کو بھی اس پر حرف گیری کا موقع کم ملا۔تلاش وتحقیق کے جدید انداز، عقلی و نقلی دلائل اور سائنٹفک طرز نیز سلیس زبان اور دلکش اسلوب تحریر کے باعث جدید تعلیم یافتہ طبقے کے شکوک و شبہات بھی رفع ہو گئے۔

مجموعی حیثیت سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو تو کیا دنیا کی کسی بھی زبان میں اس موضوع پر اس سے بہتر کوئی کتاب موجود نہیں کیونکہ تحقیق کا وہ معیار اس کتاب کے توسط سے سامنے آیا ہے جو اہل نظر کو ششدر کر کے رکھ دیتا ہے۔

8.8 فرہنگ

توسط	ذریعہ	عزائم	پکے ارادے
عنفوان شباب	آغاز جوانی	مظہر	ظاہر ہونے کی جگہ
اختراع	فنکارانہ ایجاد	منشور	وہ بنیادی تحریر جس میں کسی جماعت
وغیرہ			کے اصول اور مقاصد درج ہوں
متوسط	درمیانی	کتب خانہ	لائبریری

فوقیت	ترجیح، برتری	تجسس	تلاش
اسلوب	انداز، روش	فیضان	فائدہ
مروج	رائج کیا گیا	اعتراف	تسلیم کرنا، مان لینا
ثقیل	مشکل	تعین	مخصوص کرنا
کثیرالجہت		مختلف النوع	الگ الگ قسم کے
قلیل	تھوڑا	فلک بوس	آسمان کو چھونے والا

8.9 کتب برائے مطالعہ

۱۔ تاریخ ادب اردو۔جمیل جالبی

۲۔ مختصر تاریخ ادب اردو۔انور سدید

۳۔ حالیؔ: ایک عہد ساز فنکار۔زرینہ عقیل

۴۔ تاریخ ادب اردو۔گیان چند جین۔سیدہ جعفر

۵۔ ذوق ادب وشعور۔احتشام حسین

۶۔ تاریخ ادب اردو۔رام بابو سکسینہ

۷۔ حیات شبلی۔مولانا سید سلیمان ندوی

۸۔ یادگار شبلی۔شیخ محمد اکرام

۹۔ شبلی ایک دبستان۔آفتاب احمد صدیقی

۱۰۔ شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں۔ عبدالطیف اعظمی

اکائی 9 : مولوی عبدالحق اور امتیاز علی خان عرشی

ساخت:

9.1 اغراض و مقاصد

9.2 تمہید

9.3 مولوی عبدالحق: حیات اور ادبی کارنامے

9.3.1 مولوی عبدالحق: سوانحی کوائف اور حالات زندگی

9.3.2 مولوی عبدالحق کی تصنیفات/تالیفات

9.3.3 مولوی عبدالحق کے تحقیقی کارنامے۔اوصاف وامتیازات

9.4 امتیاز علی خان عرشی: حیات اور ادبی کارنامے

9.4.1 امتیاز علی خان عرشی: سوانحی کوائف اور حالات زندگی

9.4.2 امتیاز علی خان عرشی کی تصنیفات وتالیفات

9.4.3 امتیاز علی خان عرشی کے تحقیقی کارنامے۔اوصاف وامتیازات

9.5 آپ نے کیا سیکھا

9.6 اپنا امتحان خود لیجیے

9.7 سوالات کے جوابات

9.8 فرہنگ

9.9 کتب برائے مطالعہ

9.1 اغراض و مقاصد:

اس اکائی میں آپ/کو

- مولوی عبدالحق کے سوانحی کوائف اور حالات زندگی سے واقف ہوں گے۔
- مولوی عبدالحق کی تصنیفات کی تفصیلی معلومات حاصل ہوگی۔
- مولوی عبدالحق کے تحقیقی کارناموں اور ان کی ادبی خدمات کے ساتھ ان کے اوصاف اور امتیازات کے بارے میں جان سکیں گے۔
- امتیاز علی خان عرشی کے سوانحی کوائف اور حالات زندگی سے واقف ہوں گے۔
- امتیاز علی خان عرشی کی تصنیفات کی تفصیلی معلومات حاصل ہوگی۔

- امتیاز علی خان عرشی کے تحقیقی کارناموں اوران کی ادبی خدمات کے ساتھ ان کے اوصاف اور امتیازات کے بارے میں جان سکیں گے۔

9.2 تمہید:

نصف صدی کے زیادہ اردو زبان وادب کی خدمت کرنے والی علمی وادبی شخصیت کا نام مولوی عبدالحق ہے۔ مولوی عبدالحق نے اپنی زندگی کو زبانِ اردو کے لئے قربان کر دیا۔ انھیں ہمیشہ ایک ہی دُھن سوار رہی کہ اردو کو اس کا صحیح مقام مل سکے اور اس کی حیثیت بین الاقوامی زبانوں کے شانہ بہ شانہ قائم ہو سکے۔ علی گڑھ میں دوران تعلیم انھوں نے سرسید اور ان کے رفقاء علمی وادبی سرگرمیوں سے خوب فیض اٹھایا اور اپنی حیثیت بھی ایک ''تحریک'' کے طور پر اجاگر کرنے کی غرض سے شب وروز اردو زبان وادب کی خدمت میں لگے رہے۔

انھوں نے علمی وادبی مضامین لکھے، تحقیقی مضامین سپرد قلم کئے۔ خاکے لکھے۔ تبصرے تحریر کئے۔ کتابوں کی ترتیب وتدوین کا کام کیا۔ لغت وقواعد پر کام کیا۔ اردو رسالہ نکالے، ودرافتادہ مقامات پر اردو کے مدرسے قائم کئے۔ برصغیر ہندو پاک میں انجمن ترقی اردو کی شاخیں قائم کیں۔ غرض اردو اور عبدالحق لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مولوی عبدالحق کا اصل کارنامہ ان کے تحقیقی کاموں کے توسط سے سامنے آیا۔ انھوں نے قدیم مخطوطات کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کی ترتیب وتدوین کا کام انتہائی سلیقہ مندی اور ہنرمندی کے ساتھ کیا۔ ان کی ہفت پہلو شخصیت کا یہ گوشہ انتہائی اہم ہے۔

اردو لسانیات کے حوالے سے مولوی عبدالحق نے اردو کے آغاز وارتقاء، اردو لغت نویسی، اردو قواعد نگاری، اردو اصطلاحات سازی کے سلسلے میں قابل قدر تحقیقی خدمات سرانجام دیں۔ اردو زبان کے آغاز وارتقاء اور نشو ونما کے بارے میں ان کے نظریات زیادہ تر ان کے خطبات اور مقدمات میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے مختلف النوع موضوعات کو اپنی تحریر کا حصہ بنایا۔

مولوی عبدالحق نے اعتراف کیا ہے کہ میری زندگی کا مقصد صرف دنیا میں ایک ہی ہے وہ یہ کہ اردو کو ترقی ہو اور یہ علمی زبان بن جائے۔

مولوی عبدالحق کو بابائے اردو کا خطاب دیا گیا جس کو انھوں نے سچ کر دکھایا۔ انھوں نے اردو زبان کی ترویج وترقی کے لئے ایسے ذرائع اختیار کئے کہ جن سے اردو کو ایک ہمہ گیر مقام حاصل ہوا۔ اردو مدارس اور کتب خانوں کا قیام، سرکاری اور غیر سرکاری مدارس میں اردو کی شرکت، نصاب اردو میں اصلاح وترمیم، اردو کی انجمنوں کا قائم کرنا اور ایسے اردو اخبارات ورسائل کا اجرا جو عام لوگوں کی پہنچ سے باہر نہ ہوں۔

ان ساری سرگرمیوں کے ساتھ اپنی قلمی خدمات سے اردو زبان وادب کو مالا مال کیا۔ جتنے اہم تحقیقی کام انھوں نے کئے وہ دوسروں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئے۔ انھوں نے زبان وادب کی نشو ونما کی غرض سے تمام ادبی جہتوں کو پیش نظر رکھا۔

مولوی عبدالحق کو گہرا لسانی شعور تھا۔ انھیں اس امر کا بخوبی علم تھا کہ کسی بھی معاشرے کی تہذیب وثقافت سے زبان کو الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ان کے اصول محض کتابی یا اکتسابی نہ تھے بلکہ انھوں نے گردوپیش کے تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی، جغرافیائی اور تاریخی حقائق کو سامنے رکھ کر ایک مکمل لائحہ عمل تیار کیا تھا جو ان کی تصنیفات اور ان کی عملی زندگی میں بھی صاف صاف دکھائی پڑتا ہے۔

مولانا امتیاز علی خان عرشی کا تعلق رام پور سے ہے۔ انھوں نے ادب کی دنیا میں بطور محقق اپنا نام روشن کیا۔ ابتدائی زمانے سے ہی ان کو علمی ذوق وتجسس تھا اور وہ ہمیشہ تحقیقی کاموں میں دلچسپی لیتے تھے۔ انھوں نے نہایت عرق ریزی اور تحقیق وتفتیش کے ساتھ دوسروں کی تصنیفات یا ان کے مواد کو مراتب کیا اور مکمل کیا۔ اور نہایت قیمتی حواشی سے ان کو مفید تر بنانے کی کوشش کی۔ عرشی صاحب کو خاص طور پر مذہب، تاریخ، تنقید ادب، تحقیق ادب سے دلچسپی تھی اس لئے انھوں نے اپنی دقت نظر اور تحقیق وتفحص سے جو کام کئے ان کا مرتبہ دنیائے ادب میں بلند ہے۔ مولانا عرشی کا تبحر علمی، ذوق تنقید اور نکتہ رسی وژرف نگاہی مسلم ہے۔ وہ ایک جید عالم اور اردو، فارسی اور عربی کے بلند پایہ محقق رہے ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ علم وادب کے لئے وقف تھا۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی شعبے کی تحقیق وجستجو میں مصروف رہے۔ مولانا عرشی کے مرتبات، حواشی اور مقدمات زیادہ تر کا تعلق اردو فارسی عربی ادب ولغت سے رہا ہے۔

ان کی عام تصنیفی زبان اردو ہے لیکن انھوں نے عربی قدیم میں بھی لکھا ہے۔ صحت زبان کا خاص خیال رکھا ہے۔ جس کا عرب علماء نے بھی اعتراف کیا۔ عقلیات یا معقولات، منطق، فلسفہ، کلام اور اصول ان کا مذاق نہیں رہا چنانچہ ان فنون پر انھوں نے کوئی کتاب مرتب نہیں کی۔ مولانا عرشی چونکہ مذہبی ذہن بھی رکھتے تھے اور اس تعلق سے ان کا مسلک بغیر کسی تعصب کے حنفی مسلک تھا لیکن حنفی ہونے کے باوجود اندھی تقلید کے حامی نہ تھے۔

مولانا عرشی نے رام پور کی رضا لائبریری کو از سر نو منظّم کیا اور اس کی حیثیت بین الاقوامی سطح پر منوائی۔ آج اس لائبریری میں جتنی نادرونایاب کتابیں، مخطوطات اور دیگر اشیاء ہیں وہ بہت کم لائبریروں میں ملتی ہیں۔ ان کی دیکھ ریکھ میں عرشی صاحب نے اپنا لہو پانی کر دیا تھا۔ انھوں نے کتب خانے کی فہرست سازی کے کام میں جتنا وقت لگایا اور جدید ترتیب کے مطابق کتابوں کو منظّم کی، یہ بزات خود ایک اہم کارنامہ ہے۔ اس کام میں نواب رام پور نے ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ کتب خانے کی ایسی اصلاح و تنظیم کی کہ ملک کے اکثر مشاہیر علم وادب نے اس کو دنیا کا ایک ایسا عظیم کارنامہ کہا جس پر ہمیشہ فخر کیا جا سکتا ہے۔

کتابوں سے لگاؤ کی بناء پر اور ان کے ساتھ لگے رہنے کے باعث ان کا ذوق جنونِ تحقیق اور بھی شدت اختیار کر گیا۔ متعدد علمی وادبی کتابوں کا مسلسل مطالعہ کیا جس سے ان کے ذوق کو جلا ملی۔

مولانا عرشی خط وکتابت میں بھی چاق وچوبند تھے۔ وہ کسی بھی علمی ادبی بحث یا کسی معلومات کے لئے ایسے خطوط کا جواب فی الفور دیتے جو جواب طلب ہوتے تھے۔ انھوں نے اپنے خطوط میں بھی بعض ایسے نکات پیش کئے ہیں جو تحقیق کے زمرے میں آتے ہیں ان کے مکاتیب کا مجموعہ تو شائع ہوا ہے لیکن اب بھی کئی خطوط اشاعت کے منتظر ہیں۔ ان کے علمی وادبی ذوق کی گہرائی کا

پتہ ان خطوط سے بھی لگتا ہے۔

غالب کے دیوان، نسخۂ عرشی ان کا ایک اہم کارنامہ ہے جس پر 1961 میں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ملا تھا۔ بطور عظیم محقق اور ماہر غالبیات مولانا عرشی نے اردو ادب کو اپنی خدمات سے اس قدر نوازا کہ امتیاز علی خان عرشی کے نام اور کام کے بغیر تحقیق و تلاش کی تاریخ ممکن نہیں ہوسکتی۔ ان کی تحقیقی تصنیفات و تالیفات کی فہرست لمبی ہے۔ انھوں نے بے شمار مقالات بھی لکھے جو ہندو پاک کے اہم رسائل میں شائع ہوئے۔ انھوں نے درحقیقت اردو فاسی اور فن تحقیق و تنقید میں جو اعلیٰ معیار پیش کیا ہے وہ نہ صرف قابل قدر ہے بلکہ قابل تقلید بھی ہے۔

مولانا امتیاز علی خان عرشی بعض اعتبار سے ہندو پاک کے اکثر محققین سے ان معنوں میں ممتاز ہیں کہ ان کی تمام تر شہرت اردو محقق اور ماہر غالبیات کی حیثیت سے ہے لیکن یہ محض تصویر کا ایک رخ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ عربی و فارسی کے بھی زبردست عالم، محقق، دانشور تھے اور اس تخصیص کے اعتبار سے چند ہی محقق ان کے ہم پلہ ہوں گے۔ اردو میں ان کے علمی و ادبی کارناموں کو عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

9.3 مولوی عبدالحق: حیات اور ادبی کارنامے

9.3.1 مولوی عبدالحق: سوانحی کوائف اور حالات زندگی

مولوی عبدالحق کی تاریخ پیدائش اور جائے پیدائش کے بارے میں محققین کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود متفقہ طور پر یہ امر قابل قبول ہے کہ ان کی تاریخ پیدائش ۲۰ اگست ۱۸۷۰ء کو ہوئی تھی کیونکہ انجمن ترقی اردو کراچی کے احاطے میں مدفون مولوی عبدالحق کے لوحِ مزار پر جو تاریخ درج ہے اس کے مطابق مولوی عبدالحق ۲۰ اگست ۱۸۷۰ء (مطابق ۲۲ جمادی الاوّل ۱۲۸۷ھ روز شنبہ) کو پیدا ہوئے۔

ان کی جائے پیدائش کے تعلق سے بھی اختلاف ہے۔ کوئی ہاپوڑ بتاتا ہے تو کوئی سراوہ۔ حالانکہ مشہور محقق مشفق خواجہ نے مولوی عبدالحق کی زندگی میں ان پر ایک سوانحی نوٹ تیار کیا تھا جس پر مولوی عبدالحق نے منظوری بھی دی تھی جس کی تصدیق ممتاز حسین نے اپنے ایک مضمون اقبال اور عبدالحق، ص ۱۵ میں کہا ہے، اس کے مطابق ان کا مولد ہاپوڑ کے بجائے سراوہ ہی قرار پاتا ہے حالانکہ ہاپوڑ اور سراوہ میں زیادہ فاصلہ نہیں بس پندرہ بیس میل کا فاصلہ ہے۔

مولوی عبدالحق کے والد شیخ علی حسین کی آٹھ اولادیں ہوئیں، چار لڑکے اور چار لڑکیاں۔ مولوی عبدالحق کی ادبی زندگی کا آغاز ۸۸-۱۸۸۷ء کے آس پاس میں ہوئی جب ان کی عمر ۱۷-۱۸ سال تھی۔ علی گڑھ میں تعلیم کے دوران انھوں نے اپنی ادبی سرگرمیوں کو تیز تر کر ہوا تھا دراصل انھیں وہاں ایسا ماحول نصیب ہوا جو ان کی تحریکی، تحقیقی اور علمی و ادبی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے لئے مثال ثابت ہوا۔ اس زمانے میں سرزمین علی گڑھ مشاہیر ادب کی آماجگاہ نہیں ہوئی تھی۔ ان میں سرسید احمد خان، مولانا الطاف حسین حالی، مولوی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ اور علامہ شبلی نعمانی کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان حصوں میں بالخصوص سرسید اور حالی

سے ان کے روابط بڑے گہرے ہوتے گئے تھے۔اس طرح علی گڑھ کے دوران قیام مولوی عبدالحق کی ادبی زندگی کی علمی بنیادیں مضبوط ہوئیں۔

علی گڑھ سے بی اے کرنے کے بعد سر سید کے ایماء پر نواب محسن الملک نے مولوی عبدالحق کو حیدرآباد بھیجا جہاں نواب وقارالملک نے ان کا تقرر ہیڈ ماسٹر مدرسہ آصفیہ کے عہدے پر کر دیا۔ یہاں کے نواب اختر الملک کی سر پرستی میں ''افسر'' نام کا ایک ماہانہ ادبی رسالہ شائع ہوتا تھا۔مولوی عبدالحق کی آمد کے بعد اس رسالے کی ادارت ۱۹۰۰ء میں ان کے ذمہ سونپ دی گئی۔ یہاں ان کا بہت زیادہ دنوں تک دل نہ سکا تو ۱۹۱۱ء میں ان کو عارضی طور پر مہتمم تعلیمات اونگ آباد مقرر کیا گیا اور پھر یہ عہدہ مستقل طور پر مل گیا۔ یہاں انھیں انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری کی ذمہ داری ملی۔

انجمن ترقی اردو کا قیام جنوری ۱۹۰۳ء میں دہلی میں ہوا تھا اور پورے ملک میں آہستہ آہستہ کی شاخیں قائم کی جانے لگیں۔ اسی دور میں مولوی عبدالحق نے دولت عثمانیہ کو اردو یونیورسٹی کے قیام پر رضا مند کیا۔ یہ مولوی عبدالحق ہی تھے جنھوں نے بہترین تعلیمی ماحول کی فراہمی کے لئے بھرپور اقدامات کئے اور کالج کو جدید خطوط پر استوار کیا۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد یہاں ایک شعبہ دارالترجمہ قائم کیا گیا جس کے ناظم مولوی عبدالحق مقرر کئے گئے۔ دارالترجمہ کے زیر اہتمام بہت سی اہم کتابوں کے اردو ترجمے کے گئے۔وہ مسلسل ایک شہر سے دوسرے شہر کو مراجعت کرتے رہے۔ یہاں سے وہ دہلی آگئے اور وہلی کو ہندوستان کا مرکز سمجھتے ہوئے یہیں سے انھوں نے ہندوستان کے مختلف بڑے شہروں میں اردو زبان کو رواج دینے اور اس کو جائز مقام دلانے کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔

مولوی عبدالحق اردو کو ہندو مسلم اتحاد کی علامت سمجھتے تھے۔ان کے مطابق یہ زبان ان دونوں بڑی قومی کی مشترکہ کاوشوں کا ثمر ہے۔ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں کئی یونیورسٹیوں نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی سندیں عطا کیں۔الہ آباد یونیورسٹی نے بھی ۱۹۳۷ء میں ان کو ڈی لٹ کی اعزازی سند عطا کی تھی۔

مولوی عبدالحق جنوری ۱۹۴۹ء میں پاکستان ہجرت کر گئے اور یہاں آ کر اردو زبان وادب کی خدمت میں لگ گئے۔ یہاں وہ اپنی زندگی کے بارہ تیرہ سال ہی گزار سکے۔اور ۱۶/اگست ۱۹۶۱ء کو اس دار فانی سے کوچ کیا۔نماز جنازہ مولانا احتشام الحق تھانوی نے پڑھائی جس میں تقریباً پندرہ ہزار افراد شریک تھے۔

9.3.2 مولوی عبدالحق کی تصنیفات وتالیفات

مولوی عبدالحق کی تصنیفات وتالیفات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ گلشن بہار (مشہور شعرائے اردو کا تذکرہ)۔۱۹۰۶۔رفاہ عام اسٹیم پریس۔لاہور

۲۔ انتخاب مضامین رسالہ ''حسن'' مرتبہ مولوی عبدالحق۔حیدرآباد۔سن ندارد

۳۔ قواعد اردو۔دارالاشاعت انجمن ترقی اردو،لکھنؤ۔۱۹۱۴ء

۴۔ دریائے لطافت:مرزا قتیل اور سید انشاء اللہ خان انشا۔۱۸۰۲ء(فارسی)

مرتب: مولوی عبدالحق، الناظر پریس لکھنؤ۔ ۱۹۱۶ء

۵۔ انتخاب کلام میر۔ مرتبہ: مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو ہند، حیدرآباد۔ ۱۹۲۱ء

۶۔ مثنوی خواب وخیال: میر اثر کی مثنوی، مرتبہ: مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد۔ ۱۹۲۶ء

۷۔ چمنستان شعرا: رائے لچھمن نرائن شفیق، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد۔ ۱۹۲۸ء

۸۔ ذکر میر: مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد۔ ۱۹۲۸ء

۹۔ مخزن نکات: شیخ محمد قیام الدین قائم چاندلوری۔ انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد۔ ۱۹۲۹ء

۱۰۔ دیوان اثر: خواجہ میر اثر۔ مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ۔ ۱۹۳۰ء۔ بہ اہتمام انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد

۱۱۔ باغ و بہار: میر امن دہلوی ۱۸۶۰۔ مرتبہ: مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو دہلی۔ ۱۹۴۴ء

۱۲۔ معراج العاشقین: سید محمد حسینی بندہ نواز گیسودراز، مرتبہ: مولوی عبدالحق، تاج پریس، حیدرآباد۔ ۱۹۳۴ء

۱۳۔ سب رس۔ ملا وجہی۔ مرتبہ: مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد۔ ۱۹۳۲ء

۱۴۔ مرحوم دہلی کالج: مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد۔ ۱۹۳۳ء

۱۵۔ مخزن شعرا: قاضی نوازالدین خان رضوی فائق، مرتب: مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد۔ ۱۹۳۳ء

۱۶۔ مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر: مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد۔ ۱۹۳۳ء

۱۷۔ کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان: انشاء اللہ خان انشا، مرتب: مولوی عبدالحق ۱۹۲۶ء

۱۸۔ تذکرہ ہندی: غلام صدانی مصحفی، مرتب: مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد۔ ۱۹۳۳ء

۱۹۔ عقد ثریا: (تذکرہ فارسی گویاں) غلام ہمدانی مصحفی، مرتب: مولوی عبدالحق۔ ۱۹۳۴ء

۲۰۔ ریاض الفصحا: (تذکرہ ہندی گویاں) غلام ہمدانی مصحفی، مرتب مولوی عبدالحق، جامع برقی پریس، دہلی۔ ۱۹۳۴ء

۲۱۔ تذکرہ ریختہ گویاں: سید فتح علی گرویزی، مرتب مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد۔ ۱۹۴۳ء

۲۲۔ معراج العاشقین: بندہ نواز خواجہ گیسودراز، مرتب مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد۔ ۱۹۳۴ء

۲۳۔ نکات الشعراء: میر تقی میر، مرتب: مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد۔ ۱۹۳۵ء

۲۴۔ دیوان تاباں: میر عبدالحئی تاباں، مرتب: مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد۔ ۱۹۳۵ء

۲۵۔ گل عجائب: اسد علی خان تمنا اورنگ آبادی، مرتب: مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد۔ ۱۹۳۶ء

۳۶۔ قطب مشتری: اسداللہ وجہی، مرتب: مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد۔ ۱۹۳۹ء

۲۷۔ گلشن عشق: ملا نصرتی مرتب: مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد۔ ۱۹۵۲ء

۲۸۔ اردو کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ، مرتب: مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد۔ ۱۹۴۹ء

اس کے علاوہ ان کی کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ جن میں مقدمات، خطبات اور مقالات شامل ہیں۔ رسالہ اردو

ہی شائع ہونے والے تبصروں کی تعداد ان گنت ہے۔قواعد،لسانیات،لغت پر ان کی کتابیں موجود ہیں۔اپنے معاصرین پر خاکوں کا مجموعہ بھی ان کی یادگار تصانیف میں سے ایک ہے۔ان کے مکاتیب کے بھی کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔انھوں نے کئی اہم کتابوں کے تراجم بھی کئے۔

9.3.3 مولوی عبدالحق کے تحقیقی کارنامے۔اوصاف وامتیازات

مولوی عبدالحق کا باقاعدہ تصنیف وتالیف کا سلسلہ ۱۹۰۵ء میں مولانا ظفر علی خان کی کتاب ''جنگ روس و جاپان'' کے مقدمہ سے شروع ہوا اور اس کی آخری کڑی ''قاموس الکتب'' کا مقدمہ ہے جو انھوں نے بستر مرگ پر ۲۲ جون ۱۹۶۱ء کو جناح اسپتال کراچی میں مکمل کیا تھا۔

مولوی عبدالحق کے تحقیقی کارناموں اور تصنیفی وتالیفی خدمات کا دامن بے حد وسیع ہے۔

''گلشن ہند'' ایک ایسا تذکرہ ہے جسے مشہور متشرق جان گل کرسٹ کی فرمائش پر مرزا علی لطف نے ۱۸۰۱ء میں علی ابراہیم خان کے فارسی تذکرۂ شعراء ''گلزار ابراہیم'' سے انتخاب کیا ہے۔انھوں نے تین سوبیس شعرا میں سے صرف ۶۸ شعرا کا حال فارسی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔مولوی عبدالحق نے اس کتاب کا مقدمہ تحریر کیا جس میں انھوں نے متشرقین کی اردونوازی کا ذکر ضروری سمجھا اور فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات اور تصنیفات وتالیفات کا بھی جائزہ لیا۔طویل مقدمے کے ساتھ شائع شدہ اس کتاب میں مولوی عبدالحق نے مرزا لطف علی کے حالات زندگی بھی بیان کئے ہیں۔۔یہ تذکرہ ۱۹۰۶ء میں لاہور سے شائع ہوا تھا۔

''دریائے لطافت'' مرزا قتیل اور انشاء اللہ خان انشا کی مشترکہ فارسی تصنیف ہے جو ۱۸۰۲ء میں تالیف ہوئی تھی۔۱۹۴۸ء میں مطبع آفتاب عالم مرشد آباد سے شائع ہوئی۔مولوی عبدالحق نے اس اہم کتاب کو مرتب کیا جسے ۱۹۱۶ء میں الناظر پریس لکھنؤ نے شائع کیا تھا۔اس کتاب میں ایک طویل مقدمہ انھوں نے لکھا جس میں انشا کی لسانی خدمات کا بھرپور تجزیہ کیا ہے۔دوسری مرتبہ ۱۹۳۵ء میں مولوی عبدالحق نے دریائے لطافت کو پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کے ترجمے اور اپنے مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے شائع کرایا۔

انتخاب کلام میر بظاہر انتخاب ہے لیکن اس کا طویل مقدمہ میر کی شاعرانہ خوبیوں کو ہی اجاگر نہیں کرتا۔بلکہ میر تقی میر کے مخفی اور ظاہری حالات زندگی،ان کے خاندان ووطن،ان کی دلی آمد اور خان آرزو سے تعلقات اور ان کی پریشانی،دلی کی بربادی پر لکھنؤ کی طرف ہجرت اور وہاں کے روز وشب اور میر کی آشفتہ مزاجی وغیرہ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔یہ کتاب ۱۹۲۱ء میں حیدرآباد سے شائع ہوئی۔

خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی میر اثر کی مثنوی ''خواب وخیال'' کو مرتب کر کے مولوی عبدالحق نے ایک اہم کام انجام دیا۔کیونکہ یہ گم شدہ مثنوی مولوی عبدالحق کی دریافت رہی ہے۔میر اثر کے حالات زندگی بہت کم تذکروں میں ملتے ہیں پھر بھی مولوی صاحب نے مختلف تذکروں کی مدد سے اس کتاب کے مقدمے میں ان کے حالات زندگی کے ساتھ اس مثنوی کی خوبیوں کا بھی تفصیلی بیان کیا ہے۔

رائے لچھمن نرائن شفیق کے تذکرے ''چمنستان شعرا'' کومولوی عبدالحق نے ۱۹۲۸ء میں انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد کے زیر اہتمام ۱۹۲۸ء میں شائع کرایا۔اس تذکرے میں ۲۱۳ شعرا کا بیان ہے۔اس کتاب میں مولوی عبدالحق نے طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں شفیق کے سوانحی کوائف کے ساتھ ان کی دوسری تصانیف کا بھی تحقیقی جائزہ لیا ہے۔ان کا کہنا ہے یہ چمنستان شعراء تاریخی نام ہے اور اس سے ۱۱۷۵ھ سن تالیف نکلتا ہے۔

مولوی عبدالحق نے ۱۹۲۸ء میں میرتقی میر کی خودنوشت سوانح عمری انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد کے زیر اہتمام شائع کی جس پر انھوں نے ایک مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ یہ خودنوشتہ سوانح عمری گوشۂ گمنانی میں تھی لیکن اتفاق سے ان کو ۱۸۰۸ء کا ایک کتابت شدہ نسخہ اٹاوہ کے مولوی بشیرالدین سے مل گیا۔ایک دوسرا نسخہ پروفیسر محمد شفیع لاہور سے ملا۔دونوں نسخوں کی مدد سے ''ذکر میر'' مرتب کیا۔

''مخزن نکات'' محمد قیام الدین قائم چاند پوری کا ایک اہم تذکرہ ہے۔اس کتاب کی دریافت اور اس کی ازسرنو اشاعت مولوی عبدالحق کا ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔اس تذکرے کے شروع میں پچیس صفحوں کا ایک مقدمہ مع ۱۸۰/اشعار، ایک رباعی اور ایک قطعہ تحریر کیا ہے۔مقدمے میں قائم چاند پوری کے حالات زندگی، ان کے اساتذہ اور تذکرہ کی تالیف کے تعلق سے بھرپور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

مولوی عبدالحق نے خواجہ میر اثر کے دیوان کا زیادہ حصہ دو قلمی نسخوں کی مدد سے مرتب کیا ہے۔''دیوان اثر'' ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔اس میں جو مقدمہ لکھا گیا ہے اس میں اثر کے کلام کے اسلوب و انداز کا موازنہ میرتقی میر کے کلام سے کیا ہے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اس شاعر کے حالات زندگی کو جو کچھ بھی مل سکے شامل کیا ہے۔

''باغ و بہار'' میر امن دہلوی اور جان گلکرسٹ کی فارسی سے ترجمہ شدہ تالیف ہے۔مولوی عبدالحق نے ''باغ و بہار'' پر ۱۹۳۰ء میں توجہ دی اور اس پر ایک تفصیلی مضمون اپنے رسالہ اردو کے لئے لکھا۔ جب کتاب شائع ہوئی تو اسے اضافے کے لئے ساتھ بطور مقدمہ شامل کیا۔مولوی عبدالحق نے جان گلکریٹ کے اس خیال کو بے بنیاد ثابت کیا کہ ''باغ و بہار'' کا قصہ امیر خسرو کی چہار درویش سے ماخوذ ہے اور تحقیق کی کہ اس تالیف کا ماخذ صرف محمد عطا حسین عطا خان تحسین، اٹاوہ کی تصنیف ''نوطرز مرجع'' ہے۔ اپنے تحقیقی دلائل و براہین میں انھوں نے جو شواہد جمع کئے وہ حد درجہ تحقیقی کاوش ہے۔

ملا وجہی کی کتاب ''سب رس'' کو مرتب کرنے سے پہلے رسالہ ''اردو'' کے اکتوبر ۱۹۲۴ء کے شمارے میں طبع زاد نہیں ہے بلکہ اس کا ماخذ مثنوی ''دستور عشق'' ہے جو محمد یحیٰ ابن سبیک فتاحی نیشاپوری کی تحریر ہے جسے اس نے ''شبستان خیال'' اور ''حسن و دل'' کے ناموں سے الگ الگ تحریر کیا ہے۔مولوی عبدالحق کی تحقیق ہے کہ ملا وجہی سے قبل بھی یورپ اور برصغیر کے بعض مصنفین و شعرا نے اس قصے کا فارسی، ترکی اور انگریزی وغیرہ میں ترجمہ کیا ہے۔البتہ وجہی کو اردو میں یہ قصہ تمثیل کرنے کی اولیت حاصل ہے اور ماخوذ ہونے کے باوجود وجہی نے اسے طبع زاد سے قریب تر کر دیا ہے۔ یہ قصہ تمثیلی اعتبار سے پند و نصائح کا مرقع بھی ہے اور حسن و عشق کی داستان بھی۔

''مرحوم دہلی کالج'' کے نام سے مولوی عبدالحق نے ''دہلی کالج'' کی ایک مبسوط تاریخ تحریر کی ہے۔اس تحقیقی کتاب میں انھوں نے ایک صدی سے زائد عرصے پر محیط کالج کی اردو زبان اور علم وادب کی گراں قدر خدمات کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔اس کالج کے تعلق سے ایسے ایسے تحقیقی نکات انھوں نے پیش کیے ہیں کہ کالج کی پوری تاریخ آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔گردش زمانہ کے ہاتھوں کالج کس طرح اپنے کو کامیاب بنا سکا اس کی پوری روداد اس میں شامل ہے۔حتیٰ کہ مولوی عبدالحق نے کالج کے ۶ انگریز اور ۱۷ دیسی اساتذہ کا بھی ذکر کیا ہے اور ایسے ۲۴ قدیم طلبہ کا بھی ذکر ہے جو آنے والے زمانے میں نامور ہوئے۔مثلاً ڈپٹی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد،، ماسٹر رام چندر، اور منشی ذکاء اللہ۔ یہ کتاب ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی تھی لیکن آج بھی اس کی تاریخی و تحقیقی حیثیت قائم ہے۔

مولوی عبدالحق کا ایک اہم تحقیقی کام قاضی نورالدین خان رضوی فائق کے تذکرے ''مخزن شعرا'' کی ترتیب و تدوین ہے۔ یہ تذکرہ بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری کے گجرات کے ایک سو گیارہ شعرائے اردو کے حالات اور نمونہ ہائے کلام پر مشتمل ہے۔فائق اور غالب ایک ہی زمانے کے شاعر تھے۔فائق نے اس تذکرہ پر غالب سے نظر ثانی تصحیح کرائی تھی جس کا ذکر خود غلب نے اپنے ایک خط میں کیا ہے۔مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمے میں اہل گجرات کی علمی وادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا ہے کہ گجرات کی معاشرت اور زبان پر دہلی کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔فائق نے اس تذکرہ میں ولی دکنی کو گجراتی ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔''مخزن شعراء'' کتاب کا نام تاریخی ہے جس سے سن تکمیل ۱۲۶۸ھ نکلتا ہے۔

مولوی عبدالحق نے اپریل ۱۹۲۱ء میں اپنے رسالے ''اردو'' میں ''مراٹھی زبان پر فارسی کا اثر'' کے زیر عنوان ایک طویل مقالہ لکھا تھا جسے بعد میں مرہٹی اقتباسات اور اردو زبان کے حوالے سے مزید درستی اور تصحیح کے بعد کتابی شکل میں شائع کیا۔ یہ ان کی اہم تحقیقی کتاب ہے جس کا تعلق لسانی تحقیق سے ہے۔اس کتاب میں انھوں نے مہاراشٹر میں مسلمانوں کی آمد اور اس کے تاریخی، سماجی اور معاشرتی اثرات اور ہندو مسلم روابط کا تذکرہ بڑی تفصیل سے کیا ہے۔

قصہ کہانی کے حوالے سے انشاء اللہ خان انشا کی مشہور کتاب کہانی ''رانی کیتکی کی اور کنور اودھے بھان کی'' کو مولوی عبدالحق نے مرتب کر کے ۱۹۲۶ء میں شائع کیا۔اس کہانی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فارسی اور عربی کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں کیا گیا ہے اور نہ ہی خالص ہندی یا سنسکرت کی چھاپ ہے بلکہ آسان زبانمیں کہانی لکھی گئی ہے۔اس کتاب کا دیباچہ مولوی عبدالحق کا تحریر کردہ ہے، تحقیق کے گئی اہم گوشوں کو واشگاف کرتا ہے۔

''تزکرہ ہندی'' غلام ہمدانی مصحفی کی تالیف ہے۔اس تذکرے کو مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمے کے ساتھ مرتب کیا ہے جس میں مصحفی کے تزکرہ ''ریاض الفصحا'' کو بنیاد بنا کر مصحفی کے حالات زندگی، تعلیم و تربیت اور خاندانی پس منظر پہ روشنی ڈالی ہے۔ مولوی عبدالحق نے مصحفی کے تذکرے کا یہ نسخہ مختلف نسخوں کی مدد سے مرتب کیا تھا۔ یہ تذکرہ ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔

''عقد ثریا'' بھی غلام ہمدانی مصحفی کی تالیف ہے جس میں ''تذکرہ فارسی گویاں'' ہے۔ یہ تذکرہ مصحفی نے فارسی زبان میں لکھا تھا۔مولوی عبدالحق کو اس تذکرے کے تین مختلف نسخے ملے تھے۔جن پر اپنی تحقیقی کاوشوں سے مرتب کیا جو پہلی بار ۱۹۳۴ء میں

شائع ہوا۔اس میں مولوی عبدالحق کا جومقدمہ ہے وہ مصحفی کے حالات زندگی اوران کے ادبی کارناموں کا مکمل احاطہ کرتا ہے۔

ریاض الفحا: (تذکرہ ہندی گویاں)

غلام ہمدانی مصحفی کے اس تذکرے کومولوی عبدالحق نے خدابخش لائبریری پٹنہ کے اس نسخے کی مدد سے مرتب کیا تھا جسے رمضان بیگ طیاں نے ۱۲۳۷ھ میں کتابت کیا تھا۔اس کی ضخامت مصحفی کے دوسرے تذکروں سے زیادہ ہے۔مولوی عبدالحق نے اپنے طویل مقدمے میں لکھا تھا کہ اس تذکرے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ جن لوگوں کے نام پہلے تذکرے میں چھوٹ گئے تھے انھیں شامل کرلیا گیا ہے۔اس تذکرہ میں ۳۲۱ شعراء کا ذکرحروف تہجی کے اعتبار سے کیا گیا ہے۔

''تذکرہ ریختہ گویاں'' جوسید فتح علی گردیزی کی تالیف ہے جس میں ۹۸ شعراء کا ذکر ہے۔مولوی عبدالحق نے اسے تین مختلف قلمی نسخوں کی مدد سے مرتب کر کے ۱۹۳۴ء میں شائع کرایا۔مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمے میں فتح علی گردیزی کی دیگر تصنیفات کا تفصیلی ذکر بھی ہے اوران کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔

''معراج العاشقین'' جو بندہ نواز خواجہ گیسو دراز کی کتاب ہے،مولوی عبدالحق نے مرتب کر کے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کی۔اخلاق وتصوف کے موضوع پر یہ کتاب منظر عام پرآنے سے مولوی عبدالحق کی تحقیقی فکرونظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

''نکات الشعراء'' میرتقی میرؔ کی مشہور زمانہ تالیف ہے۔یہ تذکرہ ۱۰۳ شعراء کے ذکر پر مشتمل ہے۔جس میں میر نے خودکوبھی شامل کیا ہے۔مولوی عبدالحق کوشاعری میں میر بہت پسند تھے یہی سبب ہے کہ ان کے کئی ادبی کارناموں کو نئے سرے سے سامنے لانے میں انھوں نے اہم تحقیقی فریضہ انجام دیا ہے۔

''دیوان تاباں'' کی ترتیب پرعبدالحئی تاباں کے تین مختلف نسخوں کوسامنے رکھ کرمولوی عبدالحق نے دی ہے۔مولوی عبدالحق نے جومقدمہ لکھا ہے اس میں اعتراف کیا ہے کہ عبدالحئی تاباں شاہجہاں آباد کے رہنے والے اوردور محمد شاہی کے شعراء میں تھے۔عین عالم شباب میں

کثرت شراب کے باعث انتقال کرگئے۔مولوی عبدالحئی کی یہ تلاش تحقیقی کارناموں میں ہمیشہ یادرکھی جائے گی۔

''گل عجائب'' اسدعلی خان تمنا اورنگ آبادی کی ایسی تالیف ہے جس میں تذکرۂ شاعراں ہے۔مولوی عبدالحق نے اس تذکرے کوکتب خانہ آصفیہ حیدرآباد کے نسخے کی مدد سے مرتب کیا اورایک گم شدہ کتاب کوزمانہ بردھونے سے بچالیا۔مولوی عبدالحق نے اسدعلی خان تمنا کے حالات زندگی کے تعلق سے خوب چھان بین کی اور مختلف تذکروں سے ان کا احوال دریافت کیا۔یہ ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔

''قطب مشتری'' عہد شاہی کے ملک الشعراء ملا اسداللہ وجہی کی مثنوی ہے۔مولوی عبدالحق نے دوقلمی نسخوں کی مدد سے اسے مرتب کیا ہے۔یہ مثنوی ملا وجہی نے ۱۰۱۸ھ میں لکھی تھی جس میں سلطان محمد قلی قطب شاہ بادشاہ گولکنڈہ کے عشق تا حال بیان کیا گیا ہے۔مولوی عبدالحق نے اسے اپنے مقدمے کے ساتھ ۱۹۳۰ء میں شائع کرایا۔

''گلشن عشق'' ملا نصرتی کی پہلی تصنیف ہے جوایک عشقیہ مثنوی ہے۔مولوی عبدالحق نے تحقیق کر کے اس مثنوی کی تدوین

کی اور ایک مقدمہ کے ساتھ اسے ۱۹۵۲ء میں انجمن ترقی اردو کراچی سے شائع کرایا۔

مولوی عبدالحق نے جس قدر تحقیقی کام کیے ہیں وہ کسی دوسرے محقق کے حصے میں نہیں آیا۔ انھوں نے اردو زبان و ادب کے تعلق سے گم شدہ کتابوں، شاعروں، مصنفوں کی تلاش کو اپنا مقصد حیات بنا لیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ قدیم کتابوں کی از سر نو ترتیب و تدوین کا کام انھوں نے بڑی عرق ریزی اور دلجمعی کے ساتھ کیا۔

مولوی عبدالحق کی تحقیقی سرگرمایاں کسی ایک جہت پر کبھی مرکوز نہیں رہیں۔ انھوں نے ادبی، لسانی اور زبان کے حوالے سے موضوعات کا انتخاب کیا۔ نایاب قدیم مخطوطات کو دریافت کر کے انھیں ادبی دنیا سے متعارف کرایا۔ قدیم تذکروں اور کئی اہم شاعروں کے دیوان کی دریافت کی اور انھیں تدوین و تصحیح کے ساتھ کیا۔ انھوں نے جو بھی کام کیا وہ ٹھوس اور پائیدار رہا۔ اور زبان کی تشکیل و ترقی کے لئے انھوں نے کئی منصوبے بنائے جو حکومتی سطح پر تسلیم کیے گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تحقیق مولوی عبدالحق کا اصل میدان رہا ہے اور انھوں نے آنے والی نسل کے لئے کئی اہم راستہ دکھائے اور تحقیق میں ترتیب و تدوین کے اصول وضوابط وضع کر کے انھوں نے تحقیق کرنے والوں کے لئے راستہ روشن کیے۔

9.4 امتیاز علی خان عرشی: حیات اور ادبی کارنامے

9.4.1 امتیاز علی خان عرشی: سوانحی کوائف اور حالات زندگی

مولانا امتیاز علی خان کی پیدائش ۸ دسمبر ۱۹۰۴ء مطابق ۲۹ رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ کو اپنے مکان محلّہ پھلوار (رام پور) میں ہوئی۔ اس ماہ مبارک کی تمام برکات و فیوض ان کے حمیدہ اوصاف و فضائل میں ہیں۔

عرشی صاحب کا خاندان افغانستان کے یوسف زئی سلسلہ میں اکوزئی شاخ حاجی خیل سے تعلق رکھتا ہے۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ کو ہندوستان آئے سوا سو سال ہوئے تھے اور اسی عہد سے ان کے آبا و اجداد رام پور کے محلّہ پھلوار میں سکونت پذیر ہوئے۔ ان کے دادا مولوی اکبر علی خان اپنے عہد کے جید عالم اور مشہور محدث تھے لیکن عرشی صاحب کے والد ممتاز علی خان کو ورثہ میں ان علوم کا کوئی حصہ نہ ملا۔ ان کے والد رام پور کے مویشی خانہ سرکاری کے اسپتال میں افسر اعلیٰ تھے۔ عرشی صاحب کو تعلیم سے لگاؤ تھا لیکن ان کا رجحان انگریزی تعلیم کی طرف زیادہ نہ تھا۔ انھوں نے رام پور کے مشہور زمانہ درسگاہوں، مدرسہ مطلع العلوم، و مدرسہ عالیہ میں عربی و فارسی کے مروجہ درسیات حاصل کئے اور 1924 میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کی سند حاصل کی۔ بعد ازاں انگریزی ادب سے معقول استفادہ کیا۔ اس طرح اپنے ذوق اور ضرورت وقت کے لحاظ سے علوم جدیدہ میں وافر استعداد فراہم پہنچائی۔ انھوں نے ندوۃ العلماء سے بھی اپنا رابطہ رکھا۔

عرشی کا زیادہ وقت مشرقی علوم کے مطالعے اور چھان بین میں صرف ہوتا تھا۔ ان کے احباب کا حلقہ زیادہ وسیع نہ تھا ابتدا

میں مولوی عزیز لالہ خان عزیز، مرزا ہادی علی بیگ وامق شادانی،عندلیب شادانی سے روابط رہے اور ان سب کے ساتھ اپنی ادبی و علمی سرگرمیوں کو جاری وساری رکھا۔عرشی صاحب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ نیک سیرت، نیک نفس اور سادہ مزاج انسان تھے۔ان کا رہن سہن،لباس وضع قطع خالص مشرقی تھا۔

رضا لائبریری جو پہلے خانہ عالیہ رام پور کہلاتی تھی کے ناظم اعلیٰ مسٹر چمپین Mr. Champan سے ان کا رابطہ بنا۔ مولانا عرشی اس لائبریری کو دیکھنے برابر آتے اوراس لائبریری کے نایاب و نادر کتابوں سے استفادہ کر کے کئی سال تک خلیفہ دوئم حضرت عمر فاروقؓ کے خطبات وخطوط اور حکیمانہ اقوال کی تحقیقات کی اور ان کو مرتب کیا۔مسٹر چمپین نے ان کی علمی ذوق وتجسس کو دیکھتے ہوئے ان کو اپنی نیابت کے لئے رضامند کرلیا۔عرشی صاحب نے یہ عہدہ 1932ء میں اس لئے قبول کرلیا کہ انھیں کتابوں سے عشق تھا۔اوران کا زیادہ تر وقت یہیں صرف ہوتا تھا۔مسٹر چمپین تو ان کی صلاحیتوں کے قائل تھے ہی ساتھ ہی نواب رام پور کو بھی جب عرشی صاحب کی صلاحیتوں کا علم ہوا تو ان کے لئے دل میں جگہ بنی اور وہ عرشی صاحب کو قابل احترام سمجھنے لگے۔عرشی صاحب نے چمپین کی رہنمائی میں لائبریری میں بڑی تندہی اور دل سوزی سے کام کیا۔انھوں نے کتب خانہ کو ازسرنو منظّم کرنے کی غرض سے خود کو اس کے لئے لگادیا اورکئی سال کی شبانہ روز جانفشانی کے بعد اسے درست حالت میں لادیا۔

وہ ایک خوش بیان مقرر بھی تھے۔اورطرز بدیع کے مالک بلند پایہ انشاء پرداز اور خوش فکر شاعر بھی۔گفتار وکردار کی یکسانیت نے ان کی شخصیت میں ایک امتیازی شان پیدا کردی تھی۔نیاز فتح پوری نے ''نگار'' کے مارچ 1943 کے شمار میں لکھا تھا:

> ''مولانا عرشی سے بھی صحبتیں رہیں۔وہ حددرجہ پرلطف ہیں۔مولویوں کے طبقے میں مولانا عرشی کی ذات واحد ایسی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اپنی محبت سے مجھے کافر بھی بنا سکتے ہیں۔خود اس کا نام اس کے نزدیک اسلام ہی کیوں نہ ہو۔لیکن شکر ہے کہ وہ اس سے زیادہ کوشش نہیں کرتے اور میں جب بھی ان سے ملتا ہوں تو کسی نہ کسی طرح اپنا ایمان سلامت لے آتا ہوں۔''

مولانا عرشی کی والدہ کا انتقال بچپن میں ہوگیا تھا اور وہ اس کی بے حد کمی محسوس کرتے تھے لیکن اپنی دوسری والدہ فاطمہ بیگم کی بھی تعریف کرتے تھے اوران سے محبت کرتے تھے۔انھوں نے ایک سعادت مند بیٹے کی طرح ان کے ساتھ اپنا سلوک روا رکھا، سچ تو یہ ہے کہ وہ زندگی کے تمام معاملات میں احکام الٰہی کے ایسے پابند رہے کہ ہر معاملے کو اسی کے ذریعہ دیکھنے، سمجھنے اور فیصلہ کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔اپنے والد سے بھی انھیں شدید لگاؤ تھا اور اپنی ہر کامیابی کو والد کی دعاؤں کا ثمرہ اور مرکز مانتے تھے۔

مولانا عرشی ہر کسی سے بڑی شفقت ومحبت اور خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔جوبھی ان سے ملتا ان کی حقائق ومعارف سے عالمانہ گفتگو سن کر گرویدہ ہوجاتا۔

ان کا انتقال 25 فروری 1981 کو رام پور میں ہوا۔

9.4.2 امتیاز علی خان عرشی کی تصنیفات وتالیفات

غالبیات

(۱) فرہنگ غالب (فارسی) ۱۹۴۷ء

(۲) مکاتیب غالب (اردو) ۱۹۳۷ء سات ایڈیشن آخری ۱۹۴۹ء (غالب کے وہ خطوط جو انھوں نے فردوس مکاں نواب یوسف علی خاں ناظم اور ان کے جانشین خلد آشیاں نواب کلب علی خاں کے نام لکھے تھے)

(۳) انتخاب غالب (غالب کا اپنا کیا ہوا اردو فارسی کلام کا انتخاب) (اردو) ۱۹۴۳ء

(۴) دیوانِ غالب (نسخہ عرشی) (اردو) ۱۹۵۸ء

تذکرے اور فرہنگ

(۱) دستور الفصاحت از حکیم احمد علی خاں یکتا لکھنوی (فارسی) ۱۹۴۳ء

(۲) مجالس رنگیں (سعادت یار خاں رنگیں) ترجمہ اردو، ۱۹۴۲ء

(۳) ''محاورات بیگمات'' کے نام سے ایک اہم کتاب ترتیب دی۔

داستان وقصص

(۱) رانی کیتکی کی کہانی از انشاء اللہ خاں انشا (اردو)

(۲) سلک گوہر از انشاء اللہ خاں انشا (اردو) ۱۹۸۰ء

شاعری: دیوان

(۱) نادرات شاہی از شاہ عالم ثانی (فارسی اردو اور ہندی کلام) ۱۹۴۴ء

درسیات

(۱) اردو ترجمہ بی۔اے عربی کورس پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۲۸ء

(۲) اردو ترجمہ ایف۔اے عربی کورس

عربی ادب

(۱) دیوان الحادرۃ۔قطبہ بن اوس بن محض المازنی الفزار الفطفانی (عربی) ۱۹۴۹ء

(۲) کتاب الاجناس۔لابی عبید القاسم بن سلام الہروی البغدادی (عربی) ۱۹۳۸ء

تاریخ

(۱) تاریخ اکبری المعروف بہ تاریخ قندھاری (فارسی) ۱۹۶۲ء

(۲) تاریخ محمدی از میرزا محمد حارث بدخشی دہلوی (فارسی) ۱۹۶۰ء

(۳) وقائع عالم شاہی از کنور پریم کشور فراقی (فارسی) ۱۹۴۹ء

فہارس

(۱) فہرست مخطوطات عربی رضالائبریری رام پور (انگریزی) ۱۹۶۴ء،۱۹۸۱ء چھ جلدیں

(۲) فہرست مخطوطات اردو، رضالائبریری رام پور جلد اول (اردو)

9.4.3 امتیاز علی خان عرشی کے تحقیقی کارنامے

تحقیق وتدوین کا کام جس دیدہ ریزی اورجگر کاری کا مطالبہ کرتا ہے امتیاز علی خاں عرشی اس پر پورے اترتے ہیں۔اس تیز رفتار اور سہل پسندی کے دور میں ان کے معیار کے بلند پایہ عالم اور محقق نایاب اب ہیں۔وہ امنے زمانے کے نابغہء روزگار تھے۔ان کی ساری زندگی تحقیق وتصنیف کے کام میں بسر ہوئی۔عرشی صاحب نے تصنیف وتالیف کا کام اپنے ابتدائی تعلیمی زمانے سے شروع کردی تھی جب وہ پنجاب یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے۔

اردو میں علمی تحقیق کی روایت کو آگے بڑھانے میں مولانا عرشی نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔آپ کی تحقیقات کو درجۂ استناد حاصل ہے۔انھوں نے اردو، فارسی اورعربی تینوں زبانوں میں کتابیں تالیف وتصنیف کیں۔آپ تقریباً ۴۵ سال تک نوابین رام پور کے شاہی کتب خانہ رضا لائبریری کے ناظم رہے۔اس دوران آپ نے فقید المثال علمی ذخائر سے فائدہ اٹھایا اور یہاں کے اہم مخطوطات کو مرتب کر کے اپنے بھر پور تعارفی مقدموں کے ساتھ شائع کیا۔اس سلسلہ میں آپ کا اہم ترین نام مرزا غالب کے اردو دیوان کی ترتیب واشاعت ہے۔یہ پہلی بار 1958 میں دیوان غالب نسخۂ عرشی کے نام سے شائع ہوا۔اس کی ترتیب وتدوین انھوں نے نہایت ہی سائنٹفک طریقے سے کی ہے۔اس دیوان کی ترتیب میں مولانا عرشی نے تمام دستیاب مآخذ سے استفادہ کیا۔انھوں نے غالب کے دیوان کے تمام نسخوں کو سامنے رکھا اوران کا تقابلی مطالعہ کیا۔غالب کی زندگی اوران کی موت کے بعد جو بھی نسخے ان کو ملے ان سبھوں کو سامنے رکھ کر ایک ایسا مستند متن تیار کیا جو اردو دنیا میں قابل قدر نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔اس کی ترتیب و تدوین میں انھوں نے لفظی اغلاط یا اختلاف قرأت کی اصلاح کی اور ساقط الفاظ کا اضافہ کیا۔اس طرح ان کا تیار کردہ دیوان غالب کا متن مثبت تحقیق اور تنقید متن کا بہترین نمونہ بن گیا۔اس نسخہ میں غالب کے اردو کلام کو تاریخی ترتیب سے پیش کیا گیا۔اس کے تین حصے ہیں۔پہلے حصے کا عنوان گنجینۂ معنی ہے اس میں غالب کے ابتدائی زمانے کا کلام ہے۔ دوسرے حصے کا نام نوائے سروش ہے اس حصے میں وہ اشعار ہیں جو غالب کے ابتدائی زمانے کا کلام ہے۔تیسرے حصے کا نام ''یادگار نالہ'' ہے جس میں غالب کے وہ اشعار ہیں جو متداول دیوان میں شامل نہیں ہیں۔یہ وہ اشعار ہیں جو غالب کے دیوان کے کسی نسخے کے حاشیے یا خاتمے یا کسی بیاض یا کسی خط میں موجود تھے۔اس کتاب پر عرشی صاحب نے 72 حصوں کا ایک طویل مقدمہ بھی لکھا ہے اور مقدمے میں دیوان کی ترتیب وتدوین کے دوران جن مسائل کا ان کو سامنا کرنا پڑا ان کا بیان تو ہے ہی ساتھ ہی بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔اس نسخے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں منشائے مصنف کا پورا پورا لحاظ وخیال رکھا گیا ہے۔

غالب خوش نصیب رہے ہیں کہ انھیں ہر زمانے میں محقق اور نقاد ملتے رہے ہیں۔مرزا غالب سے امتیاز علی خان عرشی کی دلی محبت کا ثبوت ان کے مرتب کردہ ''مکاتیب غالب'' ہے جو 1937 میں مولانا عرشی نے نوابان رام پور کے نام غالب کے خطوط کا

تنقیدی اڈیشن مکاتیب غالب کے نام پیش کیا تھا۔اس کے اب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یہ وہ خطوط ہیں جو مرزا غالب نے نواب یوسف علی خان ناظم اوران کے جانشین نواب کلب علی خان والیان ریاست رام پور کے نام لکھے تھے۔ یہ خطوط رضا لائبریری میں اب بھی محفوظ ہیں۔عرشی صاحب نے بڑی محنت اور جانفشانی سے ان خطوط کومرتب کیا۔مقدمہ لکھا،حواشی اورتعلیقات لکھے اور نہایت ہی مستندصورت میں شائع کیا۔183 صفحوں کا مقدمہ بجائے خودایک بڑا کارنامہ ہے جواس کتاب میں شامل ہے۔ یہ پہلی کتاب ہے جس نے ان کوبطور محقق صف اول میں مقام دیا۔اس کام میں عرشی صاحب نے جس محنت اورمحققانہ بصیرت کا ثبوت دیا ہے وہ مقدمے سے ظاہر ہے جس میں عرشی صاحب نے خطوط کے حوالے سے غالب کی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں کی نشاندہی کی جو پردۂ اخفا میں تھے۔اس کام نے انھیں ایک مستند محقق بنا دیا۔

غالب سے دلچسپی اور یگانگت کی ایک اورمثال ان کا ترتیب دیا ہوا ''انتخاب غالب'' ہے۔جس میں غالب کے اردو فارسی کلام کوحواشی کے ساتھ یکجا کر دیا گیا ہے۔ یہ انتخاب 1943 میں شائع ہوا تھا۔ یہ انتخاب ان معنوں میں تحقیقی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں انھوں نے غالب کے منتخب کلام کوشامل کیا جس سے غالب کی شاعرانہ عظمت اوراس کے معیار ومقدار کا پتہ چل سکے۔ غالب شناسی میں عرشی صاحب کو یدطولیٰ حاصل تھا، یہی سبب ہے کہ اس کام میں بھی انھوں نے بڑی دلجمعی اور دلچسپی لی۔اس کتاب کا دیباچہ عرشی صاحب کی محققانہ علمیت کا مظہر ہے۔

عرشی صاحب کا غالب پرایک اوراہم کام فرہنگ غالب ہے۔اس کوادبی اورلسانی دونوں حیثیتوں سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔مرزا غالب نے اپنے شاگردوں اوردوستوں کوجوسیکڑوں خطوط لکھے،ان میں سے بیشتر میں ادبی مسائل پرروشنی ڈالی ہے۔نیز اردو فارسی لغات کے مفاہیم اوران کے محل استعمال سے بحث کی ہے۔یعنی غالب کی اردوئے معلیٰ،عود ہندی،ابر گہر،انتخاب غالب، پنج آہنگ، تیغ تیز، دستنبو، قاطع برہان اورغالب کی دوسری تحریروں کی مدد سے پوری فرہنگ تیار کی۔عرشی صاحب نے ان خطوط سے لغات سے متعلق معلومات اخذ کر کے یکجا کر دی ہیں اوراس پرحسب روایت ایک طویل و بسیط مقدمہ بھی تحریر کیا ہے جومحققانہ انداز نظر کے ساتھ سامنے آیا جس میں ہندوستان میں لغت نویسی کے اصولوں کے دروبست کے حوالے سے بحث کی گئی اوران کا محققانہ جائزہ لیا گیا۔انھوں نے اس فرہنگ کے مقدمے میں کتب لغات کی فہرست بھی درج کردی ہے۔اس مقدمے سے لغت نویسی اور کتب لغات پران کی غیرمعمولی دسترس کا پتہ چلتا ہے۔

عرشی صاحب کی تحقیق وتدوین کا ایک بہترین نمونہ احمد علی یکتا کی کتاب دستور الفصاحت کی ترتیب ہے۔اس کتاب کے شروع میں ان کا دیباچہ تحقیق کا عمدہ نمونہ ہے جس میں بہت ساری معلومات اکٹھا کر دی گئی ہیں جوان کے وسیع مطالعے کا حامل ہیں۔ اس کتاب کی تدوین وترتیب میں کڑی محنت وریاضت کا انھوں نے ثبوت دیا ہے۔

عرشی صاحب کی تحقیق وتدوین کا ایک اعلیٰ نمونہ ''نادرات شاہی'' ہے جو 1944 میں شائع ہوا۔نادرات شاہی شاہ عالم ثانی کے اردو فارسی اور ہندی کلام کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب نستعلیق اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں شائع ہوئی ہے۔اس کتاب میں بھی انھوں نے دیباچہ لکھا ہے جس میں انھوں نے شاہ عالم ثانی کے بارے میں اوران کے زمانے کے حالات کے تعلق سے بہت سی

ایسی باتیں لکھی ہیں جو تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ دیباچہ لکھتے وقت انھوں نے تحقیق کے مستند طریقۂ کار کو اپنایا اور کئی ماخذوں کی مدد سے شاہ عالم ثانی کے دور کا احوال سمجھا اور ان کو قلمبند کیا۔

انشاء اللہ خان انشا کی مختصر کہانی ''سلک گہر'' جسے ادبی دنیا میں مقبولیت حاصل ہے عرشی صاحب نے اپنے دیباچے کے ساتھ 1948 میں اسٹیٹ پریس رام پور سے چھپوایا۔ ''سلک گہر'' کی اپنی ادبی اہمیت ہے۔اس طرح انشا کی ''رانی کیتکی کی کہانی'' کی کہانی بھی ترتیب دی تھی لیکن اس کی اشاعت کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔

امام سفیان ثوری کی ''تفسیر قرآن'' ان کی اہم دریافت ہے۔اس تفسیر کی اشاعت سے ان کا مذہبی رجحان ہی نمایاں نہیں ہوتا بلکہ علم وفضل کی بلندی کا بھی احساس ہوتا ہے۔

عرشی صاحب نے ''محاورات بیگمات'' کے نام سے ایک اہم کتاب ترتیب دی جس میں بیگمات کے محاوروں کو جمع کیا۔ خان آرزو کی ''نوادرالفاظ'' میں خواتین کے محاورے اور الفاظ استعمال کئے گئے تھے۔سعادت یار خان رنگین نے بھی ''دیوان ریختی'' میں بیگمات کے محاوروں کو جمع کیا تھا۔ان دونوں کی مدد سے عرشی صاحب نے ایک ایسی کتاب ترتیب دی جو محاورات ''بیگمات'' کے نام سے شائع ہوئی۔اس کتاب کے دیباچے میں انھوں نے محاوروں کی اہمیت اور افادیت پر زور دیتے ہوئے ان کی روزمرہ کی زندگی میں استعمالات کے حوالے سے بڑی محققانہ گفتگو کی ہے۔اس کتاب کو اہل علم نے بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

''تاریخ محمدی'' مرزا محمد حارثی بدخشی دہلوی کی تالیف ہے جس میں ۱۱۰۱ھ/1689ء سے ۱۱۶۲ھ/1749ء تک کے مشاہیر اکابر اور اعاظم کا ذکر ہے۔ یہ کتاب ان کی مرتبہ اہم کتاب ہی نہیں بلکہ اہم دریافت ہے یہ کتاب 1960 میں شائع ہوئی۔ اس کے ساتھ تاریخ ''قندھاری'' کی ترتیب وتدوین بھی ان کی تحقیق کا ایک نادر نمونہ ہے۔اس کا اصل نام ''تاریخ اکبری'' ہے لیکن تاریخ قندھاری کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ یہ عہد اکبری کی ایک نہایت معتبر اور مستند تاریخ ہے۔اس کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور اور دوسرا نسخہ کیمبرج میں محفوظ ہے۔عرشی صاحب نے کیمبرج کے اس نسخے سے رام پور کے نسخے کا مقابلہ کیا اور پھر دونوں کی مدد سے تاریخ قندھاری کا ایک مستند متن تیار کر کے اسے حواشی اور تعلیقات کے ساتھ 1962 میں شائع کیا۔ان کے تحقیقی کاموں کی فہرست لمبی ہے۔اس طرح عربی میں ''دیوان حافظ'' کو بھی ترتیب دیا۔

امتیاز علی خان نے لاتعداد مقالات لکھے، جو کتابی شکل میں شائع ہوئے لیکن اب بھی کئی ایسے مقالے ہیں جن کی اشاعت نہیں ہوئی ہے۔مقالات میں بھی وہ تحقیق کے اصول پر سختی سے کاربند رہتے ہیں اور مستند حوالوں یا شواہد کے بغیر ایک سطر آگے نہیں بڑھتے۔ان کا تحقیق پر ایقان اتنا گہرا ہے کہ وہ اس میدان کے سرخیل کہے جانے کے لائق ہیں۔تدوین کے وہ مرد میدان تو ہیں ہی تحشیہ نگاری کو بھی انھوں نے تحقیق کا

اہم جز قرار دیا اور ہمیشہ اپنی کتابوں میں اس سے کام لیا۔ مضامین/مقالات بھی حاشیوں سے کبھی خالی نظر نہیں آئے۔امتیاز علی خاں عرشی اردو تحقیق میں ایک ایسا نام ہے جس سے اردو تحقیق کو اعتبار کا درجہ ملا ہے۔

9.5 آپ نے کیا سیکھا

- مولوی عبدالحق کی سوانح حیات اوران کے حالات زندگی سے واقفیت ہوئی۔
- مولوی عبدالحق کی تصنیفات وتالیفات کاعلم ہوا۔ان کی مرتب کردہ تحقیقی کتابوں کی ایک اہم فہرست پڑھنے کوملی۔
- مولوی عبدالحق کے تحقیقی کارناموں اوران کی مرتب کردہ قدیم مخطوطات، کتابوں،اورمخفی کتابوں کی تفصیلی جانکاری حاصل ہوئی۔ان کے تحقیقی اوصاف وامتیازات سے پوری طرح واقفیت ہوئی۔
- امتیازعلی خاں عرشی کے سوانحی کوائف اوران کے حالات زندگی سے واقفیت حاصل ہوئی۔
- امتیازعلی خاں عرشی کی تصنیفات وتالیفات کی معلومات حاصل ہوئی۔ان کی کتابوں کے ناموں سے واقف ہوسکے
- امتیازعلی خاں عرشی کی اہم تحقیقی تصنیفات کے بارے میں جانکاری حاصل ہوئی۔
- امتیازعلی خاں عرشی ا کے تحقیقی کارناموں اوران کی ادبی خدمات کے ساتھ ان کے تحقیقی اورتنقیدی اوصاف اورامتیازات کے بارے میں بھرپورعلم حاصل ہوا۔

9.6 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ مولوی عبدالحق کی تاریخ پیدائش اور جائے پیدائش ولادت بتایئے اوران کی تاریخ وفات بھی۔

۲۔ ان کی پانچ اہم تحقیقی کتابوں کے نام بتایئے۔

۳۔ ان کی تین کتابوں کے بارے میں اختصار سے ذکر کیجیے۔

۱۔ امتیازعلی خاں عرشی ا کی تاریخ پیدائش اور جائے ولادت بتایئے۔

۲۔ امتیازعلی خاں عرشی کا انتقال کہاں ہوا تھا اور وہ کہاں دفن ہیں؟

۳۔ امتیازعلی خاں عرشی ا کی چاران اہم کتابوں کے نام بتایئے جن کا تعلق تحقیق وتنقید سے ہے۔ان کا سن اشاعت بھی لکھیے۔

۴۔ بحثیت محقق امتیازعلی خاں عرشی کے اوصاف وامتیاز پراختصار سے روشنی ڈالیے۔

9.7 سوالات کے جوابات:

۱۔مولانا امتیازعلی خان عرشی کی پیدائش ۸ دسمبر ۱۹۰۴ء مطابق ۲۹ رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ کواپنے مکان محلّہ پھلوار (رام پور) میں ہوئی۔

۲۔امولانا امتیازعلی خان عرکا انتقال 25 فروری 1981 کوہوا۔ وہ رام پور میں مدفون ہیں۔

۳۔ان کی چار تحقیقی وتنقیدی کتابوں کے نام درج ذیل ہیں۔

(۱) مکاتیب غالب (اردو) ۱۹۳۷ء مرتبہ: امتیازعلی خان عرشی

(۲) دیوانِ غالب (نسخہ عرشی) (اردو) ۱۹۵۸ء مرتبہ: امتیاز علی خان عرشی

(۳) دستور الفصاحت از حکیم احمد علی خاں یکتا لکھنوی ۱۹۴۳ء مرتبہ: امتیاز علی خان عرشی

(۴) دستور الفصاحت از حکیم احمد علی خاں یکتا لکھنوی (فارسی) ۱۹۴۳ء

۴۔ اردو میں علمی تحقیق کی روایت کو آگے بڑھانے میں مولانا عرشی نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ آپ کی تحقیقات کو درجۂ استناد حاصل ہے۔ انھوں نے اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں کتابیں تالیف وتصنیف کیں۔ آپ تقریباً ۴۵ سال تک نوابین رام پور کے شاہی کتب خانہ رضا لائبریری کے ناظم رہے۔ اس دوران آپ نے فقید المثال علمی ذخائر سے فائدہ اٹھایا اور یہاں کے اہم مخطوطات کو مرتب کر کے اپنے بھرپور تعارفی مقدموں کے ساتھ شائع کیا۔ اس سلسلہ میں آپ کا اہم ترین نام مرزا غالب کے اردو دیوان کی ترتیب واشاعت ہے۔ یہ پہلی بار 1958 میں دیوان غالب نسخۂ عرشی کے نام سے شائع ہوا۔ اس کی ترتیب وتدوین انھوں نے نہایت ہی سائنٹفک طریقے سے کی ہے۔ اس دیوان کی ترتیب میں مولانا عرشی نے تمام دستیاب مآخذ سے استفادہ کیا۔ انھوں نے غالب کے دیوان کے تمام نسخوں کو سامنے رکھا اور ان کا تقابلی مطالعہ کیا۔ غالب کی زندگی اور ان کی موت کے بعد جو بھی نسخے ان کو ملے ان سبھوں کو سامنے رکھ کر ایک ایسا مستند متن تیار کیا جو اردو دنیا میں قابل قدر نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین میں انھوں نے لفظی اغلاط یا اختلاف قرأت کی اصلاح کی اور ساقط الفاظ کا اضافہ کیا۔ اس طرح ان کا تیار کردہ دیوان غالب کا متن مثبت تحقیق اور تنقید متن کا بہترین نمونہ بن گیا۔ اس نسخہ میں غالب کے اردو کلام کو تاریخی ترتیب سے پیش کیا گیا۔

غالب سے دلچسپی اور یگانگت کی ایک اور مثال ان کا ترتیب دیا ہوا ''انتخاب غالب'' ہے۔ جس میں غالب کے اردو فارسی کلام کو حواشی کے ساتھ یکجا کر دیا گیا ہے۔ یہ انتخاب 1943 میں شائع ہوا تھا۔ یہ انتخاب ان معنوں میں تحقیقی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں انھوں نے غالب کے منتخب کلام کو شامل کیا جس سے غالب کی شاعرانہ عظمت اور اس کے معیار و مقدار کا پتہ چل سکے۔ غالب شناسی میں عرشی صاحب کو ید طولیٰ حاصل تھا، یہی سبب ہے کہ اس کام میں بھی انھوں نے بڑی دلجمعی اور دلچسپی لی۔ اس کتاب کا دیباچہ عرشی صاحب کی محققانہ علمیت کا مظہر ہے۔

عرشی صاحب کی تحقیق وتدوین کا ایک بہترین نمونہ احمد علی یکتا کی کتاب دستور الفصاحت کی ترتیب ہے۔ اس کتاب کے شروع میں ان کا دیباچہ تحقیق کا عمدہ نمونہ ہے جس میں بہت ساری معلومات اکٹھا کر دی گئی ہیں جو ان کے وسیع مطالعے کا حامل ہیں۔ اس کتاب کی تدوین وترتیب میں کڑی محنت وریاضت کا انھوں نے ثبوت دیا ہے۔

انشاء اللہ خان انشا کی مختصر کہانی ''سلک گہر'' جسے ادبی دنیا میں مقبولیت حاصل ہے عرشی صاحب نے اپنے دیباچے کے ساتھ 1948 میں اسٹیٹ پریس رام پور سے چھپوایا۔ ''سلک گہر'' کی اپنی ادبی اہمیت ہے۔

امتیاز علی خان نے لاتعداد مقالات لکھے، جو کتابی شکل میں شائع ہوئے لیکن اب بھی کئی ایسے مقالے ہیں جن کی اشاعت نہیں ہوئی ہے۔ مقالات میں بھی وہ تحقیق کے اصول پر سختی سے کاربند رہتے ہیں اور مستند حوالوں یا شواہد کے بغیر ایک سطر آگے نہیں بڑھتے۔ ان کا تحقیق پر ایقان اتنا گہرا ہے کہ وہ اس میدان کے سرخیل کہے جانے کے لائق ہیں۔ تدوین کے وہ مرد میدان تو ہیں ہی

تحشیہ نگاری کو بھی انھوں نے تحقیق کا
اہم جز قرار دیا اور ہمیشہ اپنی کتابوں میں اس سے کام لیا۔مضامین/ مقالات بھی حاشیوں سے کبھی خالی نظر نہیں آئے۔

امتیاز علی خاں عرشی اردو تحقیق میں ایک ایسا نام ہے جس سے اردو تحقیق کو اعتبار کا درجہ ملا ہے۔

9.8 فرہنگ

توسط	ذریعہ	عزائم	پکے ارادے
عنفوان شباب	آغاز جوانی	مظہر	ظاہر ہونے کی جگہ
اختراع	فنکارانہ ایجاد	منشور	وہ بنیادی تحریر جس میں کسی جماعت کے اصول اور مقاصد درج ہوں
وغیرہ			
متوسط	درمیانی	کتب خانہ	لائبریری
فوقیت	ترجیح، برتری	تجسس	تلاش
اسلوب	انداز، روش	فیضان	فائدہ
مروج	رائج کیا گیا	اعتراف	تسلیم کرنا، مان لینا
ثقیل	مشکل	تعین	مخصوص کرنا
کثیر الجہت		مختلف النوع	الگ الگ قسم کے
قلیل	تھوڑا	فلک بوس	آسمان کو چھونے والا

9.9 کتب برائے مطالعہ:

۱۔ جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
۲۔ حنیف نقوی، شعرائے اردو کے تذکرے، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ
۳۔ رشید حسن خان، ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
۴۔ عبارت بریلوی، خطبات عبدالحق، انجمن ترقی اردو، کراچی
۵۔ عبارت بریلوی، مقدمات عبدالحق، انجمن ترقی اردو، کراچی
۶۔ سید عبداللہ، وجہی سے عبدالحق تک، مکتبہ خیابان ادب، لاہور
۷۔ فرمان فتح پوری، تحقیق وتنقید، ماڈرن پبلشرز، کراچی
۸۔ محمود الٰہی، بازیافت، دانش محل، لکھنؤ

۹۔ مختارالدین احمد، عبدالحق، ہندوستانی ادب کے معمار، ساہتیہ اکیڈمی، دہلی

ا ۔ڈاکٹر جمیل جالبی ۔تاریخ ادب اردو۔ڈاکٹر جمیل جالبی

۲۔ انور سدید۔مختصر تاریخ اردو ادب۔

۳۔ گیان چند جین ۔تحقیق کا فن

۴۔ ڈاکٹر وہاب اشرفی ۔تاریخ ادب اردو

۵۔ ملک رام مرتبہ ۔ذکر عرشی

اکائی 10 : حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود

ساخت:

10.1 اغراض و مقاصد

10.2 تمہید

10.3 حافظ محمود شیرانی: حیات اور ادبی کارنامے

10.3.1 حافظ محمود شیرانی: سوانحی کوائف اور حالات زندگی

10.3.2 حافظ محمود شیرانی کی تصنیفات و تالیفات

10.3.3 حافظ محمود شیرانی کے تحقیقی کارنامے۔اوصاف و امتیازات

10.4 قاضی عبدالودود: حیات اور ادبی کارنامے

10.4.1 قاضی عبدالودود: سوانحی کوائف اور حالات زندگی

10.4.2 قاضی عبدالودود کی تصنیفات و تالیفات

10.4.3 قاضی عبدالودود کے تحقیقی کارنامے۔اوصاف و امتیازات

10.5 آپ نے کیا سیکھا

10.6 اپنا امتحان خود لیجئے

10.7 سوالات کے جوابات

10.8 فرہنگ

10.9 کتب برائے مطالعہ

10.1 اغراض و مقاصد:

اس اکائی میں آپ/کو

- حافظ محمود شیرانی کے سوانحی کوائف اور حالات زندگی سے واقف ہوں گے۔
- حافظ محمود شیرانی کی تصنیفات کی تفصیلی معلومات حاصل ہوگی۔
- حافظ محمود شیرانی کے تحقیقی کارناموں اور ان کی ادبی خدمات کے ساتھ ان کے اوصاف اور امتیازات کے بارے میں جان سکیں گے۔
- قاضی عبدالودود کے سوانحی کوائف اور حالات زندگی سے واقف ہوں گے۔
- قاضی عبدالودود کی تصنیفات کی تفصیلی معلومات حاصل ہوگی۔

- قاضی عبدالودود کے تحقیقی کارناموں اوران کی ادبی خدمات کے ساتھ ان کے اوصاف اورامتیازات کے بارے میں جان سکیں گے۔

10.2 تمہید:

حافظ محمود شیرانی (1880-1946) اردو تحقیق وتنقید، لسانیات اور زبان وادب میں ایک معتبر نام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اردو اور فارسی زبان وادب کی مکمل آگاہی رکھتے تھے یہی سبب ہے کہ انھیں ممتاز محقق وعالم کی حیثیت سے جانا اور پڑھا جاتا ہے۔ اردو تحقیق وتنقید میں مغربی ومشرقی اصول وضوابط کے زیر اثر کام کیا اور ہمیشہ غیر جانبدارانہ اور غیر متعصّبانہ طریقۂ کار اپنایا۔ ان کے تحقیقی نتائج ہمیشہ منصفانہ منہاج ومعیار پر قائم رہے۔ تحریر، رسم الخط، کتابت، کاغذ، روشنائی اور مخطوطہ شناسی میں کمال مہارت سے کام لیتے ہوئے ہمیشہ محتاط نتائج مرتب کئے۔ یہی وجہ ہے کہ آنے والی نسل کے لئے ان کی پیروی میں محمود شیرانی کی شخصیت کے اتنے پہلو ہیں کہ اگر ہر ایک پہلو کی بات کی جائے تو دفتر درکار ہوگا۔ محمود شیرانی کی اصل شناخت ان کی کتاب ''پنجاب میں اردو'' سے قائم ہوئی۔ اس کے علاوہ ان کی کتابوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک ادارے کی حیثیت رکھتے تھے۔ تاریخ، لسانیات، لغت وقواعد، سوانح، عروض و بلاغت، شعروادب اور تذکرے ان کے ایسے پسندیدہ موضوعات تھے جن پر وہ وقتاً فوقتاً خامہ فرسائی کرتے رہے۔ ان کی تحریروں نے اردو تحقیق کے معیار ووقار کو ہی بلند نہیں کیا بلکہ بعد کے زمانے کی تحقیق کو دقت نظر اور درجۂ اعتبار تک پہنچا دیا۔

محمود شیرانی کی تحقیقی کتابوں اوران کے مقالات (جو تقریباً دس جلدوں میں محفوظ ہیں) نے اردو زبان وادب کے تحقیقی و تنقیدی رخ کو موڑ کر رکھ دیا۔ وہ ہمیشہ استدلالی رویہ اپناتے تھے۔

محمود شیرانی نے اپنی زندگی کے اہم سال اردو فارسی ادبیات کی تعلیم وتدریس اور تحقیق وتنقید کی نذر کر دیے۔ انھوں نے تحقیق کے توسط سے تنقید کا معیار متعین کیا۔ تنقید وتحقیق میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہوتا لیکن سہل انگاری سے کام لینے والے محققین سیدھی سادی زبان میں حقائق بیان کر دیتے ہیں، حافظ محمود شیرازی اس کے پکے مخالف تھے۔

محمود شیرانی کو فارسی، عربی، انگریزی کے علاوہ اردو زبان سے متعلقہ زبانوں میں بالخصوص راجستھانی، پنجابی، گجراتی، دکنی اور ہندی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ اوران زبانوں کے ادب سے بھی تھوڑی بہت واقفیت تھی۔ تاریخ کے مطالعہ، ادب کی تنقید، سکوں کی شناخت اور مختلف علاقوں کے دیہات میں سیاحت اور میل جول سے ان کے اندر ایک خاص بصیرت پیدا ہوگئی تھی۔ زبان و ادب کے تمام اصناف اور تہذیب وتمدن کے ارتقاء پر ان کی گہری نظر تھی۔

محمود شیرانی کے تحقیقی ذوق وجذبہ کا یہ عالم تھا کہ ہندوستان میں وہ ٹونک، راجپوتانہ اور ہندوستان کے مختلف شہروں کے خاندانوں، بازاروں، اور کباڑیوں سے زیادہ نادر چیزیں حاصل کر کے جمع کرتے۔ وہ غیر ملکی اسفار پر بھی گئے۔ جب لندن گئے تو

وہاں سے آثار قدیمہ، تاریخ ، سکے اور ثقافت پر انگریزی کتابیں نیز اردو و فارسی کتابوں کو اپنی تحریروں میں نقل کر کے لندن سے اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔

محمود شیرانی کا اردو زبان و ادب میں جو مقام ہے اسی نسبت سے رشید حسن خان نے ایک جگہ رکھا ہے:

''اردو میں ادبی تحقیق کا آغاز بیسویں صدی کے آغاز سے ہوتا ہے اور کسی تکلف کے بغیر، شیرانی صاحب کو اردو میں تدوین تحقیق کا معلم اول کہا جا سکتا ہے۔ شیرانی صاحب نے قدیم مشرقی انداز تعلیم اور جدید مغربی انداز نظر دونوں سے فیض پایا تھا۔ مزاجاً ان کو تحقیق سے مکمل مناسبت تھی اور ان کے یہاں وہ منطقی انداز نظر موجود تھا جس کے بغیر انداز گفتگو میں صحت اور استخراج نتائج کا سلیقہ آ ہی نہیں سکتا۔ زود یقینی، آسان پسندی اور کم نظری سے انھیں گویا علاقہ نہیں تھا۔ نہ پرستاری وہم سے سروکار تھا۔ تحقیق و تدوین دونوں موضوعات پر ان کا بیشتر کام مثال و معیاری حیثیت رکھا ہے۔'' (مضمون تدوین و تحقیق کے رجحانات، از رسید حسن خان)

قاضی عبدالودود اردو زبان و ادب کے ایک اہم محقق، دانشور، نقاد گزرے ہیں۔ صحیح معنوں میں ان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ نابغۂ روزگار اور قاموسی شخصیت کے مالک انسان تھے۔ تحقیق حق کی تلاش، صداقت کی جانچ پڑتال اور دودھ اور پانی کو الگ الگ کر دینے کا نام ہے۔ قاضی عبدالودود نے اپنی تحریروں سے اس امر کا عملی ثبوت دیا ہے کہ وہ تحقیق کے فن، طریقۂ کار اور تمام اصول و ضوابط سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے تحقیق شدہ کئی اہم مفروضات کو نہ صرف رد کیا ہے بلکہ دلائل وشواہد سے پورے طور پر ثابت کر کے ان کو کالعدم قرار دیا ہے۔ اور چند اہم اور نئی روایات کی بنیاد ڈالی جو آگے کے زمانے میں وسیع اور مستحکم ثابت ہوئی۔

میدان تحقیق میں سرسید کے بعد محمد حسین آزاد، حالی، شبلی، حافظ محمود شیرانی، مولوی عبدالحق، عبدالستار صدیقی، مالک رام، امتیاز علی خان عرشی، نذیر احمد اور کئی اہم نام ہیں جنھوں نے اردو اور فارسی کے تحقیقی کاموں کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ اس کی روایات کو مضبوط کیا اور اپنے مخصوص میدان میں لافانی نقوش چھوڑے۔ ان محققین میں قاضی عبدالودود کو بھی کئی حیثیات سے درجۂ امتیاز حاصل ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اپنے پیش روؤں اور معاصر محققوں، ناقدوں اور سوانح نگاروں کی تحقیقات پر کاری ضرب لگائی۔ جس طرح حافظ محمود شیرانی نے شبلی نعمانی کے شعرالعجم، محمد حسین آزاد کی آب حیات اور ان کے مرتب کردہ دیوان ذوق پر تحقیقی اور پر مغز مقالے لکھے اور تحقیق کا حق ادا کیا۔ اسی طرز فکر کو قاضی عبدالودود نے اپناتے ہوئے ایک نئی وضع اختیار کی اور تحقیق کے ان گوشوں کو اجاگر کیا جن سے ہمارے بعض محققین ناآشنا یا بے خبر تھے اور زیادہ محنت و مشقت نہ کر کے تحقیق کے چند گوشوں کو اندھیرے میں رکھ دیا کرتے تھا۔ قاضی عبدالودود نے بھی آب حیات پر ایک طویل تبصرہ کیا اور آزاد کے تسامحات کی نشاندہی کی۔ انھوں نے اپنے معاصرین میں خواجہ احمد فاروقی کی مرتب کردہ تذکرۂ عمدہ منتخبہ اور ان کی دوسری کتاب ''میر۔ حیات اور شاعری'' پر

بڑے تیکھے حملے کئے اور اپنے تحقیقی انداز نظر سے ان کی بعض تحقیقی کوتاہیوں کی نشاندہی کی۔ محمد مسلم عظیم آبادی کی مشہور زمانہ کتاب ''شاد کی کہانی شاد کی زبانی'' پر بھی خوب عمدہ تحقیقی تبصرہ لکھا اور ان عوامل کی جانب نشاندہی کی جن کا شاد کی زندگی سے کوئی تعلق یا ربط ضبط نہ تھے۔ سید مسعود حسین رضوی کی مرتبہ کردہ کتاب دیوان فائز پر بھی خوب جم کر لکھا اور مسعود صاحب کی تحقیقی غلطیوں کی جانب اشارہ کیا۔ رام بابو سکسینہ کی کتاب مرقع شعراء پر بھی تنقید کی اور تحقیق کی کمزوریوں کو اجاگر کیا۔ ان سب سے اندازہ ہوا کہ قاضی عبدالودود نے تحقیق میں ایک نئے اسلوب کی بنیاد تبصرے کی شکل میں ڈالی۔ تبصرہ نگاری میں تحقیقی نقطہ ہائے نظر کے ذریعہ آنے والی نسلوں کو تحقیق وتنقید کے ایسے آداب سکھائے جو حقائق پر مبنی اور صداقت سے قریب تر ٹھہرے۔

قاضی عبدالودود کا رویہ حقیقت پسندانہ تھا۔ ان میں تصنع نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ تحقیق میں مروت یا قیاس کو وہ غلط تصور کرتے تھے۔ وہ ایک راست گفتار انسان تھے۔ تعلیٰ، خودنمائی اور دروغ گوئی سے انھیں نفرت تھی۔ اس لئے ان کے نزدیک تحقیق کا یہی تصور تھا کہ وہ ہر شے یا شخص کو بعینہ ایسا ہی دیکھنا چاہتے تھے جیسا کہ فی الحقیقت وہ ہے۔ نہ کہ ظاہر میں کچھ اور باطن میں کچھ دکھائی پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر کلیم الدین احمد نے کبھی ان کے بارے میں کہا تھا کہ وہ تنہا سوچتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ جو بھی سوچتے ہیں وہ درست ہے اور جو اس کے برخلاف سوچتا ہے وہ بالیقین غلطی پر ہے۔ اور راہ راست سے ہٹا ہوا ہے۔

قاضی عبدالودود نے محمد حسین آزاد، شاد عظیم آبادی اور مولوی عبدالحق کے بارے میں بہت زیادہ لکھا ہے۔ لیکن قاضی صاحب کا کام غالب پر سب سے زیادہ ہے۔ انھوں نے سلسلہ مضامین ''جہان غالب'' کے نام سے شروع کیا تھا جو کئی اہم رسائل میں شائع ہوتے رہے تھے۔ جوشش عظیم آبادی کی دریافت و بازیافت ان کا اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ قاضی صاحب کو اردو شعرا کے تذکروں سے بھی خصوصی تعلق خاطر رہا ہے۔ اور یہی وہ میدان ہے جو تحقیق کی نوعیت سے اہم سمجھا جاتا ہے۔ آپ نے کئی تذکروں پر مضامین لکھے ہیں۔ قاضی صاحب نے بڑے متنوع تحقیقی کام انجام دیے اور جس میدان میں بھی قدم رکھا اپنی انفرادیت اور شجر علمی کا سکہ جما دیا۔ انھوں نے ادبی تحقیق کو وزن و وقار عطا کیا اور اسے ایک مستقل فن کا درجہ بخشا۔

10.3 حافظ محمود شیرانی: حیات اور ادبی کارنامے

10.3.1 حافظ محمود شیرانی: سوانحی کوائف اور حالات زندگی

حافظ محمد شیرانی کا تعلق افغانوں کے قبیلہ شیرانی سے تھا۔ ان کے اسلاف مقام شیران سے ہندوستان آئے تھے۔ ایک روایت کے مطابق شیرانی کا مورث اعلیٰ ملک قیس عبدالرشید کے ایک پڑپوتے کا نام تھا۔ چنانچہ ان کی اولاد خاں اپنے نام کے ساتھ شیرانی کی نسبت لگانی شروع کی۔ شیرانی قبیلے سے تعلق رکھنے والے کچھ خاندان راجپوتانہ میں آباد ہو گئے تھے۔ محمود شیرانی کے اسلاف ریاست جودھپور مارواڑ میں آباد ہوئے تھے۔ بعد میں ان کے دادا حاجی چاند خان وزیرالدولہ کے عہد میں جودھپور سے ٹونک آئے اور قافلے میں قیام کیا۔ محمود شیرانی کے والد محمد اسماعیل خان ٹونک میں منشی خانے میں نائب میر منشی مقرر ہوئے۔ ان کی پیدائش 5 اکتوبر 1880ء کو اسی شہر میں ہوئی۔ محمود شیرانی نے رواج زمانہ کے مطابق اوائل عمری میں ہی قرآن حفظ کرلیا۔ قرآن حفظ کرنے کے بعد وہ مروجہ تعلیم یعنی فارسی زبان وادب کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ بعدۂ مڈل اسکول میں تعلیم کی غرض سے داخل

ہوئے۔ پھر 1895 میں منشی، 1896 میں منشی عالم اور 1900 میں منشی فاضل کے امتحانات پاس کئے۔ 1897 میں باقاعدہ انگریزی تعلیم کی ابتدا کردی تھی۔ اس زمانہ میں وکالت کے پیشے کو بہت امتیاز اور اعتبار حاصل تھا۔ ستمبر 1904 میں اپنے والد ماجد کے ایما پر بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے انگلستان کے لئے روانہ ہوئے۔ سمندری جہاز سے سفر کے باعث وہ 4 اکتوبر کو وہاں پہنچے۔ ہندوستان میں مشرقی وضع قطع کے مطابق زندگی گزارتے تھے لیکن لندن پہنچ کر انھوں نے انگریزی لباس زیب تن کیا لیکن اس کے ساتھ راجستھانی انداز کا صافہ باندھ لیتے تھے یا کبھی کبھی سوٹ کے ساتھ ترکی ٹوپی استعمال کرلیا کرتے جو کہ آخر تک اپنائے رہے۔

انگلینڈ میں انھیں خطرناک بیماری لاحق ہوگئی۔ سر کے نچلے حصے میں فاسد مادہ جمع ہونے کے باعث انھیں شدید اذیت کا سامنا کرنا پڑا جس سے ان کی تعلیمی سرگرمیوں پر بہت اثر پڑا۔

حافظ محمود شیرانی قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران انگریزی زبان وادب کے مطالعے کے لئے وقت نکال لیا کرتے اور اس میں خوب استعداد پیدا کر لی۔ وہ لندن کے مقامی باشندوں سے بے تکلف انگریزی میں گفتگو کرتے تھے اور خوب اچھی انگریزی بھی لکھنے لگے۔

لندن میں حافظ محمود شہرانی کی رسالہ ''مخزن'' کے مدیر شیخ عبدالقادر جن کی ادبی حیثیت مسلم تھی، سے ملاقات ہوئی۔ عبدالقادر ان سے متاثر ہوئے۔ ان کی مصروفیات کے تعلق سے انھوں نے لکھا ہے:

> ''ولایت میں وہ (حافظ محمود شیرانی) کوئی سات سال رہے۔ پہلے دو تین سال تو انھیں انگریزی سیکھنے میں لگے...... میں جب ولایت سے چلا، وہ ابھی انگریزی سیکھ رہے تھے، مطالعے کا شوق بے حد تھا۔ لندن کے کتب خانوں میں جا کر کتب بینی میں مصروف رہے۔ وہاں مشرقی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ تھا جو برٹش میلازیم میں اور دوسرا انڈیا آفس میں موجود تھا۔ دونوں میں فارسی، عربی کی قلمی کتابیں بکثرت موجود ہیں اور ان میں سے کئی ایسی نادر کہ اب خود مشرقی کتب خانوں میں ان میں سے بعض کا وجود نہیں۔''
>
> (محمد حنیف شاہد (مرتب) مقالات عبدالقادر، مجلس ترقی ادب، 1986)

29 جولائی 1906 کو ان کے والد کا اچانک حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا جس کے سبب انھیں وطن واپس آنا پڑا۔ یہاں گھر کے حالات اچھے نہ تھے۔ وہ کسی طرح دوبارہ اپنی تعلیم مکمل کرنے لندن گئے۔ وہاں انھوں نے ایک کمپنی لوزک کمپنی میں ملازمت بھی حاصل کر لی انھیں اس کمپنی میں نادر ونایاب اشیاء کے جمع کرنے کے کام پر مامور کیا گیا تھا۔ وہ 1912 کے اختتام تک ملازمت کرتے رہے اور مختلف کتب خانوں میں جا کر مطالعے کا شوق بھی پورا کرتے رہے۔ اسی شوق کی تکمیل میں وہ فرانس بھی گئے۔ پیرس کی قومی لائبریری کا مشاہدہ کیا۔

1919-20 میں انھوں نے مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔تحریر میں پختگی ہونے کی وجہ سے شیخ عبدالقادر اپنے رسالے میں ان کے مضامین، تراجم اور نظمیں چھاپنے لگے۔شیخ عبدالقادر سے خوشگوار تعلقات کی بنا پر انھیں ان کی ایما پر ہی اسلامیہ کالج لاہور میں بطور لکچرر جنوری 1922 میں تقرری ہوئی۔وہ وہاں اردو اور فارسی کی تدریس دینے لگے۔پھر یکم اکتوبر 1928 کو اورینٹل کالج لاہور میں بطور اردو لکچرر ملازمت ملی۔

لوزک کمپنی کی ملازمت سے انھیں عتیقیات اور پرانی چیزیں جمع کرنے کا شوق ہوا تھا۔اسی شوق کے طفیل انھوں نے مسکوکات اور مخطوطات کا ایک بڑا ذخیرہ اکٹھا کرلیا تھا۔وہ کتابوں اور سکوں کو بڑی لگن کے ساتھ جمع کرتے تھے۔ پھر یہ رجحان اردو زبان وادب کی تحقیق وترویج کی جانب بڑھا اور اس میں وہ پوری طرح لگ گئے۔اور پورے طور پر خدمات انجام دیں۔

14 نومبر 1940 کو اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور کی ملازمت سے سبکدوش ہوکر وہ ٹونک واپس آگئے جہاں مولوی عبدالحق کی دعوت پر 1942 میں دلی پہنچے اور انجمن ترقی اردو کے مستقر میں مقیم ہوئے اور اپنے تحقیقی کاموں میں پوری طرح لگے رہے۔اس تمام عرصے میں وہ اپنی ادبی وتحقیقی سرگرمیوں سے ذرا بھی غافل نہ ہوئے اور کاموں کا سلسلہ چلتا رہا۔ان کے تحقیقی کتابوں کی تفصیلات آگے درج ہیں۔

15 فروری 1946 کو محمود شیرانی کا انتقال ہوا۔

10.3.2 حافظ محمود شیرانی کی تصنیفات وتالیفات

۱۔ پنجاب میں اردو، انجمن ترقی اردو، اسلامیہ کالج لاہور، ۱۹۲۸ء (اس کتاب کے درجنوں ایڈیشن ہندو پاک میں شائع ہوئے)

۲۔ تبصرہ برخزائن الفتوح، امیر خسرو۔لیتھو پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۳۵ء

۳۔ فردوسی پر چار مقالے، انجمن ترقی اردو، دہلی، ۱۹۴۲ء

۴۔ تنقید شعر العجم، انجمن ترقی اردو، دہلی، ۱۹۴۲ء

۵۔ تنقید پرتھوی راج راسا، انجمن ترقی اردو، دہلی، ۱۹۴۳ء

۶۔ خالق باری انجمن ترقی اردو، دہلی، ۱۹۴۴ء

۷۔ مقالات شیرانی، حافظ محمود شیرانی، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۴۸ء

۸۔ مقالات حافظ محمود شیرانی، مرتبہ: مظہر محمود شیرانی (کئی جلدیں) مجلس ترقی ادب لاہور اول، دوم 1966، سوم چہارم 1969، پنجم 1970، ششم 1972، ہفتم 1985، نہم 1991، دہم 2007 (سلسلہ جاری ہے)

۹۔ مکاتیب حافظ محمود شیرانی مجلس یادگار، لاہور 1981

۱۰۔ مجموعۂ نغز، ترتیب وتدوین حافظ محمود شیرانی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور 1937

۱۱۔ سرمایۂ اردو، ترتیب وتدوین حافظ محمود شیرانی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور 1935 (اس کے کئی ایڈیشن) ان کے مضامین ومقالات کی تعداد سینکڑوں سے زیادہ ہے۔

10.3.3 حافظ محمود شیرانی کے تحقیقی کارنامے۔اوصاف وامتیازات

اس بات پر سبھی کو اتفاق ہے کہ پچھلی صدی کے عظیم ترین محقق حافظ محمود شیرانی رہے ہیں۔انھوں نے مثبت تحقیق اور متنی تنقید کی بہترین مثالیں قائم کیں اور کتنے ہی ابھرے ہوئے محققوں کی ذہنی تربیت کی۔ انھوں نے تحقیق کے معیار کو بلند کیا اور اپنی تحقیقی ذہن اور تنقیدی شعور کی وجہ سے اردو تحقیق کے معلم اول کہلائے۔

''پنجاب میں اردو'' ان کی ایسی کتاب ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے محرک علامہ اقبال تھے۔محمود شیرانی نے یہ کتاب اسلامیہ کالج، لاہور میں دوران تدریس ہی مکمل کر لی تھی۔ یہ ان کا معرکہ آرا تحقیقی ولسانی اہمیت کا حامل ایسا کام ہے، جس نے اردو تحقیق ولسانیات میں بحث کے کئی دریچے وا کر دیے۔اس کا پہلا ایڈیشن 1928 میں شائع ہوا تھا،اس کے بعد اس کے کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔اس کتاب کی وجہ سے رشید حسن خان نے حافظ محمود شیرانی کو اردو میں فن تحقیق کا امام تسلیم کیا ہے۔ان کے مطابق پنجاب میں اردو کے موضوع پر محمود شیرانی کے تحقیقات مثال اور سند کا درجہ رکھتی ہیں۔

''پنجاب میں اردو'' میں انھوں نے اردو زبان کی پیدائش اور اس کے مولد سے تفصیلی بحث کی ہے۔ دلائل سے ثابت کیا ہے کہ اردو کا اصل وطن پنجاب ہے اور وہی اس کی جائے پیدائش ہے۔پنجابی زبان کا اردو زبان سے کیا رشتہ ہے اس سوال کا جواب انھوں نے اس کتاب میں دلائل و براہین کے ساتھ تاریخی پس منظر کے حوالے سے دیا ہے۔محمود شیرانی نے کتاب کے مقدمے میں اس کتاب کی غرض وغایت بیان کی ہے اردو زبان کی قدامت، اس کا بھاشا سے تعلق، ارتقا کس زبان سے ہوا، مسلمانوں کی آمد کے وقت دہلی میں بولے جانے والی زبان، اردو کا دہلی میں پہنچنا، اردو، ملتانی اور پنجابی کی مماثلت، پنجاب پر فارسی اور ایرانی تمدن کے اثرات، غزنوی دور میں مسلمانوں کی زبان، دہلی سے اردو کا دوسرے علاقوں میں پہنچنا، اردو کی مقبولیت، ہریانوی زبان، عہد عالمگیری، پنجاب میں اردو کا مرکز، اردو املا اور رسم الخط، اردو اور پنجابی کے اشتراکات پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

محمود شیرانی نے شمالی ہند میں اردو کی تصنیفی عمر کے بارے میں یہ مغالطہ دور کیا ہے کہ اس کی شروعات عہد محمد شاہ یا اس کے قریبی زمانے سے ہوئی اور یہ کہ اس زبان کا تعلق ابتدا میں صرف اردوئے معلیٰ سے تھا۔ان کے نزدیک اصلیت یہ ہے کہ اردو نے ایک عوامی زبان کی حیثیت سے ہر اس جگہ ترقی پائی جہاں اسے پھلنے، پھولنے کا مواقع نصیب ہوئے۔

سید محمد عبداللہ نے حافظ محمود شیرانی کے تحقیقی کارناموں کے حوالے سے ایک جگہ لکھا ہے۔

''شیرانی نے اپنی تحقیق میں خارجی شواہد کے علاوہ داخلی شہادت کا طریقہ استعمال کیا اور یہ بہت کامیاب رہا۔اس طریقے

سے انھوں نے بعض کتابوں کے غلط انتساب کے مغالطّوں کو دور کیا۔ مثلاً دیوان حسن، دیوان معینی، پرتھی راج راسا اور خالق باری جو اپنے اصل مصنفوں کے بجائے بعض دوسرے لوگوں کی طرف منسوب ہوگئی تھیں۔ پروفیسر شیرانی نے اصل مصنفوں کو ان کی گم شدہ کتابیں دلوائیں۔ یہ بازیافت بھی گمشدہ بازیافت کی طرح پروفیسر شیرانی کا خاص میدان تحقیق تھا اور اس میں ان کی یکتائی تسلیم شدہ امر ہے۔''

حافظ محمود شیرانی کا استدلال اتنا قوی نظر آتا ہے کہ اس سے اختلاف ناممکن ہے۔ اس کتاب سے انھوں نے اردو لسانیات کے باب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے اس نے کئی حوالوں کے نئے نئے موضوعات اور مباحث کو جنم دیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد ان کے نظریے کی تائید میں کئی اہم مصنفین اور ماہرین لسانیات نے مضامین لکھے۔ حالانکہ اس پر اعتراضات بھی خوب کئے گئے اور نظریے کی مخالفت میں بھی بہت کچھ لکھا گیا لیکن کتاب کی اہمیت آج بھی مسلم ہے۔

''فردوسی پر چار مقالے'' یہ محمود شیرانی کی ان مضامین کے متعلق ہے جو انھوں نے فارسی ادب کے حوالے سے لکھا ہے۔ یہ مضامین تحقیقی نقطۂ نظر سے لکھے گئے۔ ان کی تفصیل یوں ہے:

۱۔ شاہنامہ کی نظم کے اسباب اور زمانہ

۲۔ ہجو سلطان محمود غزنوی

۳۔ فردوسی کا مذہب

۴۔ یوسف زلیخائے فردوسی

یہ چاروں مضامین یکجا ہو کر ایک ایسی کتاب کی شکل اختیار کر گئے جو فردوسی کی شخصیت کے مختلف النوع پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ محمود شیرانی نے شاہنامہ کی ابتدا کے حوالے سے سیر حاصل بحث کی ہے ان کے خیال میں خاتمۂ شاہنامہ میں فردوسی صاف ظاہر کر رہے کہ انھوں نے اس تصنیف کی تکمیل میں کامل ۳۵ برس صرف کئے۔

فردوسی کے تعلق سے دوسرا مضمون یا باب ''ہجو سلطان محمود غزنوی'' کے عنوان سے ہے۔ ایک روایت یہ بھی کہ فردوسی نے سلطان کی ہجو میں ایک سو بیت لکھے۔ یہ ہجو شہر یار نے فردوسی سے ایک لاکھ میں خرید لی اور اس کو دھوڈالا۔ سلطانی ہجو اس طرح ضائع ہوگئی لیکن اس کے کئی اشعار باقی رہ گئے۔ اس مقالے میں شیرانی نے بحث کی ہے کہ کیا مذہبی مخالفت کی وجہ سے سلطان محمود فردوسی سے ناراض تھا جس کی وجہ سے فردوسی نے اس کی ہجو لکھی۔ ہجو کی تصنیف یا اس کی ترتیب کے لئے شاہنامہ سے مدد لی گئی۔ ربط کلام کے لئے بعض اشعار میں اصلاح یا تبدیلی کی گئی، نئے اشعار کی بھی اس میں شمولیت ہوئی۔ اس طرح سے ہجو تیار ہوتی ہے جو بلاشبہ فردوسی کی تصنیف مانی جاتی ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے ہجو کے سلسلے میں جو تحقیق پیش کی ہے وہ اپنی جگہ اہمیت اور استناد کا درجہ رکھتی ہے۔

''فردوسی کا مذہب'' میں اس امر سے بحث کی گئی ہے کہ آیا وہ شیعہ تھا یا سنی، ملحد تھا یا مجوسی،۔ شیرانی کی تحقیق کے مطابق قدیم روایات فردوسی کو شیعہ مانتی ہیں لیکن وہ بھی کہتے ہیں کہ شاہنامہ میں کچھ ایسے اشعار ملتے ہیں جن کی بنا پر ان کا تعلق سنت جماعت سے

کہا جاسکتا ہے۔ یہ دلچسپ تحقیقی مقالہ ہے۔

''یوسف وزلیخائے فردوسی'' کے بارے میں محمود شیرانی کا بھی ماننا ہے کہ اہل بغداد کی خوشنودی کے لئے اپنے قیام بغداد کے دوران ''یوسف زلیخا'' تصنیف کی۔ یوسف زلیخا کے مقدمے میں فردوسی نے لکھا ہے کہ میں نے اکثر داستانیں اور پرانے قصے نظم کئے ہیں جن میں رزم بزم، دوستی، عداوت، بلندی، پستی سے بحث کی گئی ہے۔ عشاق کے حالات لکھے، معشوقوں کا تذکرہ کیا۔ لیکن حافظ شیرانی اس کے منکر ہیں ان کا ماننا ہے کہ بغیر کسی تردد کے کہا جاسکتا ہے کہ یہاں ہم فردوسی سے دوچار نہیں بلکہ کسی اور شاعر سے جو فردوسی سے مختلف ہے اور جس کی شاعری کی شہرت بھی عام طور پر نا معلوم ہے۔

''تنقید شعرالعجم'' حافظ محمود شیرانی کی ایسی کتاب ہے جو شبلی نعمانی کی کتاب ''شعرالعجم'' پر تنقید کرتے ہوئے کئی مضامین انھوں نے لکھے اور یہ سارے مضامین اس کتاب میں جمع ہیں۔ اس کتاب میں مشمولہ مضامین میں محمود شیرانی کی تحقیقی عرق ریزی نمایاں ہے۔ انھوں نے شبلی نعمانی کی تحقیقی فردگزاشتوں کی مضبوط گرفت کی ہے اور جا بجا ان کے فرمودات اور اظہارات کے حوالے سے وہ تحقیقی اور تنقیدی رویہ اپنایا ہے کہ حافظ شیرانی کی تحقیقی بصیرت سامنے نظر آتی ہے۔

شبلی نعمانی جیسی قدر آور علمی ادبی شخصیت سے مرعوب ہوئے بغیر انھوں نے بلا جھجک ان غلطیوں کی طرف اشارے کئے ہیں جو اس کتاب میں راہ پا گئی ہیں۔ مثلاً انھوں نے بتایا ہے کہ رودکی کی شاعری پر بحث کے دوران جو اشعار درج کئے گئے ہیں وہ رودکی کے نہیں بلکہ قطران تبریزی کے ہیں۔ محمود شیرانی کی تحقیق وتنقید سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح غلط انتسابات کی چھان بین کی جاتی ہے اور حقائق تک کس طرح پہنچا جاتا ہے۔

''تنقید پرتھی راج راسا'' یہ کتاب چند بردائی کی تصنیف ''پرتھی راج راسا'' کی تنقید پر مشتمل ہے۔ محمود شیرانی نے اورینٹل کالج میگزین کے مختلف شماروں میں اس کتاب پر مضامین لکھے جو بصورت کتاب شائع ہوئی اسے 1943ء میں انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کیا۔ راسا کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ چند بردائی کی تصنیف ہے جو پرتھی راج راسا کے عہد کا شاعر تھا۔ اس بنا پر دیسی زبانوں میں اس کتاب کو قدیم تصنیف کا درجہ دیا جاتا ہے۔ یہ کتاب پرتھی راج راسا اور سلطان شہاب الدین کے مابین جنگوں کے حالات وواقعات پر مبنی ہے جس میں پرتھی راج راسا کی سوانح بھی شامل ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کتاب ایک جعلی تصنیف ہے جو کہ سترہویں صدی میں لکھی گئی ہے اور اس کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں۔ محمود شیرانی نے اپنے تحقیقی دلائل وبراہین سے ثابت کیا ہے کہ کتاب میں مشمولہ شواہد ونظائر بتاتے ہیں کہ راسا کوئی معاصر تصنیف نہیں بلکہ ایک موخر تالیف ہے جو اکبری یا عہد جہانگیری سے تعلق رکھتی ہے۔ محمود شیرانی کی تحقیق کی تائید میں کئی ہندو محققین بھی سامنے آئے تھے۔

''خالق باری'' کو ایک عرصہ تک بلکہ ابھی تک امیر خسرو کی تصنیف سمجھا جاتا رہا ہے۔ محمود شیرانی نے اپنی تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ خالق باری امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مصنف عہد جہانگیر کے ایک شاعر ضیاء الدین خسرو ہیں اور یہ ۱۰۳۱ھ میں تصنیف ہوئی تھی جبکہ امیر خسرو کا انتقال ۷۲۵ھ میں ہوا تھا۔ محمود شیرانی نے خالق باری کے متعلق سے جو انکشافات کئے ہیں وہ اہم ہیں اور یہ تاریخ ساز تحقیقی کام ہے۔ یہ کتاب محمود شیرانی کے مقدمے اور تصحیحات کے ساتھ انجمن ترقی اردو نے شائع کیا۔ محمود

شیرانی کی تحقیقی محنت اور علمی لیاقت کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔

''مجموعۂ نغز'' محمود شیرانی کی ترتیب و تدوین کردہ ایک اہم ترین کتاب ہے۔ میر قدرت اللہ قاسم کی تالیف ''مجموعہ نغز'' پنجاب یونیورسٹی لاہور سے 1933ء میں شائع ہوئی۔ شروع میں مصنف کے حالات اور کتاب کا مختصر تعارف دیا گیا ہے۔ الگ سے کتابی شکل میں ان کی تصنیف کی اشاعت سے محمود شیرانی کی تحقیقی تلاش و جستجو کا ایک اہم گوشہ سامنے آتا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ محمود شیرانی نے سیکڑوں مضامین، تبصرے اور مقدمے لکھے۔ جو مقالات شیرانی، کے نام سے تقریباً دس جلدوں میں شائع ہوئے۔ محمود شیرانی نے ہر اس موضوع کو قابل اعتنا سمجھا جس پر کس طرح کی تحقیق کی گنجائش ہے یا جو تنقید کے دائرے میں آتا ہو۔ انھوں نے مختلف النوع موضوعات پر مقالات لکھے اور کم و بیش تمام تحریروں میں اپنے تحقیقی انداز نظر اور فکری اور علمی طریقۂ کار کو ملحوظ خاطر رکھا۔

انھوں نے جب سے شعور سنبھالا تحقیق و تنقید اور درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ کتابوں، مخطوطوں اور دیگر نوادارات کی چھان بین تلاش و جستجو نیز ان پر سیر حاصل مضمون نویسی، ان سب مرحلوں سے گزرتے ہوئے انھوں نے اردو زبان و ادب کے لئے ایسے تحقیقی کام کر دیے جو معیار و مقدار کے لحاظ سے اس قدر گرانقدر اور زیادہ ہیں کہ اردو زبان و ادب میں ان کے ہم عصروں میں بہت کم لوگ اس درجے کو پہنچ پاتے ہیں۔

حافظ محمود شیرانی کی زبان و ادب کے حوالے سے خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شیرانی نے بطور محقق، مدون، نقاد، تبصرہ نگار، شاعر، مورخ اور ماہر عتیقیات نہایت ہی قابل قدر سرمایہ چھوڑا ہے۔ انھوں نے اردو تحقیق کو شک و شبے اور مبالغہ آرائی، پسند و ناپسند اور ذاتی تعصّبات کی فضا سے نکال کر سند اور استدلال کے ضابطوں سے ہمکنار کیا۔ انھوں نے تحقیق و تنقید کے وہ اصول و ضابطے وضع کئے جس سے آنے والے محققین نے رہنما اصول وضع کئے۔

10.4 قاضی عبدالودود: حیات اور ادبی کارنامے

10.4.1 قاضی عبدالودود: سوانحی کوائف اور حالات زندگی

قاضی عبدالودود ایک معزز اور سخت قسم کے مذہبی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کا دادھیالی سلسلہ حضرت مخدوم شرف الدین احمد کے واسطے سے مشہور صوفی بزرگ امام تاج فقیہہ سے ملتا ہے۔ وہ ۱۱۸۰ء میں فلسطین سے ہندوستان آئے تھے اور بہار کے ایک شہر منیر میں (ضلع پٹنہ) میں قیام فرمایا تھا۔ قاضی صاحب کے والد قاضی عبدالوحید بھی زیادہ کٹر اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ قاضی صاحب کے دادا سید احمد شہید بریلوی کے مرید و معتقد تھے۔ ان کا نانیہالی خاندان بھی حضرت موسیٰ رضا کے وسیلہ سے حضور صلعم تک پہنچتا ہے۔ اس لئے سادات رضویہ کہلاتا ہے۔

قاضی عبدالودود کی پیدائش 1896 میں ہوئی۔ 1976 میں جب معاصر پٹنہ نے ان پر خصوصی شمارہ شائع کیا تو اس کے لئے قاضی صاحب صرف تاریخ پیدائش نہ بتا سکے بلکہ سال ولادت کے بارے میں ان کو پورا یقین نہ تھا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ

''میری عمر کے 81 سال گزر چکے ہیں اور سال ہشتادودوم گزر رہا ہے۔ یہ تخمین پر مبنی ہے۔'' اس طرح ڈاکٹر محمد حسن کے نام ایک خط مورخہ 8 اکتوبر 1974 میں لکھا ہے۔''میری عمر کے 78 سال گزر چکے ہیں۔ یہ ہفتادونہم ہے۔'' لیکن یہ طے ہے کہ ان کی ولادت عظیم آباد یعنی موجودہ پٹنہ میں ہوئی تھی۔

قاضی عبدالودود کی ابتدائی تعلیم اس زمانے کے رسوم ورواج کے مطابق گھر پر ہوئی۔ ابتدائی درس وتدریس کا سلسلہ اردو، فارسی اور عربی سے ہوا۔ اسی کے ساتھ قرآن کریم حفظ کرنا شروع کیا اور صرف چودہ سال کی عمر میں حافظ قرآن ہو گئے۔ یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ رمضان المبارک کی تراویح میں مکمل کلام پاک سنانے کی سعادت بھی حاصل کی۔ ان کی والدہ محترمہ ہمیشہ ان کا خیال رکھتی تھیں وہ قاضی صاحب کے فیصلے اور منشا کا پورا خیال رکھتی تھیں یہی سبب ہے کہ قاضی صاحب نے اپنی والدہ کو تیار کرلیا اور مذہبی تعلیم کو جاری رکھنے کے تمام امکانات کو یکسر ختم کر دیا۔ ان کے عربی کے استاد مشہور معلم علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے سید سلیمان اشرف صاحب تھے۔ انھوں نے دینی تعلیم کو خیر باد کہا اور انگریزی پڑھنے کی طرف راغب ہوئے۔ محمڈن اسکول پٹنہ میں درجہ پنجم میں داخلہ لیا اور ایک سال کے بعد علی گڑھ چلے آئے جہاں سرسید کے قائم کردہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں درجہ سوم میں داخلہ لیا۔ اسی زمانہ میں قاضی صاحب نے طے کیا کہ اعلیٰ تعلیم وہ انگلستان میں جاکر حاصل کریں گے۔ چنانچہ یہیں سے اس کی تیاری شروع کردی۔ لیکن حالات سازگار نہ ہونے کے سبب وہ اس وقت نہ جاسکے اور پٹنہ واپس آگئے۔ اور پرائیویٹ طور پر 1916 میں ہائی اسکول کا امتحان دیا اور اول نمبر حاصل کیا۔ 1918 میں پٹنہ کالج سے انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ اس میں وہ فرسٹ ڈویژن سے کامیاب ہوئے۔ دو سال بعد 1920 میں بی اے پاس کیا۔ انھوں نے تعلیمی دور میں انگریزی، فارسی، اردو، فارسی ادبیات اور تاریخ جیسے سبجکٹ لئے تھے اس لئے ان کو شاندار کامیابی ملی۔ مارچ 1923 میں وہ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے لندن چلے گئے وہاں کیمبرج یونیورسٹی سے 1927 میں معاشیات سے ٹرائی پوس TRIPOS کیا اس کے بعد 1929 میں مڈل ٹیمپل اِن Middle Temple Inn سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔

1927 میں جب قاضی عبدالودود ٹرائی پوس کر رہے تھے تو اچانک سخت علیل ہو گئے اور بیماری کی نوعیت کے اعتبار سے ان کو کئی ماہ سینی ٹوریم میں رہنا پڑا لیکن یہاں مناسب علاج نہ ملنے کے سبب سوئٹزرلینڈ جاکر علاج کرانا پڑا۔ یہاں ان کی ملاقات پنڈت جواہر لال نہرو سے ہوئی۔ دونوں میں پھر اتنی گہری دوستی ہوئی کہ نہرو خاندان سے ان کے مراسم مضبوط ہو گئے۔ یہ ملاقات کملا نہرو کے توسط سے ہوئی تھی کیونکہ وہ بھی اسی سینی ٹوریم میں علاج کی غرض سے داخل ہوئی تھیں جہاں پنڈت جواہر لال نہرو برابر اپنی اہلیہ کی دیکھ بھال اور ملاقات کے لئے آتے رہتے تھے۔

قاضی عبدالودود کو پلوریسی ہو گیا تھا، علاج تو چلا لیکن مکمل طور پر اس کا اثر زائل نہیں ہوا تھا اور تمام عمر وہ اس سے متاثر رہے دوران تعلیم انگلینڈ سے وہ لمبی تعطیل میں جرمنی گئے۔ وہاں کئی مہینے کے قیام کے دوران جرمن زبان دیکھی۔ تعطیلات میں فرانس بھی چلے جاتے اور وہاں فرانسیسی زبان سیکھی۔ فلسفہ نفسیات اور علم السیاست کی کتابیں بھی خود پڑھی تھیں۔

قاضی عبدالودود صاحب کی دو شادی ہوئی تھی۔ پہلا نکاح 1910 میں ہوا لیکن رخصتی نہ ہوئی تھی اور وہ خاتون ڈیڑھ سال

کے عرصے میں چل بسیں۔ پھر طویل عرصے بعد 1922 میں دوسرا نکاح شہر کے مشہور وکیل شاہ شیداللہ فرحت کی صاحبزادی سے ہوئی۔قاضی صاحب کے صرف ایک اولاد ہوئی۔

جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے کہ قاضی عبدالودود کو سیاحت کا بہت شوق تھا۔یہی سبب ہے کہ فرانس، جرمنی کے ساتھ ہالینڈ اور اٹلی کا بھی سفر کیا۔ان ممالک کی سیاحت کا مقصد وہاں کے مشہور کتب خانوں کی سیر کرنا تھا۔یہی سبب ہے کہ ان ممالک کے مشرقی علوم کے ذخائر پر ان کی گہری نظر رہی۔قاضی صاحب نے زمانۂ طالب علمی میں شاعری بھی کی تھی لیکن ان کا کلام دستیاب نہیں۔

قاضی عبدالودود نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایک کہانی لکھ کر کی تھی جو 1912 میں ''جذبات حسرت کا مصور'' کے فرضی نام سے آگرہ اخبار میں شائع ہوئی تھی۔انھوں نے معاصر 1976 کے قاضی عبدالودود نمبر میں ایک جگہ لکھا ہے:

> ''عنفوان شباب میں، میں نے خودرومانی انداز کی ایک کہانی لکھی۔اس کا عنوان مجھے یاد نہیں۔یہ آگرہ اخبار میں ایک فرضی نام ''جذبات حسرت کا مصور'' سے چھپی تھی۔''

قاضی عبدالودود کا پہلا مقالہ پٹنہ کے رسالہ ''المصباح'' کے اپریل 1923 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔انھوں نے اردو کی قدیم داستانوں کا وسیع مطالعہ کیا تھا اور زمانۂ طالب علمی میں یورپ کے افسانوی ادب کا بھی کثرت سے مطالعہ کیا تھا،اسی زمانے میں انھوں نے چند کہانیوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا۔صحافت سے بھی بڑی گہری دلچسپی تھی۔ باقاعدہ صحافتی زندگی کا آغاز انھوں نے 1936 میں ماہنامہ معیار جاری کر کے کیا لیکن یہ زیادہ دنوں تک نہ چل سکا۔1963 میں انھوں نے تحقیق کے نام سے بھی ایک رسالہ جاری کیا۔لیکن یہ بھی جاری نہ رہ سکا۔رسالہ ''معاصر'' 1940 میں اس وقت نکلا جب ان کے چند اساتذہ دوست نے ایک انجمن ''دائرہ ادب'' کے نام سے بنائی۔''معاصر'' قاضی صاحب کی نگرانی میں نکلا اور یہ بہت جلد اہم تحقیقی،تنقیدی رسالہ میں شمار کیا جانے لگا۔وہ عارضۂ قلب میں مبتلا تھے لیکن محض اپنی قوت ارادی کے تحت علمی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔جولائی 1979 میں قاضی صاحب پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ صاحب فراش ہو گئے۔طویل علالت کے بعد 25 جنوری 1984 کو پٹنہ میں انتقال کر گئے۔

10.4.2 قاضی عبدالودود کی تصنیفات وتالیفات

۱۔ عیارستان۔پٹنہ،ادارۂ تحقیقات اردو ۱۹۵۷ء

اس میں حسب ذیل تین کتابوں پر تفصیلی تبصرے شامل ہیں:

(۱) دیوان فائز: مرتبہ مسعود حسن رضوی

(۲) مرقع شعراء: مرتبہ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ

(۳) میر تقی میرؔ: حیات اور شاعری مؤلفہ خواجہ احمد فاروقی

۲۔ اشتر و سوزن۔پٹنہ،ادارۂ تحقیقات اردو ۱۹۶۴ء

اس میں مندرجہ ذیل کتابوں پر مبسوط تبصرے شامل ہیں:

(۱) عمدۂ منتخبہ یعنی تذکرۂ سرور: مرتبہ خواجہ احمد فاروقی

(۲) شآد کی کہانی، شآد کی زبانی: مرتبہ محمد مسلم عظیم آبادی

۳۔ دیوان جوشش عظیم آبادی: مرتبہ قاضی عبدالودود۔ دہلی، انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۴۱ء

۴۔ تذکرہ شعراء مؤلفہ امین اللہ طوفآن: مرتبہ قاضی عبدالودود

۵۔ قاطع برہان ورسائل متعلقہ مرزا غالبؔ، مرتبہ قاضی عبدالودود

۶۔ قطعات دلدآر (بہار کے قدیم شاعر دلدار بیگ دلدار کا کلام) مرتبہ قاضی عبدالودود

پٹنہ، ادارہ تحقیقات اردو (ب ت)

۷۔ شہر آشوب قلق

۸۔ فرہنگ آصفیہ پر تبصرہ پٹنہ، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۸۱ء

ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے سیکڑوں مضامین، مقالات، تبصرے، مقدمے اور دیباچے لکھے۔ ان ساری تحریروں میں ان کا مدلل تحقیقی انداز نمایاں ہے۔

10.4.3 قاضی عبدالودود کے تحقیقی کارنامے۔ اوصاف وامتیازات

قاضی عبدالودود اردو زبان وادب میں ایک ایسے محقق کی حیثیت سے جانے پہچانے جائیں گے جن کے تحقیقی کارنامے فقید المثال اور عدیم النظیر ہیں۔ اردو ادب میں تحقیق کے موضوع پر کوئی بھی گفتگو یا اردو ادب کی کوئی بھی تاریخ قاضی عبدالودود کے نام کے بغیر نامکمل ہے۔ قاضی عبدالودود کی شہرت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ تحقیق میں انھوں نے ہمیشہ راست گوئی سے کام لیا۔ یہاں ان کے تحقیقی فتوحات کی تحسین آفرینی ہوئی، انھیں بے مثال کارنامہ قرار دیا، ان کو عظیم محقق، تحقیق کا معلم ثانی اور بت شکن محقق جیسے القاب سے یاد کیا جاتا ہے وہیں کچھ حضرات بربنائے تعصّبات ان کے تحقیقی کارناموں کو منفی تحقیق، نکتہ چینی اور عیب جوئی پر محمول کرتے ہیں۔ لیکن قاضی عبدالودود کی تحریروں کا بغور مطالعہ کریں تو معترضین کی بہت سی باتیں ازخود غلط ثابت ہو جاتی ہیں۔ قاضی صاحب کے یہاں رعایت، درگذر یا معانی کا کوئی خانہ نہیں ہے۔

قاضی عبدالودود نے باضابطہ کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن ترتیب وتدوین کا کام کیا۔ اس کے علاوہ ان کے مضامین کی تعداد تقریباً تین سو کے قریب ہے۔ ایک ہی موضوع پر کئی کئی مضامین ہیں۔ ان مضامین میں تحقیق کے ساتھ تنقید کا پہلو بھی نمایاں ہوتا تھا۔ وہ اپنے قریبی احباب کو بھی اس مسئلے میں نہیں بخشتے تھے چاہے وہ مولانا ابوالکلام آزاد ہوں، مولوی عبدالحق، شاد عظیم آبادی ہوں یا ان کے مخلص دوست فخر الدین علی احمد یا بیرسٹر نورالدین احمد۔ خواہ معاصر محققین میں مسعود حسن رضوی ہوں، خواجہ احمد فاروقی ہوں، رام بابو سکسینہ ہوں یا ڈاکٹر گیان چند جین۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے ایک جگہ لکھا ہے:

''مصنف مزاجی جب اس انتہا کو پہنچ جائے تو ہو یہ جاتا ہے کہ پھر زبان اور معلم دونوں اپنے بس میں نہیں رہتے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے انصاف پسندی کے فرشتہ نے اپنے۔۔۔ پھیلا کر زبان وقلم دونوں کو ان کے مالک کے قبضے سے الگ کھینچ کر اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ ایک بار بڑی بے بسی سے کہنے ''کبھی کبھی تو اپنی عادت سے بڑی تکلیف محسوس ہوتی ہے مگر ایسی بری عادت پڑ گئی ہے کہ زبان سے ایسی باتیں نکل جاتی ہیں سننے والے اس شخص سے جا کر کہہ دیتے ہیں جاننے والا ہوتا ہے اور ایس دکھا ہوتا ہے تو اس سے مجھے بھی تکلیف ہوتی ہے مگر میں کیا کروں۔'' (معاصر 1976)

مولوی عبدالحق کی مرتبہ کتاب تذکرۂ گلشن ہند مولفہ مرزا علی لطف (مطبع 1934) میں ان کے مقدمے پر اعتراض کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے۔ ''انھیں اس کے سوا کہ اشتیاق کے بارے میں دو سطروں کا حاشیہ بڑھا دیں۔ ۲۸ برس گزر جانے پر بھی کچھ گھٹانے بڑھانے یا بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔'' (معاصر پٹنہ 15)

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی تالیف ''میر تقی پر: حیات وشاعری پر اپنے طویل تبصرے میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔'' آرزو سے قواعد اردو سیکھنا محتاج ثبوت ہے۔ قواعد میر کا میر سے کچھ سروکار نہیں۔ خواجہ عشرت راوی کی حیثیت سے بالکل ساقط الاعتبار ہیں۔ (اشتر وموزن، ص 9)

اس طرح کے مضامین پر ان کی نکتہ چینی سے قبل ضروری ہے کہ ان کی چند اہم تحقیقی کتابوں میں مشمولہ مضامین پر گفتگو کی جائے۔

''عیارستان'' 1957 میں تین مضامین شامل ہیں۔ دیوان فائز: مرتبہ مسعود حسن رضوی، مرقع شعراء۔ ڈاکٹر ام بابوسکسینہ اور میر تقی میر حیات وشاعری مولوف خواجہ احمد فاروقی۔

ان تینوں مضامین میں انھوں نے تحقیق کی ان خامیوں کی نشاندہی کی ہے جو اس میں راہ پا گئی ہے۔

''استر وسوزن'' جو 1964 میں شائع ہوئی اس میں دو کتابوں پر طویل مضامین ہیں۔

عمدۂ منتجہ یعنی تذکرۂ سرور مرتبہ خواجہ احمد فاروقی، اور شاد عظیم آبادی کی کہانی شاد کی زبانی مرتبہ مسلم عظیم آبادی۔

خواجہ احمد فاروقی کی کتاب پر تقریباً ساٹھ صفحوں کا تبصرہ ہے جو ان کے معروضات کی تردید میں لکھا گیا ہے اور اس میں انھوں نے تحقیقی اصول کے تحت اعتراضات صادر کئے ہیں۔

مسلم عظیم آبادی کی مرتبہ کتاب پر بھی تقریباً 70 صفحوں کا مقالہ ہے جس میں انھوں نے کھل کر بحث کی ہے اور شاد سے وابستہ بہت ساری باتوں کی تنقید کی ہے جس میں تحقیقی عناصر شامل ہیں۔ انھوں نے شواہد کی بنیاد پر اس کتاب کو موضوع بحث بنایا ہے۔

''دیوان جوشش عظیم آبادی'' قاضی عبدالودود صاحب کا ایک اہم ترین تحقیقی کارنامہ ہے انھوں نے جوشش کی دریافت اور

ان کی شاعرانہ خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ان کے حالات زندگی کے ان پہلوؤں کو واشگاف کیا ہے جو لوگوں کی نظروں سے مخفی تھے۔ یہ کتاب انجمن ترقی اردو کی جانب سے 1941 میں شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب قاضی صاحب کی مقبول ترین مرتبہ کتاب ہے جس کی وجہ سے انھیں بطور محقق استناد کا درجہ ملا۔

تذکرۂ شعراء مولفہ امین اللہ طوفان، قاضی عبدالودود کی مرتبہ کتاب ہے جس میں ایک طویل دیباچہ بھی شامل ہے۔

''قاطع برہان ورسائل'' متعلقہ مرزا غالب، قاضی عبدالودود کی ایک اہم کتاب ہے جس میں انھوں نے غالب کے حوالے سے تحقیقی کام خوب دلچسپی سے کیا۔ غالب ان کے پسندیدہ شاعر تھے۔ قاضی صاحب کو ماہر غالبیات کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ انھوں نے غالب کے غیر مطبوعہ خطوط کو ڈھاکہ کے حکیم حبیب الرحمٰن کے قلمی بیاض میں موجود تھے جن کی تعداد 32 تھی اور اس کے ساتھ دوسری فارسی کی نادر تحریروں کو اکٹھا کر کے آثار غالب کے نام سے شائع کیا لیکن بعد میں اس کا نام بدل کر ماثر غالب رکھا۔

غالب پر ان کے متفرق تحقیقی مضامین کا مجموعہ ''جہان غالب'' کے نام سے شائع ہوا جسے خدابخش لائبریری پٹنہ نے شائع کیا تھا۔

''شہرآشوب قلق'' ان کی اہم مرتبہ کتاب ہے جس کے دیباچے میں انھوں نے تحقیق کے ذریعہ قلق کی شاعرانہ عظمت اور ان کے زمانے کا احوال بیان کیا ہے۔

ترتیب وتدوین کے کام میں دیوان رضا، تذکرہ ابن طوفان وغیرہ کو اردو تحقیق میں شہرت ملی۔ ان کو انھوں نے بڑی دیانت داری اور علمی فراست کے ساتھ ترتیب وتدوین تک پہنچایا اور شرائط تحقیق کو ملحوظ خاطر رکھا۔

قاضی صاحب نے میر، مصحفی، انشا، مومن اور دوسرے شاعروں پر جو مضامین لکھے وہ انکی محققانہ شان کے مظہر ہیں۔ مومن کے خطوط کو قاضی صاحب نے پہلی بار تفصیل کے ساتھ مطالعہ کر کے اردو خطوط میں مومن کا تعارف کرایا۔

امتیاز علی خان عرشی نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ قاضی عبدالودود کو میں اردو زبان کے تحقیقی کام کرنے والوں کا راہ نما جانتا ہوں۔ اور بے باک تنقید میں انھیں مانتا ہوں۔ عرشی صاحب کی یہ رائے اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ کیونکہ قاضی عبدالودود ہی تحقیق میں ایک ایسی شخصیت ہیں جنھوں نے اردو تحقیق کو تنقید سے قریب تر کر دیا۔ تحقیق اور تنقید کے رشتے کو لازم وملزوم قرار دیا۔ بغیر تنقید کے تحقیق کا وجود یا تحقیق کے بغیر تنقید کا وجود لایعنی ہے۔

قاضی عبدالودود نے تحقیق کے میدان میں دو تین نسلوں کو متاثر کیا۔ اردو تحقیق میں محتاط انداز کو بڑھاوا دیا۔ وہ ہمیشہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ تحقیق میں اصل مراجع سے استفادہ لازمی ہے۔ اور کسی طرح کے بھی استنباط واستخراج نتائج میں سہل پسندی کو راہ نہیں دینی چاہئے۔

قاضی عبدالودود کے ایک معاصر یوسف حسین خان نے ایک جگہ لکھا ہے کہ قاضی صاحب نے اردو تحقیق کو باضابطہ شعبہ بنا دیا ہے اور اسے نہ صرف تنقید سے ممیز بلکہ ممتاز بھی کر دیا۔ انھوں نے اپنے عالمانہ مضامین ہو ثابت کر دیا کہ تنقید میں صحیح نتائج کا استخراج کرنے کے لئے تحقیق کے اصول کی پیروی کرنا قطعی طور پر ضروری ہے۔

قاضی عبدالودود نے تاریخ ادب کی گم شدہ کڑیوں کی صرف تلاش ہی نہیں کرتے ان کی جانچ پرکھ بھی کرتے ہیں اسی لئے وہ

تحقیق وتنقید دونوں کے بیک وقت مصرف لیتے ہیں۔ان کی تحقیقات میں تنقید وتمیز کی روشن اور تنقیدوں میں تحقیق کی صحت ہوتی ہے۔
انھوں نے عبدالحق کی

مرتبہ نکات الشعراء پر جو بے باکانہ رائیں دی ہیں وہ اس کی عمدہ مثال ہے۔قاضی صاحب شہادتوں کی تلاش میں قدیم ترین ماخذ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔وہ نقل درنقل کے قائل نہیں۔

رشید حسن خان نے ایک جگہ لکھا ہے:

''قاضی صاحب کی تحریروں سے تحقیق کو طاقتور عناصر ملے ہیں ان میں ظاہری سطح پر شاید سب سے نمایاں چیز تحقیق زبان ہے اور وہ اسلوب جو معنویت سے معمور اور رنگینی سے محفوظ ہے۔سادہ ہموار اور ایک حد تک کھر درے پن سے آراستہ۔ان کی تحریروں نے یہ سکھایا کہ بقدرضرورت الفاظ کو استعمال کرنا چاہئے اور بے ضرورت صفائی الفاظ کی تحقیق میں مطلق گنجائش نہیں۔''

قاضی عبدالودود کی اصل شناخت اردو تحقیق کی دنیا میں ان کے تحقیقی مضامین کی وجہ سے ہے۔جو سائنٹفک اصولوں کے نقطۂ نظر سے قابل قبول ٹھہرتے ہیں۔ان کو اپنے مضامین میں تعین زمانہ کا پورا خیال رہتا تھا۔انھوں نے شاعروں کے سن ولادت میں وفات،سفر کا زمانہ،تصانیف کا زمانہ اور ان کے معاصرین وغیرہ کا ذکر مختلف قرینوں سے زمانہ کا تعین کر کے لکھا جسے انھیں ''تعین زمانہ'' میں شامل کیا۔

اسی طرح مسعود حسن رضوی کے مرتبہ دیوان فائز پر تبصرہ کرتے ہوئے قاضی صاحب نے فائز کے والد کا نام محمد خلیل،تاریخ محمدی کے حوالے سے بتایا ہے۔تذکرۃ السلاطین چغتا سے فائز اور اس کے بھائیوں کے نام بتانے اور مجموعۂ گستاخ سے شیخ علی حزیں کے خطوط بنام فائز اطلاع دی۔یہ سب مسعود صاحب کی تحقیق میں مزید اضافے تھے۔اسی طرح فارسی کا ایک شعر ہے۔

در بزم وصال تو ہنگام تماشا
نظارہ ز جنبیدن مژگاں گلہ دارد

یہ نتائج الافکار میں نور جہاں بیگم،مجمع الاشکار میں عشرتی اور نور اللغات میں نسبتی کے نام سے ہے۔غالب نے اسے قدسی سے منسوب کیا ہے اور کہا ہے گویے اسے گاتے تھے۔قاضی عبدالودود نے HMV کے گراموفون ریکارڈ کی تلاش کی اور اسے پایا کہ یہ شعر قدسی کا ہے۔اس سے ظاہر ہوا کہ قاضی صاحب تحقیق میں اپنے ہر دعوے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔وہ ماخذ کی اہمیت اور ناگریزیت کو خوب اچھی طرح سمجھتے رہے۔ایک مثال ان کی تحقیقی کاوش دیکھئے۔شاد نے اپنی سوانح عمری ''شاد کی کہانی شاد کی زبانی'' میں اپنے نسب نامے میں پندرہویں پشت پر حسین فیروز پوری بادشاہ شیراز معاصر حافظ شیراز بتایا ہے۔اس سوانح عمری پر لکھتے ہوئے قاضی صاحب رقم طراز ہیں:

''سچ یہ ہے کہ اس نام کا کوئی بادشاہ کسی جگہ کسی زمانے میں نہیں ہوا۔جن اصحاب کو اس میں

شک ہو وہ شاہان اسلام کی فہرست میں جولین پولین (انگریزی، فرانسیسی، اس کی کتاب
اس وقت سامنے نہیں نام کی صحت نہیں) کی کتابوں میں ہیں، دیکھ لیں، اور اس پر بھی
اطمینان نہ ہو تو عربی فارسی کی کتب تاریخ کی بطور خود مطالعہ کرلیں (اشتر وسوزن، ص58)

قاضی عبدالودود اردو تحقیق میں ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جنھوں نے محققین کی فروگذاشتوں کی مضبوط گرفت کی چاہے وہ ان کے پیش رو ہوں یا معاصرین۔ انھوں نے شواہد اور دلائل دیے۔ ان کی تحقیق اردو زبان و ادب میں ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ جن محققین پر انھوں نے تنقیدیں کی ہیں اور غلطیوں اور غلط مفروضات کی نشاندہی کی ہے ان لوگوں نے بھی قاضی صاحب کی علمیت، ان کی تحقیقی ژرف نگاہی، ان کی قطعیت، ان کی متوازن اور مدلل آراء کو قابل اعتنا جانا اور سمجھا ہے۔

قاضی عبدالودود اردو تحقیق کا ایک ایسا روشن چراغ تھے جنھوں نے آنے والوں کو راہیں سمجھائی اور ان کے کاموں کے طور طریقوں کے لئے راستوں کو روشن کرنے کے امکانات پیدا کئے۔

10.5 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی کے ذریعہ آپ/کو

- حافظ محمود شیرانی کے سوانحی کوائف اور ان کے حالات زندگی سے واقفیت حاصل ہوئی۔
- حافظ محمود شیرانی کی تصنیفات وتالیفات کی معلومات حاصل ہوئی۔ ان کی کتابوں کے ناموں سے واقف ہو سکے
- حافظ محمود شیرانی کی اہم تحقیقی تصنیفات کے بارے میں جانکاری حاصل ہوئی۔
- حافظ محمود شیرانی کے تحقیقی کارناموں اور ان کی ادبی خدمات کے ساتھ ان کے تحقیقی اور تنقیدی اوصاف اور امتیازات کے بارے میں بھرپور علم حاصل ہوا۔
- قاضی عبدالودود کے سوانحی کوائف اور ان کے حالات زندگی سے واقفیت حاصل ہوئی۔
- قاضی عبدالودود کی تصنیفات وتالیفات کی معلومات حاصل ہوئی۔ ان کی کتابوں کے ناموں سے واقف ہو سکے
- قاضی عبدالودود کی اہم تحقیقی تصنیفات کے بارے میں جانکاری حاصل ہوئی۔
- قاضی عبدالودود کے تحقیقی کارناموں اور ان کی ادبی خدمات کے ساتھ ان کے تحقیقی اور تنقیدی اوصاف اور امتیازات کے بارے میں بھرپور علم حاصل ہوا۔

10.6 اپنا امتحان خود لیجیے

ا۔ حافظ محمود شیرانی کی تاریخ پیدائش اور جائے ولادت بتایئے۔

۲۔ حافظ محمود شیرانی کا انتقال کب ہوا تھا؟

۳۔ حافظ محمود شیرانی کی پانچ ان اہم کتابوں کے نام بتایئے جن کا تعلق تحقیق وتنقید سے ہے۔ان کا سن اشاعت بھی لکھیے۔

۴۔ بحیثیت محقق حافظ محمود شیرانی کے اوصاف وامتیاز پر اختصار سے ڈالیے۔

- قاضی عبدالودود کے سوانحی کوائف اوران کے حالات زندگی سے واقفیت حاصل ہوئی۔
- قاضی عبدالودود کی تصنیفات وتالیفات کی معلومات حاصل ہوئی۔ان کی کتابوں کے ناموں سے واقف ہوسکے
- قاضی عبدالودود کی اہم تحقیقی تصنیفات کے بارے میں جانکاری حاصل ہوئی۔
- قاضی عبدالودود کے تحقیقی کارناموں اوران کی ادبی خدمات کے ساتھ ان کے تحقیقی اورتنقیدی اوصاف اورامتیازات کے بارے میں بھرپور علم حاصل ہوا۔

10.7 سوالات کے جوابات

ا۔ حافظ محمود شیرانی کی پیدائش 5 اکتوبر 1880ء کو شہر ٹونک (راجستھان) میں ہوئی تھی۔

۲۔ حافظ محمود شیرانی کا 15 فروری 1946 کو انتقال ہوا۔

۳۔ ا۔ پنجاب میں اردو، انجمن ترقی اردو، اسلامیہ کالج لاہور، ۱۹۲۸ء

۲۔ تبصرہ برخزائن الفتوح، امیر خسرو۔لیتھو پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۳۵ء

۳۔ فردوسی پر چار مقالے، انجمن ترقی اردو، دہلی، ۱۹۴۲ء

۴۔ تنقید شعر العجم، انجمن ترقی اردو، دہلی، ۱۹۴۲ء

۵۔ تنقید پرتھوی راج راسا، انجمن ترقی اردو، دہلی، ۱۹۴۳ء

۴۔ اس بات پر سبھی کو اتفاق ہے کہ پچھلی صدی کے عظیم ترین محقق حافظ محمود شیرانی رہے ہیں۔انھوں نے مثبت تحقیق اورمتنی تنقید کی بہترین مثالیں قائم کیں اور کتنے ہی ابھرے ہوئے محققوں کی ذہنی تربیت کی۔انھوں نے تحقیق کے معیار کو بلند کیا اوراپنی تحقیقی ذہن اورتنقیدی شعور کی وجہ سے اردو تحقیق کے معلم اول کہلائے۔

''پنجاب میں اردو'' ان کی ایسی کتاب ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے محرک علامہ اقبال تھے۔محمود شیرانی نے یہ کتاب اسلامیہ کالج، لاہور میں دوران تدریس ہی مکمل کرلی تھی۔ یہ ان کا معرکہ آرا تحقیقی ولسانی اہمیت کا حامل ایسا کام ہے، جس نے اردو تحقیق ولسانیات میں بحث کے کئی دریچے واکردیے۔اس کا پہلا ایڈیشن 1928 میں شائع ہوا تھا،اس کے بعد اس کے کئی اڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔اس کتاب کی وجہ سے رشید حسن خان نے حافظ محمود شیرانی کو اردو میں فن تحقیق کا امام تسلیم کیا ہے۔ان کے مطابق پنجاب میں اردو کے موضوع پر محمود شیرانی کے تحقیقات مثال اورسند کا درجہ رکھتی ہیں۔

''پنجاب میں اردو'' میں انھوں نے اردو زبان کی پیدائش اوراس کے مولد سے تفصیلی بحث کی ہے۔ دلائل سے ثابت کیا ہے کہ اردو کا اصل وطن پنجاب ہے اوروہی اس کی جائے پیدائش ہے۔پنجابی زبان کا اردو زبان سے کیا رشتہ ہے اس سوال کا جواب

انھوں نے اس کتاب میں دلائل و براہین کے ساتھ تاریخی پس منظر کے حوالے سے دیا ہے۔محمود شیرانی نے کتاب کے مقدمے میں اس کتاب کی غرض وغایت بیان کی ہے اردو زبان کی قدامت، اس کا بھاشا سے تعلق، ارتقا کس زبان سے ہوا، مسلمانوں کی آمد کے وقت دہلی میں بولے جانے والی زبان، اردو کا دہلی میں پہنچنا، اردو، ملتانی اور پنجابی کی مماثلت، پنجاب پر فارسی اور ایرانی تمدن کے اثرات، غزنوی دور میں مسلمانوں کی زبان، دہلی سے اردو کا دوسرے علاقوں میں پہنچنا، اردو کی مقبولیت، ہریانوی زبان، عہد عالمگیری، پنجاب میں اردو کا مرکز، اردو املا اور رسم الخط، اردو اور پنجابی کے اشتراکات پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

محمود شیرانی نے شمالی ہند میں اردو کی تصنیفی عمر کے بارے میں یہ مغالطہ دور کیا ہے کہ اس کی شروعات عہد محمد شاہ یا اس کے قریبی زمانے سے ہوئی اور یہ کہ اس زبان کا تعلق ابتدا میں صرف اردوئے معلیٰ سے تھا۔ان کے نزدیک اصلیت یہ ہے کہ اردو نے ایک عوامی زبان کی حیثیت سے ہر اس جگہ ترقی پائی جہاں اسے پھلنے، پھولنے کا مواقع نصیب ہوئے۔

''تنقید شعر العجم'' حافظ محمود شیرانی کی ایسی کتاب ہے جو شبلی نعمانی کی کتاب ''شعر العجم'' پر تنقید کرتے ہوئے کئی مضامین انھوں نے لکھے اور یہ سارے مضامین اس کتاب میں جمع ہیں۔اس کتاب میں مشمولہ مضامین میں محمود شیرانی کی تحقیقی عرق ریزی نمایاں ہے۔انھوں نے شبلی نعمانی کی تحقیقی فرد گزاشتوں کی مضبوط گرفت کی ہے اور جا بجا ان کے فرمودات اور اظہارات کے حوالے سے وہ تحقیقی اور تنقیدی رویہ اپنایا ہے کہ حافظ شیرانی کی تحقیقی بصیرت سامنے نظر آتی ہے۔

شبلی نعمانی جیسی قدر آور علمی ادبی شخصیت سے مرعوب ہوئے بغیر انھوں نے بلا جھجک ان غلطیوں کی طرف اشارے کئے ہیں جو اس کتاب میں راہ پا گئی ہیں۔مثلاً انھوں نے بتایا ہے کہ رودکی کی شاعری پر بحث کے دوران جو اشعار درج کئے گئے ہیں وہ رودکی کے نہیں بلکہ قطران تبریزی کے ہیں۔محمود شیرانی کی تحقیق وتنقید سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح غلط انتسابات کی چھان بین کی جاتی ہے اور حقائق تک کس طرح پہنچا جاتا ہے۔

''تنقید پرتھی راج راسا'' یہ کتاب چند بردائی کی تصنیف ''پرتھی راج راسا'' کی تنقید پر مشتمل ہے۔محمود شیرانی نے اورینٹل کالج میگزین کے مختلف شماروں میں اس کتاب پر مضامین لکھے جو بصورت کتاب شائع ہوئی اسے 1943ء میں انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کیا۔راسا کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ چند بردائی کی تصنیف ہے جو پرتھی راج راسا کے عہد کا شاعر تھا۔اس بنا پر دیسی زبانوں میں اس کتاب کو قدیم تصنیف کا درجہ دیا جاتا ہے۔یہ کتاب پرتھی راج راسا اور سلطان شہاب الدین کے مابین جنگوں کے حالات وواقعات پر مبنی ہے جس میں پرتھی راج راسا کی سوانح بھی شامل ہے۔بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کتاب ایک جعلی تصنیف ہے جو کہ سترہویں صدی میں لکھی گئی ہے اور اس کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں۔محمود شیرانی نے اپنے تحقیقی دلائل و براہین سے ثابت کیا ہے کہ کتاب میں مشمولہ شواہد و نظائر بتاتے ہیں کہ راسا کوئی معاصر تصنیف نہیں بلکہ ایک موخر تالیف ہے جو اکبری یا عہد جہانگیری سے تعلق رکھتی ہے۔محمود شیرانی کی تحقیق کی تائید میں کئی ہندو محققین بھی سامنے آئے تھے۔

''مجموعۂ نغز'' محمود شیرانی کی ترتیب وتدوین کردہ ایک اہم ترین کتاب ہے۔میر قدرت اللہ قاسم کی تالیف ''مجموعہ نغز'' پنجاب یونیورسٹی لاہور سے 1933ء میں شائع ہوئی۔شروع میں مصنف کے حالات اور کتاب کا مختصر تعارف دیا گیا ہے۔الگ سے

کتابی شکل میں ان کی تصنیف کی اشاعت سے محمود شیرانی کی تحقیقی تلاش وجستجو کا ایک اہم گوشہ سامنے آتا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ محمود شیرانی نے سیکڑوں مضامین، تبصرے اور مقدمے لکھے۔ جو مقالات شیرانی، کے نام سے تقریباً دس جلدوں میں شائع ہوئے۔ محمود شیرانی نے ہر اس موضوع کو قابل اعتنا سمجھا جس پر کس طرح کی تحقیق کی گنجائش ہے یا جو تنقید کے دائرے میں آتا ہو۔ انھوں نے مختلف النوع موضوعات پر مقالات لکھے اور کم وبیش تمام تحریروں میں اپنے تحقیقی انداز نظر اور فکری اور علمی طریقۂ کار کو ملحوظ خاطر رکھا۔

۱۔ قاضی عبدالودود کی پیدائش 1896 میں ہوئی۔ ان کی ولادت عظیم آباد یعنی موجودہ پٹنہ میں ہوئی تھی۔

۲۔ جنوری 1984 کو پٹنہ میں انتقال کر گئے۔

۳۔ ۱۔ دیوان جوشش عظیم آبادی: مرتبہ قاضی عبدالودود۔ دہلی، انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۴۱ء

۲۔ تذکرہ شعراء مؤلفہ امین اللہ طوفاںؔ: مرتبہ قاضی عبدالودود

۳۔ قاطع برہان ورسائل متعلقہ مرزا غالبؔ، مرتبہ قاضی عبدالودود

۴۔ قاضی عبدالودود اردو زبان وادب میں ایک ایسے محقق کی حیثیت سے جانے پہچانے جائیں گے جن کے تحقیقی کارنامے فقید المثال اور عدیم النظیر ہیں۔ اردو ادب میں تحقیق کے موضوع پر کوئی بھی گفتگو یا اردو ادب کی کوئی بھی تاریخ قاضی عبدالودود کے نام کے بغیر نامکمل ہے۔ قاضی عبدالودود کی شہرت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ تحقیق میں انھوں نے ہمیشہ راست گوئی سے کام لیا۔ یہاں ان کے تحقیقی فتوحات کی تحسین آفرینی ہوئی، انھیں بے مثال کارنامہ قرار دیا، ان کو عظیم محقق، تحقیق کا معلم ثانی اور بت شکن محقق جیسے القاب سے یاد کیا جاتا ہے وہیں کچھ حضرات بر بنائے تعصّبات ان کے تحقیقی کارناموں کو منفی تحقیق، نکتہ چینی اور عیب جوئی پر محمول کرتے ہیں۔ لیکن قاضی عبدالودود کی تحریروں کا بغور مطالعہ کریں تو معترضین کی بہت سی باتیں از خود غلط ثابت ہو جاتی ہیں۔ قاضی صاحب کے یہاں رعایت، درگذر یا معانی کا کوئی خانہ نہیں ہے۔

قاضی عبدالودود نے باضابطہ کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن ترتیب وتدوین کا کام کیا۔ اس کے علاوہ ان کے مضامین کی تعداد تقریباً تین سو کے قریب ہے۔ ایک ہی موضوع پر کئی کئی مضامین ہیں۔ ان مضامین میں تحقیق کے ساتھ تنقید کا پہلو بھی نمایاں ہوتا تھا۔ وہ اپنے قریبی احباب کو بھی اس مسئلے میں نہیں بخشتے تھے چاہے وہ مولانا ابوالکلام آزاد ہوں، مولوی عبدالحق، شاد عظیم آبادی ہوں یا ان کے مخلص دوست فخر الدین علی احمد یا بیرسٹر نور الدین احمد۔ خواہ معاصر محققین میں مسعود حسن رضوی ہوں، خواجہ احمد فاروقی ہوں، رام بابو سکسینہ ہوں یا ڈاکٹر گیان چند جین۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے ایک جگہ لکھا ہے:

> ''مصنف مزاجی جب اس انتہا کو پہنچ جائے تو ہو یہ جاتا ہے کہ پھر زبان اور معلم دونوں اپنے بس میں نہیں رہتے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے انصاف پسندی کے فرشتہ نے اپنے ... پھیلا کر زبان وقلم دونوں کو ان کے مالک کے قبضے سے الگ کھینچ کر اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ ایک بار بڑی بے بسی سے کہنے'' کبھی کبھی تو اپنی عادت سے بڑی تکلیف محسوس ہوتی

ہے مگر ایسی بری عادت پڑ گئی ہے کہ زبان سے ایسی باتیں نکل جاتی ہیں سننے والے اس
شخص سے جا کر کہہ دیتے ہیں جاننے والا ہوتا ہے اور ایس دکھا ہوتا ہے تو اس سے مجھے بھی
تکلیف ہوتی ہے مگر میں کیا کروں۔'' (معاصر 1976)

مولوی عبدالحق کی مرتبہ کتاب تذکرۂ گلشن ہند مولفہ مرزا علی لطف (مطبع 1934) میں ان کے مقدمے پر اعتراض کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے۔ ''انھیں اس کے سوا کہ اشتیاق کے بارے میں دوسطروں کا حاشیہ بڑھا دیں۔ ۲۸ برس گزر جانے پر بھی کچھ گھٹانے بڑھانے یا بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔'' (معاصر پٹنہ 15)

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی تالیف ''میر تقی پر: حیات وشاعری پر اپنے طویل تبصرے میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ''آرزو سے قواعد اردو سیکھنا محتاج ثبوت ہے۔ قواعد میر کا میر سے کچھ سروکار نہیں۔ خواجہ عشرت راوی کی حیثیت سے بالکل ساقط الاعتبار ہیں۔ (اشتر و موزن، ص 9)

اس طرح کے مضامین پر ان کی نکتہ چینی سے قبل ضروری ہے کہ ان کی چند اہم تحقیقی کتابوں میں مشمولہ مضامین پر گفتگو کی جائے۔

''عیارستان'' 1957 میں تین مضامین شامل ہیں۔ دیوان فائز: مرتبہ مسعود حسن رضوی، مرقع شعراء۔ ڈاکٹر ام بابو سکسینہ اور میر تقی میر حیات وشاعری مولوف خواجہ احمد فاروقی۔

ان تینوں مضامین میں انھوں نے تحقیق کی ان خامیوں کی نشاندہی کی ہے جو اس میں راہ پا گئی ہے۔

''استر و سوزن'' جو 1964 میں شائع ہوئی اس میں دو کتابوں پر طویل مضامین ہیں۔

عمدۂ منتخبہ یعنی تذکرۂ سرور مرتبہ خواجہ احمد فاروقی، اور شاد عظیم آبادی کی کہانی شاد کی زبانی مرتبہ مسلم عظیم آبادی۔

خواجہ احمد فاروقی کی کتاب پر تقریباً ساٹھ صفحوں کا تبصرہ ہے جو ان کے معروضات کی تردید میں لکھا گیا ہے اور اس میں انھوں نے تحقیقی اصول کے تحت اعتراضات صادر کئے ہیں۔

مسلم عظیم آبادی کی مرتبہ کتاب پر بھی تقریباً 70 صفحوں کا مقالہ ہے جس میں انھوں نے کھل کر بحث کی ہے اور شاد سے وابستہ بہت ساری باتوں کی تنقید کی ہے جس میں تحقیقی عناصر شامل ہیں۔ انھوں نے شواہد کی بنیاد پر اس کتاب کو موضوع بحث بنایا ہے۔

''دیوان جوشش عظیم آبادی'' قاضی عبدالودود صاحب کا ایک اہم ترین تحقیقی کارنامہ ہے انھوں نے جوشش کی دریافت اور ان کی شاعرانہ خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ان کے حالات زندگی کے ان پہلوؤں کو واشگاف کیا ہے جو لوگوں کی نظروں سے مخفی تھے۔ یہ کتاب انجمن ترقی اردو کی جانب سے 1941 میں شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب قاضی صاحب کی مقبول ترین مرتبہ کتاب ہے جس کی وجہ سے انھیں بطور محقق استناد کا درجہ ملا۔

10.8 فرہنگ

الفاظ	معنی

اوصاف	خوبیاں،خصوصیات
آگاہی	آگاہ کرنا
ممتاز	الگ،مختلف
خامہ فرسائی	لکھنا
آشنا	دوست،واقفیت رکھنے والا
متنوع	قسم قسم کا
اذیت	دکھ
خوشگوار	پسندیدہ،دلکش
شعور	سمجھ بوجھ،سلیقہ
نمایاں	ظاہر
خوشنودی	رضامندی
قوی	طاقتور
مرعوب	رعب میں آیا ہوا،ڈرنے والا
تعصب	حقیقت ظاہر ہونے کے بعد بھی حق بات سے انکار
منصف مزاج	وہ شخص جو انصاف پسند ہو
مظہر	ظاہر ہونے کی جگہ

10.9 کتب برائے مطالعہ

۱۔رسالہ اردو کراچی محمود شیرانی نمبر

۲۔تاریخ ادب اردو۔ڈاکٹر جمیل جالبی

۳۔مختصر تاریخ اردو ادب۔انور سدید

۴۔گیان چند جین۔تحقیق کا فن

۵۔ڈاکٹر وہاب اشرفی۔تاریخ ادب اردو

۶۔محمد حنیف شاہد (مرتب) مقالات عبدالقادر،

۳۔مٓا صر پٹنہ۔قاضی عبدالودود نمبر

۴۔ڈاکٹر وہاب اشرفی۔تاریخ ادب اردو

۵۔ غالب نامہ۔قاضی عبدالودود نمبر

بلاک:4 اردو کے اہم محققین (ب)

اکائی:11 رشید حسن خاں

اکائی:12 حنیف نقوی

اکائی:13 گیان چند جین

بلاک 4 کا تعارف

اکائی 11 ''رشید حسن خاں'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں رشید حسن خاں کے حالات زندگی کا بیان کیا گیا ہے۔ساتھ ہی ان کی اہم تصنیفات وتالیفات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔اسی اکائی میں رشید حسن خاں کے تحقیقی کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے اوصاف وامتیازات کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اکائی 12 ''حنیف نقوی'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں حنیف نقوی کے حالات زندگی کا بیان کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ان کی اہم تصنیفات وتالیفات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔اسی اکائی میں حنیف نقوی کے تحقیقی کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے اوصاف وامتیازات کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اکائی 13 ''گیان چند جین'' پر مبنی ہے۔جس میں گیان چند جین کے حالات زندگی کا بیان کیا گیا ہے۔ساتھ ہی ان کی اہم تصنیفات وتالیفات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔اسی اکائی میں گیان چند جین کے تحقیقی کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے اوصاف وامتیازات کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اکائی 11 : رشید حسن خان

ساخت:

11.1 اغراض ومقاصد

11.2 تمہید

11.3 رشید حسن خان: حیات اور ادبی کارنامے

11.3.1 رشید حسن خان سوانحی کوائف اور حالات زندگی

11.3.2 رشید حسن خان کی تصنیفات وتالیفات

11.3.3 رشید حسن خان کے تحقیقی کارنامے۔اوصاف وامتیازات

11.4 آپ نے کیا سیکھا

11.5 اپنا امتحان خود لیجئے

11.6 سوالات کے جوابات

11.7 فرہنگ

11.8 کتب برائے مطالعہ

11.1 اغراض ومقاصد:

اس اکائی میں آپ/کو

- رشید حسن خان کے سوانحی کوائف اور حالات زندگی سے واقف ہوں گے۔
- رشید حسن خان کی تصنیفات کی تفصیلی معلومات حاصل ہوگی۔
- رشید حسن خان کے تحقیقی کارناموں اور ان کی ادبی خدمات کے ساتھ ان کے اوصاف اور امتیازات کے بارے میں جان سکیں گے۔

11.2 تمہید:

رشید حسن خان (1925-2006) اردو کے اعلیٰ درجہ کے محقق اور ماہر املا رہے ہیں وہ ہمارے عہد کے یگانۂ روزگار محقق بے بدل تدوین کار اور عبقری عالم تھے۔ ان کی شخصیت میں اصول تحقیق کے طریقۂ کار کی ایسی ہنرمندی تھی کہ تحقیق، تدوین، املا، مسائل زبان جیسے متنوع موضوعات پر ان کا قلم رواں دواں رہا اور اپنی بے پناہ تحقیقی بصیرت اور علمی لیاقت سے ایسے ایسے کام کئے جو آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ بن گئے۔

رشید حسن خان نے اپنے پیش روؤں میں حافظ محمود شیرانی، مولوی محمد شفیع، قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی اور عبدالستار

صدیقی جیسے اکابرین تحقیق سے نہ صرف کمالات علمی اور حاصلات تحقیق سے استفادہ کیا بلکہ ایسے مہم آفریں اور صبر آزما جادۂ تحقیق پر اپنے سفر کو جاری رکھا جس پر چلنا بہت مشکل تھا۔ رشید حسن خان کی ذات میں اپنے اکابرین تحقیق کے انفرادی خصائص جمع تھے۔ انھوں نے نصف صدی سے زیادہ علم وادب کے مختلف شعبوں میں جس انہماک اور دیدہ ریزی سے کام کیا، اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

رشید حسن خان نے تدوین وتحقیق کے جو اصول مرتب کئے ان پر تاعمر قائم رہے۔ اصل مآخذ سے استفادہ کرنا، ان کی حصولیابی کے لئے تگ ودو کرنا اور ہر ممکن طریقے سے اپنے کام میں پائیداری لانے کی غرض سے شب وروز محنت کرنا، ان کا اولین فرض تھا۔ انھوں نے کبھی تحقیق میں تساہلی کو جگہ نہیں دی۔ مواد کی فراہمی کے سلسلے میں خط وکتابت اور دوسرے ذرائع ابلاغ کا استعمال کرنا ان کا منصب تھا۔ ان کی تحقیقی وتدوینی کاوشیں ان کے ادبی کارناموں میں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ وہ ایک ایک کتاب کی ترتیب وتدوین پر برسوں محنت کرتے تھے۔ بعض کتابوں کی ترتیب وتدوین یا تصنیف میں انھیں بیس بائیس سال تک لگ گئے۔ انھیں کبھی بھی کسی کام کی جلدی نہ تھی لیکن وہ غافل بھی نہیں رہتے تھے۔ بیک وقت کئی کاموں کو اپنے ساتھ ساتھ لئے چلتے اور فرداً فرداً سب پر توجہ دیتے رہتے۔ مواد کی تلاش وتحقیق اور استناد کی فراہمی میں وہ ہر ممکن کوشش کرتے۔ ایک ایک مخطوطے کی تلاش اور بازیافت کے لئے وہ پریشان حال رہتے اور ہمہ تن مصروفِ کار، تن آسانی ان کا شیوہ نہیں تھا اور تحقیق کے لئے اسے زہر سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا:

> ''تحقیق بہت صبر آزما کام ہے۔ عجلت اور خفیف الحرکاتی اس کو راس نہیں آتی، بوالہوسی سے اسے بیر ہے۔ علمی اور تحقیقی کارنامے اس طرح عالم وجود میں نہیں آتے کہ کاتا اور لے دوڑی۔ فارسی کے لغت ''بہار عجم'' کا نام سبھی نے سنا ہوگا اس کے مؤلف ٹیک چند بہار نے عمر عزیز کے بیس سال صرف کئے تھے جمع وترتیب پر۔ حقائق کی بازیافت اور صداقت کی تلاش بجائے خود مقصد ہے۔ جب بھی دوسرے مقاصد کے حصول کے لئے تحقیق کو استعمال کیا جائے گا، آنکھیں ایمانداری کے نور سے محروم ہو جائیں گی۔''

ایک محقق کے طور پر ان کا نظریۂ تحقیق بہت صاف اور واضح نظر آتا ہے۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ وہ دورِ جدید میں اردو کے نظری اور عملی محقق کے باکمال محقق تھے، تو شاید غلط نہ ہوگا۔ وہ تحقیقی ماخذوں کا مطالعہ وقت نظر سے کرتے اور مآخذات کی صحت اور اس کی کلیت پر پوری طرح توجہ دیتے۔ وہ نیم معتبر یا غیر معتبر حوالوں کو قبول کرنے سے قطعاً گریز کرتے۔ صحت متن کا پورا پورا خیال رکھنا ان کا منشائے تحقیق رہا۔

رشید حسن خان حقائق کی چھان بین کرنے اور ان کو بیان کرنے کے بعد دوٹوک انداز میں نتائج نکالنے پر یقین رکھتے تھے۔ انھوں نے تحقیق کے کئی گوشوں پر کام کیا لیکن سب سے زیادہ اہم کام اردو ادب کی بنیادی کتب کی تدوین کا ہے۔ انھوں نے اردو کی کلاسیکی کتب باغ وبہار، فسانۂ عجائب، گلزار نسیم، سحر البیان، کلیات جعفر زٹلی کے معیاری ایڈیشن مرتب کئے اور تدوین کتب کو وہ ادبی وقار عطا کیا جو اس سے پہلے کسی کو حاصل نہ تھا۔

رشید حسن دستاویزی تحقیق کی روایت سے تعلق رکھنے والے محقق تھے۔اس لئے وہ تحقیق میں دستاویزات کے بنیادی حقائق کی صحت اور حوالوں کا خاص خیال رکھتے۔ان کا نظریہ تھا کہ تحقیق کا مقصد حقائق کی بازیافت ہے۔ایسے موضوعات جن میں تنقیدی تعبیرات موجود ہوں تحقیق کے دائرہ کار سے خارج ہیں۔تعبیرات کو واقعات کے مترادف قرار دینے کے وہ قائل نہ تھے یا تعبیرات پر حقائق کا اطلاق کرنا، اسے بھی غلط مانتے تھے۔رشید حسن خان نے اردو تحقیق جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

11.3 رشید حسن خان: حیات اور ادبی کارنامے

11.3.1 رشید حسن خان: سوانحی کوائف اور حالات زندگی

رشید حسن خان اردو زبان وادب کے صف اول کے محقق، مدون، ماہر زبان، لعت شناس اور نقاد تھے۔اردو ادب کو ثمر آور کرنے میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا۔ بالخصوص تحقیق کے لئے ان کی خدمات کثیر الجہات ہیں۔

رشید حسن خان کی تاریخ پیدائش کے متعلق اختلافات ہیں۔کہیں تاریخ ولادت 10 جنوری 1930 تو کہیں 25 دسمبر 1925 ملتی ہے لیکن خود رشید حسن خان نے اپنی تاریخ پیدائش میں لکھا ہے:

> ’’تعلیمی کاغذات میں تاریخ ولادت 30 جنوری 1930 لکھی ہوئی ہے۔یہ تاریخ کس نے لکھائی تھی، مجھے معلوم نہیں۔صحیح سال ولادت 1925 ہے، دسمبر کا مہینہ، تاریخ کا علم نہیں۔(کچھ اپنے بارے میں)اس سے ظاہر ہوا کہ ان کی تاریخ پیدائش دسمبر 1925 ہے۔‘‘

رشید حسن خان کا تعلق پٹھانوں کے یوسف زئی قبیلے سے تھا۔ان کے دادا کا نام علی احسن خان اور والد کا نام امیر حسن خان تھا۔ان کے دادا فوج میں تھے اور والد پولیس میں ملازمت کرتے تھے۔ان کے خاندان میں اپنے ملک سے محبت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔جذبۂ حب الوطنی کی وجہ سے ان کے والد انگریزوں کی نوکری سے مستعفی ہو گئے لیکن انھیں پنشن ملتی رہی۔ان کے والد انگریزوں کے خلاف تھے اس لئے انگریزی تعلیم کے بھی وہ مخالف ٹھہرے۔یہی سبب ہے کہ رشید حسن خان کو بھی مغربی تعلیم سے سے دور رکھنے کی غرض سے اپنے ایک استاد کے یہاں درس کے لئے بھجوا دیا۔یہاں انھیں عربی و فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ابتدائی تعلیم کے بعد 1934 میں انھیں درس نظامی کی تکمیل کے لئے شاہ جہاں پور کے مشہور مدرسے بحر العلوم میں بھیج دیا۔ تعلیم مکمل بھی نہ ہو پائی تھی کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی۔شاہ جہاں پور میں آرڈی ننس کلوونگ فیکٹری تھی جہاں فوجی وردیاں سلتی تھیں۔جنگ کی وجہ سے وردیوں کی جب مانگ بڑھی تو رشید حسن خان اپنے گھر کے معاشی حالات کی ابتری کو دیکھتے ہوئے تعلیم کو ادھوری چھوڑ کر 1935 میں اسی فیکٹری میں ملازمت کرلی۔اس فیکٹر میں مزدور یونین کا قیام عمل میں آیا جس کی سرگرمیوں میں خوب تیزی آئی۔ رشید حسن خان اس میں پیش پیش تھے اس لئے انھیں 1946 میں اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔مزدور یونین کی

سیاست کا تجربہ رشید حسن خان کے لئے خوشگوار نہ رہا۔ وہ سیدھے سچے اور کھرے پٹھان تھے۔ سیاست اور منافقت ان کے مزاج کے منافی تھا چنانچہ یونین کے منافقانہ سیاست رجحانات ان کے دل میں پائیدار منفی اثرات ثبت کر گئے۔

فیکٹری کی ملازمت کے دوران 1945 میں ان کی شادی ہوگئی۔ شادی کی وجہ سے گھریلو ذمہ داریوں میں مزید اضافہ ہو گیا کوئی نوکری نہ ہونے کے سبب معاشی تنگی کا سامنا پڑا تو 1946 میں انھوں نے آٹا پیسنے والی چکی پر منشی کے فرائض انجام دینے کی ملازمت اختیار کی۔ پھر 1946 سے 1947 تک ایک زمیندار کے کارندے کے طور پر نوکری کی جہاں انھیں دیہی زندگی اور زمیندارانہ ماحول کے مشاہدات و تجربات ہوئے۔ 1947 سے 1949 تک راشن کی ایک دکان میں منشی گری کا بھی کام کیا۔ لیکن رشید حسن خان کے ذہن و دماغ میں علم کی روشنی بھری ہوئی تھی اور اس کی تلاش و جستجو ان کا مقصد تھا اس لئے وہ تلاش معاش کے لئے بریلی گئے۔ لیکن یہاں زیادہ دن نہ رہ سکے اور پھر 1945 میں مدرسہ فیض عام، شاہ جہاں پور میں مدرسی کے فرائض انجام دینے لگے۔ یہاں بھی ان کا دل نہ لگا اور 1952 سے 1959 تک وہ اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول شاہجہاں پور میں استاد کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ رشید حسن خان نے ایک جگہ لکا ہے کہا سلامیہ ہائر سکنڈری اسکول میں ملازمت حاصل کرنے تک وہ عربی فارسی بورڈ یوپی سے مولوی کا امتحان پاس کر چکے تھے۔ اسی کے بعد انھوں نے شعبۂ مشرقی لکھنؤ یونیورسٹی سے دبیر کامل کے امتحان میں امتیازی نمبروں کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔ مولوی کا امتحان 1948 میں عربک پرسین بورڈ الہ آباد سے پاس کیا۔

رشید حسن خان کا اصل زمانہ سکون اس وقت شروع ہوا جب وہ اگست 1959 میں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر ملازمت اختیار کی۔ اس زمانے میں خواجہ احمد فاروقی شعبے سے وابستہ تھے جن کے ایما پر ہی رشید صاحب دہلی آئے تھے۔ 1964 میں انہیں اس یونیورسٹی میں کل وقتی منظوری مل گئی۔ اگست 1959 سے دسمبر 1989 تک یعنی تیس سال سے زاید عرصے تک رشید حسن خاں نے شعبۂ اردو دہلی نیورسٹی میں تحقیقی خدمات انجام دیں۔ لیکن وہ 1996 تک دہلی میں ہی رہے۔ پھر وہ اپنے وطن شاہ جہاں پور آ گئے۔ شاہ جہاں پور میں وہ اپنے علمی، ادبی، تدوینی و تحقیقی کاموں میں مصروف ہو گئے۔ عمر کے ستر برس گذارنے تک وہ کئی عوارض کے شکار ہو گئے۔ صحت کمزور رہنے لگی۔ 29 مارچ 2003 کو ان کی اہلیہ کا انتقال ہوا جس سے ان کو بہت صدمہ پہنچا۔ ان کی اولادوں میں دو بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔

وہ شاہ جہاں پور سے دہلی آتے جاتے بھی رہتے اور ملک کے مختلف شہروں میں بھی اپنی ادبی ضرورتوں کے تحت سفر کرتے رہے۔

26 فروری 2006 کو انھوں نے اس دنیا کو لبیک کہا اور سفر آخرت کو روانہ ہو گئے۔

11.3.2 رشید حسن خان کی تصنیفات و تالیفات

۱۔ انتخابِ نظیر اکبر آبادی (انتخاب و ترتیب) مکتبۂ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۰ء

۲۔ دیوانِ درد (تدوین) مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی، ۱۹۷۱ء

۳۔ انتخابِ مراثیِ انیس و دبیر (انتخاب و مقدمہ) مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۱ء

۴۔ انتخاب مضامینِ شبلی (مضامین) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۱ء

۵۔ انتخابِ ناسخؔ (انتخاب ومقدمہ) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۲ء

۶۔ انتخابِ سوداؔ (انتخاب ومقدمہ) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۲ء

۷۔ دستۂ گل (پیش لفظ) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، شنکر لال مرلی دھر میموریل سوسائٹی، نئی دہلی، ۱۹۷۲ء

۸۔ حیات سعدیؔ (تدوین) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۲ء، ۱۹۹۲ء

۹۔ دیوانِ حالیؔ (مقدمہ) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۲ء

۱۰۔ موازنۂ انیسؔ ودبیرؔ (تدوین) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۲ء

۱۱۔ گذشتہ لکھنؤ (تدوین) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۲ء، ۲۰۱۱ء

۱۲۔ اردو املا: ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۴ء

۱۳۔ اردو کیسے لکھیں: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۵ء

۱۴۔ زبان وقواعد: ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۶ء، ۱۹۸۳ء

۱۵۔ ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۸ء، لاہور (پاکستان) ۱۹۸۹ء، اشاعتِ ثانی: اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۹۰ء

۱۶۔ دیوانِ حالیؔ (تدوین ومقدمہ) اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۸۷ء، ۱۹۸۹ء، ۱۹۹۱ء، ۱۹۹۳ء، ۱۹۹۷ء، ۱۹۹۹ء، ۲۰۰۱ء، ۲۰۰۶ء، ۲۰۱۳ء، ۲۰۱۶ء۔

۱۷۔ تلاش وتعبیر (تدوین ومقدمہ) اردو اکادمی دہلی، ۱۹۸۸ء

۱۸۔ فسانۂ عجائب (تدوین ومقدمہ) انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء، انجمن ترقی اردو لاہور، ۱۹۹۵ء، اشاعتِ ثانی: ایضاً، ۱۹۹۶ء، اشاعت ثالث: ایضاً، ۲۰۰۲ء

۱۹۔ باغ وبہار (تدوین ومقدمہ) انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء، انجمن ترقی اردو، لاہور، ۱۹۹۲ء

۲۰۔ ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی (تدوین ومقدمہ)، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء، ۲۰۰۵ء، ۲۰۰۹ء

۲۱۔ دہلی کی آخری شمع (تدوین ومقدمہ) انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء، ۲۰۰۵ء، ۲۰۰۹ء

۲۲۔ تفہیم (تنقیدی اور تحقیقی مضامین) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۳ء

۲۳۔ انشا اور تلفظ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۴ء، جون ۱۹۹۵ء

۲۴۔ عبارت کیسے لکھیں: مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی، مارچ ۱۹۹۴ء

۲۵۔ انشائے غالبؔ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۴ء

۲۶۔ مثنوی گلزارِ نسیم (تدوین ومقدمہ) انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء

۲۷۔ قطعات ورباعیات (اردو) انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ۱۹۹۶ء

۲۸۔ قطعےاوررباعی (ہندی) انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ۱۹۹۶ء

۲۹۔ انتخاب کلام ناسخ (تدوین ومقدمہ) انجمن ترقی اردوکراچی (پاکستان)، ۱۹۹۶ء

۳۰۔ مثنویاتِ شوق (تدوین ومقدمہ) انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، انجمن ترقی اردوکراچی (پاکستان)، ۱۹۹۹ء

۳۱۔ تدوین، تحقیق، روایت (مجموعۂ مضامین) ایس، اے، پبلی کیشنز، دہلی، ۱۹۹۹ء

۳۲۔ مثنوی سحرالبیان (تدوین ومقدمہ) انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء

۳۳۔ املاے غالبؔ: غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء، ادارۂ یادگارِ غالب کراچی، پاکستان، ۲۰۰۰ء

۳۴۔ انتخابِ نظیرؔ اکبرآبادی (اردو) انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء

۳۵۔ انتخابِ نظیرؔ اکبرآبادی (ہندی) انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء

۳۶۔ مصطلحاتِ ٹھگی (تدوین ومقدمہ) انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء

۳۷۔ کلیاتِ جعفرؔ زٹلی (تدوین ومقدمہ) انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء

۳۸۔ کلاسکی ادب کی فرہنگ، پہلی جلد (تدوین ومقدمہ) انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء

۳۹۔ دیوانِ غالبؔ (اردو) انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء

۴۰۔ دیوانِ غالبؔ (ہندی) انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء

۴۱۔ مقدمہ شعروشاعری: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، ۲۰۱۳ء

۴۲۔ گنجینۂ معنی کا طلسم (جلد اول) غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۱۷ء

۴۳۔ گنجینۂ معنی کا طلسم (جلد دوم) غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۱۸ء

۴۴۔ گنجینۂ معنی کا طلسم (جلد سوم) غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۱۹ء

۴۵۔ ''غالبؔ اور انقلابِ ستاون'' مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کو رشید حسن خاں نے فارسی ''دستنبو'' کی اشاعتِ اول نومبر ۱۹۵۸ء کے عکس، اپنے اردو ترجے اور ''پیش لفظ'' کے ساتھ دوبارہ مرتب کیا جسے غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی نے ۲۰۰۷ء میں شائع کیا ہے۔ آج کل ''دستنبو'' کی اشاعتِ اول کا ملنا مشکل ہو گیا ہے۔ غالبؔ کی زندگی میں یہ کتاب کئی بار (مع ترمیم واضافہ) شائع ہوئی، لیکن اشاعت اول کی اہمیت اپنی جگہ قائم ہے۔

11.3.3 رشید حسن خان کے تحقیقی کارنامے: اوصاف وامتیازات

اردو زبان وادب میں تحقیق کو اعتبار کا درجہ عطا کرنے اور اس کی ادبی حیثیت واہمیت تسلیم کرانے میں جن محققین نے اہم کردار ادا کیا ہے ان میں رشید حسن خان کا نام صرف شامل ہی نہیں، نمایاں بھی ہے۔ تدوین متن کے تقاضوں کی مکمل اور تحقیق کے

آداب سے آگہی کے سلسلے میں رشید حسن خان کا نام اردو تحقیق میں سرفہرست آتا ہے۔ گیان چند نے انھیں ''خدائے تدوین'' کہا ہے۔ رشید حسن خان کی تمام تر تعلیم مشرقی انداز میں ہوئی، وہ اردو زبان کے ساتھ عربی اور فارسی زبانوں سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ رشید حسن خان نے ادبی تحقیق کے اصول وضوابط اور نظریات کو مرتب و مدون کرنے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اپنی کتاب ''ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ'' میں بڑی تفصیل سے کیا ہے ان کا ماننا ہے کہ تحقیق کا مقصد حقائق کی دریافت ہے اور ایسے موضوعات جن میں تنقیدی تعبیرات کا عمل و دخل ہو تحقیق کے دائرے میں نہیں آتے۔ وہ ایک ایسے محقق ہیں جن کا کہنا ہے کہ تنقید و تحقیق دو مختلف میدان ہیں۔ وہ تحقیق میں نکتہ رسی، حقیقت شناسی اور معنویت کو جو استخراجی نتائج پر مبنی ہوں اہمیت کا حامل تصور کرتے رہے ہیں۔

رشید حسن خان کی تحقیقی کاوشوں میں ترتیب و تدوین کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ''فسانۂ عجائب'' گلزارنسیم، باغ و بہار اور مثنویات شوق اس کے عمدہ نمونے ہیں۔ اس کے علاوہ تحقیق کے متعلق موضوعات پر بھی ان کی کئی کتابیں ہیں۔ ادبی تحقیق و تجزیہ، اردو املا، انتخاب سودا، انتخاب ناسخ، گذشتہ لکھنؤ (عبدالحلیم شرر)، مراثی انیس و دبیر، مثنوی میر حسن، تدوین، تحقیق اور روایت اور تلاش و تعبیر ان کی قابل قدر تصانیف ہیں۔ ان کے علاوہ املائے غالب، مصطلحات ٹھگی، جعفر زٹلی، کازٹل نامہ، کلاسیکی ادب کی فرہنگ (دو جلدیں)، گنجینۂ معنی کا طلسم (دو جلدیں جو 1750 صفحات پر مشتمل ہیں) ان کی کتابوں کی کل تعداد 40 سے زائد ہے۔ مضامین بھی لاتعداد ہیں۔

ان کی ترتیب و تدوین کے کام میں ''فسانۂ عجائب'' کو اولیت حاصل ہے جس پر انھوں نے 114 صفحوں کا طویل مقدمہ لکھا جب میں رجب علی بیگ سرور کی ولادت، وفات، دفن، تعلیم، وجہ تصنیف، زمانۂ تصنیف، نوازش اور اصلاح، بیان، لکھنؤ کے اختلافات، میرامن، باغ و بہار، ضمنی داستانیں، بندر کی تقریر، زبان و بیان، خطی نسخے، مطبوعہ نسخے، بنیادی نسخے، بنیادی متن، طریق کار، علامات، رموز اوقاف جیسے موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اس مقدمے میں انھوں نے فسانۂ عجائب کی خامیوں کی جانب بھی اشارے کیئے۔ حالانکہ وہ تحقیق میں تنقید کے قائل نہ تھے لیکن فسانۂ عجائب میں انھوں نے تنقیدی رویہ اپنایا کیونکہ فسانۂ عجائب کی زبان و بیان کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ تنقیدی نقطۂ نظر سے قابل غور ہیں۔ اس مقدمے کی اہمیت اس لئے بھی دوبالا ہو جاتی ہے کہ رشید حسن نے اصول تدوین کی حدود متعین کر کے اصولی مباحث کو فن تحقیق و تدوین کی تاریخ میں تقدیم زمانی کی اہمیت پر زور دیا۔

''انتخاب ناسخ'' پر جو مقدمہ لکھا ہے وہ 124 صفحات پر مشتمل ہے۔ انھوں نے مقدمے کے سات حصے کیئے جن میں (۱) ناسخ کی شاعری کا پس منظر، اس کے دو اجزاء ہیں۔ (۲) ناسخ کی شاعری کا جائزہ اس کے آٹھ اجزاء ہیں۔ اسلوب ناسخ کے اجزا، ناسخ کی شاعری، ناسخ کی تراکیب، کلام ناسخ میں سادگی کی جھلک، کلان ناسخ کے بعض اور اجزاء، کلام ناسخ کی قدر و قیمت۔ وغیرہ (۳) زبان لکھنؤ اور ناسخ کی زبان۔ (۴) ناسخ نے اصلاح نے اصلاح زبان کے جو ضابطے بنائے اور متروکات کا تعین کیا، اس پر بحث (۵) ناسخ کے شاگرد رشک کے تعلق سے بیانات، ان کی تصحیلات اور از سر تدوین کی ضرورت۔ انتخاب کلام سے متعلق

غرض کسی بھی انتخاب کو مستند اور ٹھوس بنانے کے لئے جن تحقیقی عوامل کی ضرورت ہے ان پر رشید حسن خان نے توجہ دی اور ایک مستند انتخاب ترتیب دیا۔

''مثنوی گلزار نسیم'' کا مقدمہ ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ انھوں نے مقدمہ میں جو عنوانات دیے ہیں ان کی تفصیل یوں ہے: تمہید، گلزار نسیم کی ادبی و نصابی اہمیت، قصے کا محل وقوع، قصے کے اجزا، تمثیلی انداز، قصے کی قدیم ترین تحریری روایت، کیا یہ قدیم ترین ترجمہ ہے، دیا شنکر نسیم کے حالات زندگی، تصنیفات، گلزار نسیم سے متعلق بعض قابل ذکر روایتیں، گلزار نسیم اشاعت اول، گلزار نسیم نسخۂ شیرازی، نسخۂ قاضی عبدالودود، نسخۂ اصغر گونڈوی، فارسی متن، ریحان کی مثنوی، باغ و بہار، باغ و بہار اور مذہب عشق، باغ و بہار اور گلزار نسیم، معرکہ چکبست وشرر، معرکے کا پس منظر، طریق کار، خاتمہ۔

ان عنوانات سے ظاہر ہے کہ مثنوی گلزار نسیم کی ترتیب و تدوین میں انھوں نے کتنی زیادہ محنت کی۔ ''گلزار نسیم'' کی بنیادی خصوصیات کو انھوں نے جن نکتوں میں تقسیم کیا ہے وہ یوں ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ان کا خاص انداز پانچ اجزا سے مرکب ہے۔ (۱) بیان کا ایسا اختصار کہ بہ ظاہر اس سے زیادہ ممکن نہیں معلوم ہوتا ہے۔ لفظی مناسبتوں اور رعایتوں کی مدد سے مفہوم میں پہلوداری پیدا کرنا۔ (۳) لفظی اور معنوی صنعتوں کے واسطہ سے حسن بیان میں اضافہ کرنا۔ (۴) نئے پن سے معمور تشبیہیں۔ (۵) بیان کا استحکام یعنی بندس کی چشتی۔ گلزار نسیم ان کا اہم تحقیقی و تدوینی کارنامہ ہے۔ جیسے مستند درجہ حاصل ہے۔

''مثنویات شوق'' رشید حسن خان کا ایک اہم ترین تحقیقی و تدوینی کارنامہ ہے۔ اس کا مقدمہ 168 صفحوں پر محیط ہے۔ اور اس مقدمے میں پندرہ ذیلی عنوانات متعین کئے گئے ہیں۔ اس مقدمے سے رشید حسن خان کی تحقیقی قابلیت اور ان کی بے پناہ علمی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس مقدمے میں بالخصوص انھوں نے شوق کی سوانح، مثنویوں کی تعداد، زمانۂ تصنیف، اشاعت پر پابندی، مثنویات شوق کے مصادر اور زبان و بیان پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ مثنوی کی ادبی و تہذیبی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھنوی تہذیب اور نوابین لکھنؤ کے کرداروں پر باتیں کی ہیں۔ اس مقدمے میں انھوں نے شوق کے حوالے سے بہت سی نئی باتوں کی معلومات فراہم کی ہے۔ انھوں نے شوق کے تعلق سے پرانی روایت کو شاہد و دلائل کے ذریعہ یکسر غیر مستند قرار دیتے ہوئے اس کی اہمیت و افادیت پر زور دیا۔ زبان و بیان کے ضمن میں ان کا یہ کہنا کہ فریب عشق اور بہار عشق میں بیگمات کی زبان بے حد فطری طریقے سے پائی جاتی ہے جبکہ زہر عشق میں مصنوعی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ رشید حسن خان کا طرز کلام شوق کے اصل متن کی روشنی میں سامنے آتا ہے۔ یہ ان کی تلاش و جستجو کا نتیجہ ہے۔

''مثنوی سحر البیان'' ان کا اہم تدوینی کارنامہ ہے۔ اس کتاب پر انھوں نے خوب محنت کی ہے۔ اس کا مقدمہ 142 صفحوں کا ہے جو خود ایک کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مقدمے میں انھوں نے میر حسن کے حالات زندگی، تصنیفات، سحر البیان، مثنوی کا نام، زمانۂ تصنیف، وجہ تصنیف، قطعات تاریخ، مثنوی کے متعلق بعض آراء، قصے کے مآخذ، دیباچہ لکھا گیا، متن کس کس نے مرتب کیا اور کب، سن تکمیل، طباعت، مثنوی کے خطی نسخے، ایک غیر معتبر نسخہ، تدوین میں جو نسخے پیش نظر رہے، نسخۂ فورٹ ولیم کالج،

زبان وبیان، طریق کار، ضمیمے، حدود کا تعین وغیرہ۔

ان عنوانات سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ سحرالبیان کے تعلق سے چھان بین، اس کے اصل متن اوراس کی اہمیت کے تعلق سے وہ کس طرح محتاط تھے۔ انھوں نے سن اشاعت کے علاوہ اس مثنوی کے تعلق سے دیگر امور پر کھل کر بحث کی اور دیگر متون کو سامنے رکھتے ہوئے اپنا مستند متن تیار کیا۔ رشید حسن خان نے لکھا ہے'' سحرالبیان نسخۂ فورٹ ولیم کالج میں متن کے تعینات، افسوس کی سخن شناسی اور زبان دانی کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اس نسخے کا متن دوسرے نسخوں کے متن کے مقابلے میں بہتر عمدہ اور صحیح تر ہے۔ خاص کر تلفظ، اور تذکیروتانیث کے تعینات۔''

رشید حسن خان نے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مثنوی سحرالبیان کی صحیح سن تکمیل اشاعت 1805 ہے۔

''مصطلحات ٹھگی'' ایک ایسا لغت ہے جسے بڑی دلچسپی کی نظروں سے لوگ دیکھتے ہیں۔ یہ لغت دراصل ٹھگوں کی لفظیات اور اصطلاحات پر مشتمل ہے۔ اٹھارہویں اور بیسویں صدی میں ہندوستان میں ٹھگی، لوٹ مار، قتل وغارت گری عام تھی۔ یہ ٹھگ اپنی ایک مخصوص زبان میں گفتگو کرتے تھے جس کے لئے انھوں نے اصطلاحات وضع کر رکھی تھی۔ اس زمانے میں کپسٹن ولیم سلیمن نے انگریزی میں ان ٹھگوں کی اصطلاحات اور ان کی لفظیات کو ترتیب دیا۔ اور ٹھگوں کی زبان کی ایک فرہنگ تیار کی۔ سلیمین کے ایک مددگار علی اکبر نام کے ہندوستانی نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا جو 1839 میں شائع ہوا۔ رشید حسن خان نے'' مصطلحات ٹھگی'' کو از سر ترتیب دیا۔ اس پر ایک طویل مقدمہ لکھا۔ مقدمے میں جن عنوانات کے بحث کی گئی ہے وہ یوں ہیں: جرم اور عقیدہ، نجات کا تصور، سماجی عوامل، بھینٹ کی شرط، شگون، مذہب، اختلاف اور مطابقت، لسانی تجزیے کی ضرورت اور اہمیت، مصطلحات ٹھگی کی اہمیت، مصطلحات ٹھگی، مصطلحات ٹھگاں، مصطلحات ٹھگی (حیدرآباد) فرہنگ، مصطلحات پیشہ وراں واقعات عجیبیہ وغریبیہ معروف بہ غریب نامہ۔

رشید حسن خان نے لسانی تحقیق کا ایک عمدہ نمونہ اس کتاب کی شکل میں پیش کیا ہے۔ لسانی مباحث سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ لغت کارآمد ہے کیونکہ اس میں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ سب استعمال میں آتے رہے ہیں۔

زٹل نامہ (کلیات جعفر زٹلی) ان معنوں میں اہم تدوینی کام ہے کہ یہ کتاب بعضوں کے نزدیک معیوب مانی جاتی رہی ہے۔ لیکن چونکہ رشید حسن خاں کا لسانیات اور تحقیق سے گہرا تعلق رہا ہے اس لئے انھوں نے اس کو گم ہونے سے بچانے کی خاطر اس کی بازیافت کی اور از سر نو ترتیب دیا۔ اس کتاب پر انھوں نے 96 صفحوں کا مقدمہ لکھا ہے۔ جس میں انھوں نے تمہیدی کلمات کے ساتھ، جعفر کے حالات زندگی، کلام جعفر کی اہمیت، جعفر کی زبان وبیان، مقتول تلخ نوائی، زٹل نامہ، غرض اسے کلیات کی شکل میں کس نے مرتب کی، اس کے مختلف نسخوں کی مدد سے اصل متن تک رسائی کے امکانات کے بارے میں گفتگو، غرض مختلف النوع طریقے سے انھوں نے'' زٹل نامہ'' کو سمجھا اور جعفر زٹلی کی زبان وبیان پر خاص طور سے تفصیلی گفتگو کی۔ رشید حسن خان کا کہنا ہے کہ جعفر کا کلام جس طرح شمالی ہند میں ارتقائے زبان کی پہلی کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح سماجی مشکلات کے پرزور اور پرشور بیان کے لحاظ سے جعفر اردو کا اولین شاعر ہے جس نے اپنے عہد کی ترجمانی کی۔

رشید خان کی بات درست ہے کہ کلام جعفر شمالی ہند میں ابتدائی دور کی اردو کے لسانی مطالعہ کے حوالے سے اولین ماخذ کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کے یہاں سماجی حسیت پورے طور پر ملتی ہے، دہلی میں اردو شاعری کا آغاز غزل کے بجائے نظم سے ہوا، جعفر کی شاعری اردو میں احتجاجی شاعری کا نقش اول ہے۔ رشید حسن خان نے اعتراف کیا ہے کہ جعفر زٹلی کی شاعری کا اصل جوہر فحشیات اور پھکڑ پن نہیں ہے بلکہ سماجی حسیت اس کی اصل روح ہے۔

رشید حسن خان کے تحقیقی کارناموں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ ایک بے لاگ حق گو، غیر جانبدار نقاد کی حیثیت سے وہ اپنے عہد کے نابغۂ روزگار رہے۔ انھوں نے کئی اہم مضامین لکھے جن میں اردو زبان وادب کے مسائل کے حوالے سے گفتگو کی لیکن سبھوں میں تحقیق وتنقید کو ملحوظ رکھا۔ بہ حیثیت لسانیات ان کی خدمات وقیع اور ناقابل فراموش ہیں۔ صحت زبان کے مسائل پر جس دیدہ ریزی اور مشقت سے کام کیا اس کا اعتراف ان کے مخالفین بھی کرتے ہیں۔ رشید صاحب نے اپنی تصنیفات، تالیفات اور مضامین میں جذبات، تاثرات اور ذاتی پسند اور ناپسند کو بھی گوارا نہ کیا۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے گہرے مطالعے اور علمی بصیرت کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ سب سے اہم بات یہ کہ ان کی شہرت ان کی تحریر کردہ اس معرکہ آرا تبصرہ سے ہوئی تھی جو انھوں نے علی گڑھ تاریخ ادب اردو کی جلد اول پر کیا تھا۔ اس تبصرے نے اتنا اثر ڈالا تھا کہ تمام جلدیں گودام میں پڑی رہ گئیں اور منظر عام پر نہ آئیں۔ اس طرح مالک رام کی مرتبہ کتاب دیوان غالب پر ان کے تبصرے نے بھونچال مچا دیا۔ انھوں نے تحقیقی تبصرے سے یہ ثابت کیا کہ اس میں بہت سارے اشعار کا متن ہی درست نہیں۔

رشید حسن خان ان تمام کرداری اور عملی خوبیوں کے مالک تھے جو فن تحقیق کے لئے واجب قرار دی جاسکتی ہیں۔ وہ تحقیق کے دوران حاصل ہونے والے نتائج کی پرواہ کئے نیا کام کرنے کے عادی تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کو اپنے عہد کا معتبر ناقد کہا جاتا رہا ہے۔

رشید حسن خاں نے تحقیق میں مستند ماخذوں، بنیادی حوالوں اور صحیح نتائج حاصل کرنے کے لیے غیر شخصی دلائل سے کام لیا۔ تدوین پر انہیں کامل عبور حاصل ہے۔ وہ تحقیق وتدوین کے اصول وضوابط کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ ان کی صحیح تحقیق کو تخریبی تحقیق سے منسوب کرنا مناسب نہیں۔ بزرگوں کی تحقیقی تسامحات کی گرفت بے ادبی نہیں بلکہ حقیقت تک رسائل حاصل کرنے کا ایک مستحسن عمل ہے۔ لہٰذا کسی محقق کے احتسابی عمل میں نرمی تلاش کرنا کارِ فضول ہے۔ ان کے تدوینی کاموں میں: 'فسانۂ عجائب' (1990)، 'باغ وبہار' (1992)، 'گلزار نسیم' (1995)، 'مثنویات شوق' (1998)، 'سحر البیان' (2000) اہمیت کے حامل کام ہیں۔ رشید حسن خاں نے طلبا کے لیے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی سے انتخاب وترتیب کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا، جس کے تحت 'انتخابِ نظیر اکبرآبادی' (1970)، 'انتخاب مراثیِ انیس' (1971)، 'انتخاب مضامین شبلی' (1971)، 'انتخاب سودا' (1972) بہت مقبول ہوئے۔ اردو املا وانشاءعلم ہجا، انشا وتلفظ اور تحقیق پر ان کی کتابوں کو استفادے کا مستند ترین ذریعہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کتابوں کے نام 'اردو املا' (1974)، 'انتخاب ناسخ' (1972)، دیوانِ خواجہ میر درد' (1971)، 'اردو کیسے لکھیں' (1972)، 'زبان اور قواعد' (1976)، 'ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ' (1978)، 'تعبیر وتفہیم' (1993)، 'عبارت کیسے لکھیں' (1994)،

’انشاء تلفظ‘(1994)، ’دیوانِ حالی‘(1987)، ’کلیاتِ جعفر زٹلی‘(2003)، ’’کلاسیکی ادب کی فرہنگ- جلد اول‘(2003)، ’گنجینۂ معانی کا طلسم‘ تین جلدیں(2017,18,19)، ’انشائے غالب‘(1994)، ’تدوین، تحقیق اور روایت‘(1999) ہیں۔

11.4 آپ نے کیا سیکھا

- رشید حسن خاں کی سوانح حیات اور ان کے حالات زندگی سے واقفیت ہوئی۔
- رشید حسن خاں کی تصنیفات و تالیفات کا علم ہوا۔ ان کی مرتب کردہ تحقیقی کتابوں کی ایک اہم فہرست پڑھنے کو ملی۔
- رشید حسن خاں کے تحقیقی کارناموں اور ان کی مرتب کردہ قدیم مخطوطات، کتابوں، اور مخفی کتابوں کی تفصیلی جانکاری حاصل ہوئی۔ ان کے تحقیقی اوصاف و امتیازات سے پوری طرح واقفیت ہوئی۔

11.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ رشید حسن خاں کی تاریخ پیدائش کے ساتھ ان کی تاریخ و جائے وفات بھی بتائیے۔

۲۔ رشید حسن خاں کی چھ اہم تحقیقی کتابوں کے نام مع ناشر اور سن تصنیف بتائیے۔

۳۔ رشید حسن خاں کی چار اہم کتابوں کے بارے میں اختصار سے ذکر کیجیے۔

11.6 سوالات کے جوابات

۱۔ ان کی تاریخ پیدائش دسمبر 1925 ہے۔ 26 فروری 2006 کو ان کا انتقال شاہجہان پور میں ہوا۔

۲۔

۱۔ فسانۂ عجائب (تدوین و مقدمہ) انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء، انجمن ترقی اردو لاہور، ۱۹۹۵ء،
اشاعتِ ثانی: ایضاً، ۱۹۹۶ء، اشاعت ثالث: ایضاً، ۲۰۰۲ء

۲۔ باغ و بہار (تدوین و مقدمہ) انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء، انجمن ترقی اردو، لاہور، ۱۹۹۲ء

۳۔ مثنوی گلزارِ نسیم (تدوین و مقدمہ) انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء

۴۔ مثنویاتِ شوق (تدوین و مقدمہ) انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، انجمن ترقی اردو کراچی (پاکستان)، ۱۹۹۹ء

۵۔ مثنوی سحر البیان (تدوین و مقدمہ) انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء

۶۔ کلیاتِ جعفر زٹلی (تدوین و مقدمہ) انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء

۳۔

ان کی ترتیب و تدوین کے کام میں ’’فسانۂ عجائب‘‘ کو اولیت حاصل ہے جس پر انھوں نے 114 صفحوں کا طویل مقدمہ

لکھا جب میں رجب علی بیگ سرور کی ولادت، وفات، دفن، تعلیم، وجہ تصنیف، زمانۂ تصنیف، نوازش اور اصلاح، بیان، لکھنؤ کے اختلافات، میر امن، باغ و بہار، ضمنی داستانیں، بندر کی تقریر، زبان و بیان، خطی نسخے، مطبوعہ نسخے، بنیادی نسخے، بنیادی متن، طریق کار، علامات، رموز اوقاف جیسے موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اس مقدمے میں انھوں نے فسانۂ عجائب کی خامیوں کی جانب بھی اشارے کئے۔ حالانکہ وہ تحقیق میں تنقید کے قائل نہ تھے لیکن فسانۂ عجائب میں انھوں نے تنقیدی رویہ اپنایا کیونکہ فسانۂ عجائب کی زبان و بیان کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ تنقیدی نقطۂ نظر سے قابل غور ہیں۔ اس مقدمے کی اہمیت اس لئے بھی دوبالا ہو جاتی ہے کہ رشید حسن نے اصول تدوین کی حدود متعین کر کے اصولی مباحث کو فن تحقیق و تدوین کی تاریخ میں تقدیم زمانی کی اہمیت پر زور دیا۔

''مثنوی گلزار نسیم'' کا مقدمہ ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ انھوں نے مقدمہ میں جو عنوانات دیے ہیں ان کی تفصیل یوں ہے: تمہید، گلزار نسیم کی ادبی و نصابی اہمیت، قصے کا محل وقوع، قصے کے اجزا، تمثیلی انداز، قصے کی قدیم ترین تحریری روایت، کیا یہ قدیم ترین ترجمہ ہے، دیا شنکر نسیم کے حالات زندگی، تصنیفات، گلزار نسیم سے متعلق بعض قابل ذکر روایتیں، گلزار نسیم اشاعت اول، گلزار نسیم نسخۂ شیرازی، نسخۂ قاضی عبدالودود، نسخۂ اصغر گونڈوی، فارسی متن، ریحان کی مثنوی، باغ و بہار، باغ و بہار اور مذہب عشق، باغ و بہار اور گلزار نسیم، معرکہ چکبست و شرر، معرکے کا پس منظر، طریق کار، خاتمہ۔

ان عنوانات سے ظاہر ہے کہ مثنوی گلزار نسیم کی ترتیب و تدوین میں انھوں نے کتنی زیادہ محنت کی۔ ''گلزار نسیم'' کی بنیادی خصوصیات کو انھوں نے جن نکتوں میں تقسیم کیا ہے وہ یوں ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ان کا خاص انداز پانچ اجزا سے مرکب ہے۔ (۱) بیان کا ایسا اختصار کہ بہ ظاہر اس سے زیادہ ممکن نہیں معلوم ہوتا ہے۔ لفظی مناسبتوں اور رعایتوں کی مدد سے مفہوم میں پہلو داری پیدا کرنا۔ (۳) لفظی اور معنوی صنعتوں کے واسطہ سے حسن بیان میں اضافہ کرنا۔ (۴) نئے پن سے معمور تشبیہیں۔ (۵) بیان کا استحکام یعنی بندس کی چشتی۔ گلزار نسیم ان کا اہم تحقیقی و تدوینی کارنامہ ہے۔ جیسے مستند درجہ حاصل ہے۔

''مثنویات شوق''، رشید حسن خان کا ایک اہم ترین تحقیقی و تدوینی کارنامہ ہے۔ اس کا مقدمہ 168 صفحوں پر محیط ہے۔ اور اس مقدمے میں پندرہ ذیلی عنوانات متعین کئے گئے ہیں۔ اس مقدمے سے رشید حسن خان کی تحقیقی قابلیت اور ان کی بے پناہ علمی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس مقدمے میں بالخصوص انھوں نے شوق کی سوانح، مثنویوں کی تعداد، زمانۂ تصنیف، اشاعت پر پابندی، مثنویات شوق کے مصادر اور زبان و بیان پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ مثنوی کی ادبی و تہذیبی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھنوی تہذیب اور نوابین لکھنؤ کے کرداروں پر باتیں کی ہیں۔ اس مقدمے میں انھوں نے شوق کے حوالے سے بہت سی نئی باتوں کی معلومات فراہم کی ہے۔ انھوں نے شوق کے تعلق سے پرانی روایت کو شاہد و دلائل کے ذریعہ یکسر غیر مستند قرار دیتے ہوئے اس کی اہمیت و افادیت پر زور دیا۔ زبان و بیان کے ضمن میں ان کا یہ کہنا کہ فریب عشق اور بہار عشق میں بیگمات کی زبان بے حد فطری طریقے سے پائی جاتی ہے جبکہ زہر عشق میں مصنوعی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ رشید حسن خان کا طرز کلام شوق کے اصل متن کی روشنی میں سامنے آتا ہے۔ یہ ان کی تلاش و جستجو کا نتیجہ ہے۔

زٹل نامہ (کلیات جعفر زٹلی) ان معنوں میں اہم تدوینی کام ہے کہ یہ کتاب بعضوں کے نزدیک معیوب مانی جاتی رہی ہے۔لیکن چونکہ رشید حسن خاں کا لسانیات اور تحقیق سے گہرا تعلق رہا ہے اس لئے انھوں نے اس کو گم ہونے سے بچانے کی خاطر اس کی بازیافت کی اور از سر نو ترتیب دیا۔اس کتاب پر انھوں نے 96 صفحوں کا مقدمہ لکھا ہے۔جس میں انھوں نے تمہیدی کلمات کے ساتھ،جعفر کے حالات زندگی،کلام جعفر کی اہمیت،جعفر کی زبان و بیان،مقتول تلخ نوائی،زٹل نامہ،غرض اسے کلیات کی شکل میں کس نے مرتب کی،اس کے مختلف نسخوں کی مدد سے اصل متن تک رسائی کے امکانات کے بارے میں گفتگو،غرض مختلف النوع طریقے سے انھوں نے ''زٹل نامہ'' کو سمجھا اور جعفر زٹلی کی زبان و بیان پر خاص طور سے تفصیلی گفتگو کی۔رشید حسن خان کا کہنا ہے کہ جعفر کا کلام جس طرح شمالی ہند میں ارتقائے زبان کی پہلی کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔اسی طرح سماجی مشکلات کے پر زور اور پر شور بیان کے لحاظ سے جعفر اردو کا اولین شاعر ہے جس نے اپنے عہد کی ترجمانی کی۔

رشید خان کی بات درست ہے کہ کلام جعفر شمالی ہند میں ابتدائی دور کی اردو کے لسانی مطالعہ کے حوالے سے اولین مآخذ کا درجہ رکھتا ہے۔

11.7 فرہنگ

لفظ	معنی
طریقۂ کار	کام کرنے کا طریقہ
کمالات	خوبیاں
حاصلات	حاصل کی جمع
صبر آزما	صبر سے گزرنے والا
جادہ	راستہ
نظیر	مثال
بازیافت	کسی چیز کو تلاش کرنا
شیوہ	عادت
حقائق	حق کی جمع
واضح	صاف ستھرا
کلیت	پورے طور پر
دائرۂ کار	کام کرنے کا دائرہ
خارج	باہر
متدارف	برابر

لغت شناس	علم لغت جاننے والا
مدون	تدوین کا علم جاننے والا
لسان	زبان
مستعفی	سبک دوش ہونا
ابتری	برا
منافقت	برائی کرنا
منشی گیری	منشی کا کام کرنے والا
عوارض	کئی مرض
دریافت	معلوم کرنا
معنویت	معنی تک پہنچنا
کاوش	محنت
کارنامہ	اہم کام
سیر حاصل	خوب اچھی طرح

11.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ ٹی۔آر۔رینا: مقالات رشید حسن خاں
۲۔ ٹی۔آر۔رینا: رشید حسن خاں کے خطوط
۳۔ ابراہیم افسر: رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں
۴۔ گوشۂ رشید حسن خاں کتاب نما
۵۔ محمد وسیم رضا رشید حسن خاں ایک عبقری شخصیت
۶۔ عبدالحمید رشید حسن خاں اور ادبی تحقیق

اکائی 12 : حنیف نقوی

ساخت:

12.1 اغراض و مقاصد

12.2 تمہید

12.3 حنیف نقوی: حیات اور ادبی کارنامے

12.3.1 حنیف نقوی: سوانحی کوائف اور حالات زندگی

12.3.2 حنیف نقوی کی تصنیفات و تالیفات

12.3.3 حنیف نقوی کے تحقیقی کارنامے۔ اوصاف و امتیازات

12.4 آپ نے کیا سیکھا

12.5 اپنا امتحان خود لیجئے

12.6 سوالات کے جوابات

12.7 فرہنگ

12.8 کتب برائے مطالعہ

12.1 اغراض و مقاصد:

اس اکائی میں آپ/کو

- حنیف نقوی کے سوانحی کوائف اور حالات زندگی سے واقف ہوں گے۔
- حنیف نقوی کی تصنیفات کی تفصیلی معلومات حاصل ہوگی۔
- حنیف نقوی کے تحقیقی کارناموں اور ان کی ادبی خدمات کے ساتھ ان کے اوصاف اور امتیازات کے بارے میں جان سکیں گے۔

12.2 تمہید:

حنیف نقوی نے اپنے لئے تحقیق کا میدان منتخب کیا تھا۔ اردو زبان و ادب میں نثر نگاری مشکل فن ہے لیکن حنیف نقوی نے اسے بھاری پتھر سمجھ کر صرف چوما ہی نہیں بلکہ اٹھایا۔ انکا تعلق چونکہ اعلیٰ خاندان سے تھا، ان کے حقیقی نانا منشی شاکر حسین نکہت سہسوانی خود بھی بڑے اچھے عالم تھے اور فارسی زبان سے خوب اچھی طرح واقف۔ ان کے ایک دور کے رشتے چچا اعجاز احمد معجز بھی صاف ستھرا ادبی ذوق رکھتے تھے۔ ان دو اصحاب کی بدولت حنیف نقوی کے اندر ادب ذوق و شوق بیدار رہا۔ زبان و ادب سے گہری دلچسپی پیدا ہوئی۔

حنیف نقوی کو بطور محقق اردو کی ادبی دنیا میں ایک اہم نام تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کا تحقیقی شعور نہایت پختہ اور پائیدار رہا۔ وہ ہر بات کو چھان پھٹک کر اور خوب ٹھونک بجا کر لکھتے۔ کسی بھی بات کو تاریخی اور واقعاتی کسوٹی پر پرکھ کر تحریر کرتے۔ ان کا انداز تحقیق سب سے جداگانہ تھا۔ وہ جس موضوع کو لیتے اس کے ہر پہلو پر اور اس کے تعلق سے جملہ جزئیات پر مکمل یکسوئی کے ساتھ غور وفکر کے بعد نتیجہ اخذ کرتے۔

حنیف نقوی کا تصنیفی سفر ان کے دوران تعلیم ہی شروع ہو گیا تھا جب وہ میٹرک میں تھے۔ ان کا ایک مضمون فروری 1956 میں شاعر میں تو ایک مضمون بہ عنوان ''حالی اور اردو ادب'' بھوپال کے کسی رسالے میں مارچ 1916 میں شائع ہوا تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً مضامین لکھتے رہے لیکن اس میں تیزی اس وقت آئی جب وہ علی گڑھ میں بطور ریسرچ اسسٹنٹ مقرر ہوئے۔ ان دوران انھوں نے کئی اہم مضامین لکھے۔ حنیف نقوی چونکہ انہیں پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے شعرائے اردو کے تذکرے کے کا انتخاب کیا تھا اس لئے انھیں موضوع کے اعتبار سے تحقیق نوادرات سے سامنا ہوا جس کی وجہ سے ان میں مضبوط تحقیقی شعرور پیدا ہوا۔ ان کا ذہن پوری طرح سے تحقیق کی طرف مائل ہو گیا۔ انھیں کلاسیکی ادب سے حد درجہ دلچسپی تھی۔ یہی سبب ہے کہ وہ سید عبدالولی عزلت مورثی، منشی احمد سحر، مرزا کلب حسین نادر، عزیز صفی پوری جیسی شخصیات پر بھرپور مضامین لکھے۔ ان کی تحقیقی کتابوں میں انتخاب کربل کتھا کی ترتیب وتدوین کو بڑی مقبولیت ملی۔

ان کے تحقیقی کارناموں کی بدولت اردو دنیا میں انھیں معتبر مانا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سرتا پا علم بھی رہے اور شفقت ورحمت، محبت والفت کا ایک بحر بے کراں بھی۔ وہ جن محفل میں ہوتے اسے زعفران زاد بنا دیتے۔ ان کے ادبی لطائف، معیاری اشعار اور واقعات محفل کی جان ہوا کرتے تھے۔

حنیف نقوی تحقیقی معاملات میں مصلحت کے کبھی قائل نہیں رہے اور ہمیشہ وہی لکھا جسے صحیح اور واجب سمجھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے میلان طبع کی وجہ سے وہ ایک روایتی معلم اور محقق کہے جاسکتے ہیں۔ اردو فارسی کا علم ہونے کے سبب طبعی مناسبت سے فارسی شعر کا ذوق بھی ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ انھوں نے ادب اور علوم انسانی کے مطالعے سے وہ ساری روشنی اپنے سینے میں اتار لی تھی جو ایک عرصے کے ریاض کا حاصل ہوتی ہے۔ اپنی تہذیبی، علمی، معاشرتی اور مذہبی روایات کا وہ انتہائی گہرا شعور رکھتے تھے۔

حنیف نقوی کی شخصیت میں سادگی کے باوصف عالمانہ تدبیر اور فہم وفراست کا ایک شعور تھا جو ان میں ایک ایسا اعتماد پیدا کر چکا تھا کہ وہ نہ کسی کے بے جا اعتراض کی پرواکرتے اور نہ کسی کی خوشامد پر خوش ہوتے۔ وہ صداقت کے امین تھے جو فن تحقیق کا خاصہ ہے۔ اسی صداقت نے ان کے اندر بیباکی اور علمیت نے بے ریائی کا جوہر عطا کیا۔ وہ بلا جھجک کسی کتاب یا مضمون پر اپنی بے باکانہ رایوں کا اظہار کرتے کبھی نہیں چوکتے تھے۔

تحقیقی مزاج ہونے کی وجہ سے حنیف نقوی ہمیشہ ایک ایک جملہ بلکہ ایک ایک لفظ ناپ تول کر لکھتے۔ ان کی نثر حشو و زوائد سے پاک اور وضاحت وقطعیت سے متصف ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ کسی مواد کو طائرانہ نظر سے نہیں بلکہ غائرانہ نگاہ سے پرکھتے اور

جانچتے تھے۔اور املا وانشا،صوت ومعنی بلکہ رموز اوقاف تک کوضروری خیال کرتے تھے۔ان کا حافظہ قوی اور مطالعہ وسیع تھا اس لئے وہ درست پیرایۂ اظہار اختیار کرتے تھے۔ان کا کہنا ہے کہ:

''تحقیق کا اصل منصب جس سے اس کی شناخت قائم ہوتی ہے، دستیاب مواد کا عالمانہ تجزیہ اوراس کے صحیح نتائج کی تخریج ہے۔ یہ معمول صرف نو دریافت مواد کے ساتھ مشروط نہیں،اگر تحقیق کار کسی بھی درپیش مسئلے کواس کے صحیح تناظر میں دیکھنے کی اہلیت رکھتا ہے اور اس کی تعبیر کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے پر قادر ہے تو بعض اوقات پیش پا افتادہ مواد سے بھی نہایت اہم بلکہ حیران کن نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں۔(میر و مصحفی،ص7)

حنیف نقوی اپنی تمام تصانیف/ تالیفات اور مضامین میں تحقیق کا اصول وآداب کوملحوظ رکھتے ہوئے پیش رومحققوں کے فرمودات سے انحراف بھی کیااور اختلاف بھی لیکن تہذیب وشائستگی کے دائرے میں۔ان کا ادبی قد بحیثیت محقق بہت بلند ہے۔

12.3 حنیف نقوی: حیات اور کارنامے

12.3.1 حنیف نقوی: سوانحی کوائف اور حالات زندگی

ان کا نام سید حنیف احمد نقوی ہے لیکن ادبی دنیا میں حنیف نقوی کے نام سے معروف ہیں۔ والد کا نام حکیم سید عقیل احمد ہے۔حنیف نقوی کے بزرگ بہ عہد سلطان سکندرلودی ۸۹۷ھ/۹۲۔۱۴۹۱ میں امروہہ سے ترک سکونت کر کے سہسوان تشریف لائے۔خواجہ محمد اسمٰعیل کے بیٹے قاضی عبدالشکور شہید تھے جو اس خاندان کے مورث اعلیٰ کہلائے جو اپنے والد کی وفات کے بعد سہسوان کے قاضی مقرر ہوئے۔اسی خاندانی سلسلے سے ان کے والد سید عقیل احمد تھے جو طبیہ کالج دہلی سے سند یافتہ طبیب تھے۔ حنیف نقوی کے حقیقی نانا شاکر حسین صدیقی عربی فارسی کے بلند پایہ ادیب وشاعر تھے۔ان کا خاندان اعلیٰ درجے کا تھا۔

حنیف نقوی کی پیدائش ضلع بدایوں کے موضع سہسوان میں 17 اکتوبر 1936 کو ہوئی تھی۔دوسرے اہم محققین کی طرح ان کی ابتدائی تعلیم بھی مدرسے میں تو ہوئی لیکن مغربی تعلیم سے وہ پوری طرح فیض یاب ہوتے رہے۔عربی، فارسی اردو کی ابتدائی تعلیم کے بعد انھوں نے 1950 میں پنالال ہائر سکنڈری اسکول سے 1955 میں میٹرک پاس کیا۔گورنمنٹ حمیدیہ کالج بھوپال سے انٹر کا امتحان فارسی زبان وادب میں امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔انھوں نے 1959 میں وکرم یونیورسٹی اجین سے بی اے، فرسٹ ڈویژن،فرسٹ پوزیشن سے پاس کیا۔1961 میں بنارس ہندو یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کی ڈگری لی۔اس میں انھیں فرسٹ ڈویژن فرسٹ پوزیشن ملی۔1973 میں بنارس ہندو یونیورسٹی سے فارسی میں بھی ایم اے کیا اور اس میں حسب سابق اولیت حاصل رہی۔ 1968 میں وکرم ویونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ (پی ایچ ڈی) کی ڈگری ملی۔ان کا موضوع تحقیق ''اردو شعراء کے تذکروں کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ'' تھا۔اس مقالے کے نگراں پروفیسر ابومحمد سحر تھے۔انھوں نے سہسوان اور دوسری جگھوں پر جو تعلیم حاصل کی اس دوران انھیں قابل اساتذہ ملے جن میں نانا منشی شاکر حسین نکہت سہسوانی، چچا حکیم اعجاز احمد معجز سہسوانی، پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر ابومحمد سحر اور پروفیسر محبوب الرحمٰن بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

ملازمت کے سلسلے میں انھیں بھوپال کے سیفیہ انٹر کالج میں بحیثیت اسسٹنٹ ٹیچر اپنی خدمات اپنی انجام دینی پڑیں جو نومبر 1961 سے مئی 1962 صرف چند ماہ کے لئے رہی۔ 14 جولائی 1962 سے 13 دسمبر 1963 تک کے قلیل عرصے کے لئے فضل الرحمٰن اسلامیہ انٹر کالج بریلی میں بحیثیت لکچرر تقرری ہوئی۔ 16 دسمبر 1963 کو حمیدیہ کالج بھوپال میں JRF کے تحت رہے جو 15 دسمبر 1966 کو اختتام پذیر ہوا۔ بعد ازاں یکم فروری 1968 کو شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بحیثیت ریسرچ اسسٹنٹ کے فائز رہے جس کی مدت خدمت 31 جولائی 1969 کو پوری ہوئی۔ اتنے عرصے تک ادھر ادھر کی خاک چھاننے کے بعد سرزمین بنارس نے ان کا خیر مقدم کیا اور 4 فروری 1970 کو شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی میں بحیثیت لکچرر تقرری ہوئی۔ یہیں 1982 میں ریڈر بنے اور پھر 3 فروری 1990 کو پروفیسر۔ 31 دسمبر 2000 کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

ان کی شادی 26 جون 1966 کو سید محمد طاہر نقوی کی صاحبزادی کشور جہاں سے ہوئی۔ جن سے پانچ بیٹیاں اور ایک بیٹا عالم وجود میں آئے۔

حنیف نقوی نے چونکہ اپنی تحقیق کے لئے تذکرے کے موضوع کا انتخاب کیا تھا، اسی مناسبت سے تحقیق دم آخر تک انک کا موضوع بنی رہی۔ ان کے علمی و ادبی کاموں اور ان کی تحقیقی سرگرمیوں کی وجہ سے وہ ملک کی مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں میں لکچر کے لئے بلائے جاتے تھیے۔ ان کی زبان شستہ اور انداز بیان ہمیشہ سادہ اور سلیس رہا۔ ان کی نگرانی میں درجنوں طلبا نے ریسرچ کیا جن کے موضوعات تحقیقی اور علمی ہوا کرتے تھے۔

اردو فارسی اور انگریزی زبانوں سے واقفیت کی وجہ سے انھیں نثر نگاری کا زیادہ شوق پیدا ہوا تھا اور تنقید و تحقیق میں دلچسپی بڑھتی گئی۔ حالانکہ وہ شاعر بھی تھے اور اردو اور فارسی میں اشعار بھی کہتے تھے۔ زمانہ بھوپال میں انھیں کوثر چاندپوری اور شفا گوالیاری جیسی شخصیتوں سے رابطہ رہا جن کی بدولت وہ نثر لکھنے کی طرف زیادہ مائل ہوئے۔ یہ دونوں حضرات ان کے مضامین کی نوک پلک درست فرما دیتے اور تحریر قابل اشاعت بن جاتی۔ ان کا اولین مضمون رسالہ شاعر کے فروری 1956 کے شمارے میں بعنوان خطوط غالب کی نفسیات شائع ہوا۔ ان کی بنیادی دلچسپی تحقیق و تدوین سے تھی جسے وہ خشک اور بے کیف تو سمجھتے تھے لیکن اسی سے عشق بھی تھا۔ شعر گوئی ترک کر کے نثر نگاری کی طرف متوجہ ہوئے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ نثر نگاری شعر گوئی کے مقابلے میں بدرجہا مشکل کام ہے۔ کیونکہ اس کے ساتھ ذہنی یکسوئی اور ارتکاز فکر کے علاوہ آنکھیں گڑا کر کام کرنے کی شرط لاحق ہے۔

انھوں نے درس و تدریس میں ایک عمر گذاری۔ اور ہر محاذ پر اپنا اعتبار مضبوط اور مستحکم رکھا۔ وہ نمائش اور تصنع پسندی سے قطعی پاک تھے۔ ان کا انتقال بنارس میں ۲۲ر دسمبر ۲۰۱۲ء کو ہوا جہاں وہ سپرد خاک ہیں۔

12.3.2 حنیف نقوی کی تصنیفات و تالیفات

۱۔ شعرائے اردو کے تذکرے (نکات الشعرا سے گلشن بے خار تک) اشاعت اول، نسیم بک ڈپو لکھنؤ، ۱۹۷۶ء، اشاعت دوم، اتر پردیش، اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۹۸ء

۲۔ انتخاب کربل کتھا مع مقدمہ و فرہنگ، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۳ء

۳۔ تلاش وتعارف (مجموعۂ مقالات) نصرت پبلشرز لکھنؤ، ۱۹۸۷ء

۴۔ انتخاب کلام رجب علی بیگ سرورؔ، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۸ء

۵۔ غالب احوال وآثار، نصرت پبلشرز لکھنؤ طبع اول، ۱۹۹۰ء، غالب احوال وآثار، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، طبع دوم، ۲۰۰۷ء

۶۔ رجب علی بیگ سرورؔ، چند تحقیقی مباحث، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ۱۹۹۱ء

۷۔ مآثر غالب (غالب کی کمیاب نثر و نظم کا مجموعہ) مع اضافہ ترجمۂ خطوط فارسی از پرتو روہیلہ۔ مرتبہ: قاضی عبدالودود، تصحیح و ترتیب جدید: ڈاکٹر حنیف نقوی، ادارۂ یادگار غالب کراچی، ۲۰۰۰ء

۸۔ مرزا غالب کے پنج آہنگ کا قدیم ترین خطی نسخہ (عکسی ایڈیشن) خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۷ء

۹۔ دیوانِ ناسخ (عکسی ایڈیشن) نسخہ بنارس خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ۱۹۹۷ء

۱۰۔ رائے بنی نرائن دہلوی (سوانح اور ادبی خدمات) انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، ۱۹۹۷ء

۱۱۔ میر و مصحفی (مجموعۂ مقالات) بھارت آفسیٹ دہلی، ۲۰۰۳ء

۱۲۔ غالب کی چند فارسی تصانیف غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۵ء

۱۳۔ غالب کی فارسی مکتوب نگاری (توسیعی خطبہ) شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، ۲۰۰۸ء

۱۴۔ تحقیق و تدوین۔ مسائل اور مباحث (مجموعۂ مقالات) پروفیسر حنیف نقوی۔ وارانسی، ۲۰۱۰ء

۱۵۔ تذکرۂ شعرائے سہسوان، مؤلفہ: ابوالکمال حکیم سید اعجاز احمد معجز، مرتبہ: حنیف نقوی، ۲۰۱۰ء

۱۶۔ حیات العلماء تالیف مولوی سید عبدالباقی، ترتیب و تدوین جدید: پروفیسر حنیف نقوی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۰ء

۱۷۔ غالب اور جہانِ غالب، پروفیسر حنیف نقوی، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء

آپ کے متفرق مضامین ومقالات کی تعداد ۱۴۰ کے قریب ہے۔ جو مختلف رسائل وجرائد میں بکھرے ہوئے ہیں۔ مثلاً آج کل نئی دہلی، ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، سہ ماہی اردو ادب نئی دہلی، جامعہ نئی دہلی، سہ ماہی، نوائے ادب، بمبئی، سہ ماہی فکر و تحقیق نئی دہلی، سہ ماہی فکر و نظر علی گڑھ، ماہ نامہ نگار پاکستان کراچی، نوائے سیفیہ بھوپال ہفت روزہ، ہماری زبان، نئی دہلی، وغیرہ۔

12.3.3 حنیف نقوی کے تحقیقی کارنامے، اوصاف وامتیازات

حنیف نقوی اردو زبان وادب کی تحقیق کے میدان کا ایک انتہائی اہم شخصیت کا نام ہے۔ پھر اس میں ان کے شعبہ ہائے اختصاص تین رہے ہیں۔ تذکرۂ شعراء، سوانحی تحقیق، غالب اور متعلقات غالب ان تینوں شعبوں میں ان کے اوصاف وامتیازات بلکہ فتوحات کا اعتراف مولانا امتیاز علی خان عرشی، مالک رام، شفق خواجہ اور رشید حسن خان جیسے محققین نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ قرأت مخطوطات، فن تاریخ گوئی اور علم عروض وقوافی پر بھی ان کی بہت گہری نگاہ تھی۔ ان کی اسی جامعیت نے انھیں اردو زبان و

ادب میں تحقیق کا گوہر شاہوار بنادیا۔

حنیف نقوی صاحب کا طریقۂ تحقیق وتصنیف بھی جداگانہ رہا۔ وہ جس موضوع کا انتخاب کرتے اس پر برسوں مواد جمع کرتے۔ اس سے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے ان سب سے آگاہی حاصل کرتے پھر اپنی فکر وتحقیق کی بنیاد پر ماحصل پیش کرتے۔ بحیثیت محقق ان کا امتیاز یہ ہے کہ اختلافی مباحث میں قرائن وشواہد کی چھان بین کے بعدان کی نگاہ قول صائب پر جا کرٹھہرتی تھی۔

حنیف نقوی کی متعدد کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں۔ شعرائے اردو کے تذکرے جس میں نکات الشعرا سے گلشن بے خار تک کے تذکرہ کا تحقیقی وعلمی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب 1976 میں شائع ہوئی تھی۔

''انتخاب کربل کتھا'' ان کی مرتب کردہ کتاب ہے جو 1983 میں پہلی بار شائع ہوئی۔ مضامین کا مجموعہ ''تلاش وتعارف'' 1987 میں شائع ہوا۔ انتخاب رجب علی بیگ سرور 1988 میں غالب احوال وآثار 1990 میں، رجب علی بیگ، قدیم ترین نسخہ عکسی ایڈیشن 1997 میں، دیوان ناسخ نسخہ بنارس عکسی ایڈیشن 1997 میں، رائے بنی نرائن دہلوی: سوانح اور ادبی خدمات 1977 میں، میر ومصحفی 2003 میں بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

''شعرائے اردو کے تذکرے'' میں انھوں نے تذکرے کے مختلف معنی، تذکرہ نگاری بحیثیت فن، تذکرہ کی افادیت، اس کے محرکات، اس کی اہمیت پر بھرپور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے دکنی ادب اوراس کے تاریخی پس منظر کو بھی ملحوظ خاطر رکھا اور تمام قابل ذکر دکنی شعرا کے کارناموں کا تذکرہ شامل کیا۔ انھوں نے بعض تذکروں پر بھرپور تحقیقی اور تنقیدی نظر ڈالی ہے اوران کے تسامحات اور غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ کم وبیش تمام تذکروں کے حوالے سے انھوں نے گفتگو کی ہے۔ تذکروں کی ادبی وتنقیدی اہمیت پر متوازن گفتگو، شامل مقالہ تذکروں کا تاریخی، تحقیقی، ادبی اور تجزیاتی مطالعہ وغیرہ اس کتب کی اہم مباحث ہیں۔ امتیاز علی خان عرشی نے انھیں ایک خط میں لکھا تھا کہ ''میں نے اس تحقیقی مقالہ کو اول سے آخر تک پڑھا۔ آپ نے جس لگن سے مسالا اکٹھا کیا ہے وہ قابل داد ہے اور جس دیدہ ریزی سے اسے مرتب کیا ہے وہ مستحق تحسین وآفرین ہے۔'' مشفق خواجہ نے تو اس کتاب کو اردو ادب میں ایک اہم اضافہ قرار دیا۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ حنیف نقوی پہلے شخص ہیں جنھوں نے تذکروں کو بغور پڑھا اور بہت سے مسائل پر فیصلہ کن انداز میں رائے دی ہے۔ انھوں نے ایک مستند محقق کی طرح محاکے اور فیصلے بھی کیے ہیں۔

ان کے مضامین کا ایک مجموعہ ''تلاش وتعارف'' کے نام سے شائع ہوا۔ نام سے ہی ظاہر ہے کہ اس میں تحقیقی مضامین شامل ہیں۔ تلاش وتعارف تحقیق کا بنیادی عنصر ہے اوراسی مناسبت سے انھوں نے کتاب کا نام رکھا۔ اس میں سات مضامین ہیں اور سبھوں کی نوعیت تحقیقی ہے۔

اس میں درج ذیل مقالات شامل ہیں:

۱۔ سید عبدالولی عزلتؔ سورتی

۲۔ منشی احمد حسین سحرؔ (کاکوروی)

۳۔ مرزا کلب حسین خاں نادرؔ

۴۔ مرزا حاتم علی بیگ مہؔر

۵۔ مرزا حاتم علی بیگ، تحقیق مزید

۶۔ ولایت علی خاں ولایت و عزیز صفی پوری

۷۔ ثاقب لکھنوؔی

''میر و مصحفی'' حنیف نقوی کی ایک ایسی کتاب ہے جس میں تین مضامین میر پر اور تین مصحفی پر ہیں۔

تحقیقی مقالات کا یہ مجموعہ درج ذیل ۶ مقالات پر مشمل ہے:

۱۔ میرؔ کے دیوان سوم کا ایک نادر قلمی نسخہ

۲۔ 'نکات الشعرا' کے چند خطی نسخے

۳۔ میرؔ اور انعام اللہ خاں یقیںؔ

۴۔ مصحفی کا سال ولادت

۵۔ مصحفی سے منسوب دو تذکرے

۶۔ مصحفی کے ایک عزیز اور شاگرد۔ شیخ علی بخش بیماؔر

ان مضامین میں میر و مصحفی پر جس احسن طریقے سے بحث و تمحیص کی گئی ہے وہ انتہائی گراں قدر ہے۔ دلائل و شواہد اکٹھا کر کے ایک ایک نکتے پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے اور بنیادی مآخذ کے حوالے سے اپنی باتیں رکھی ہیں۔ حنیف نقوی کا تحقیقی کمال اس کتاب سے ظاہر ہے۔

تاثر غالب (غالبؔ کی کم یاب نظم و نثر کا مجموعہ) بہ اضافہ ترجمہ خطوط فارسی از پرتو روہیلہ مرتبہ: قاضی عبدالودود۔ حنیف نقوی کی باز یافت کی اہم کڑی ہے۔

یہ کتاب پہلی بار 'علی گڑھ میگزین کے غالبؔ نمبر' (مدیر: ڈاکٹر مختار الدین احمد) ۱۹۴۹ء میں بنام، آثار غالب، بطور ضمیمہ شائع ہوئی تھی اور اسی سال محدود تعداد میں انجمن ترقی اردو، بہار کی جانب سے 'آثر غالبؔ' کے نام سے بھی شائع ہوئی۔ لیکن یہ اشاعت بھی کچھ زیادہ اطمینان بخش نہیں تھی۔ ''آثر غالب'' غالب کی بعض نادر تحریروں، اردو و فارسی، نظم و نثر، تقاریظ، مضامین او رخطوط کا مجموعہ ہے جسے پہلے مختار الدین احمد نے آثار غالب کے نام سے 1949 میں شائع کر دیا تھا۔ بعد ازاں مجموعہ اسی سال تاثر غالب کے نام سے انجمن ترقی اردو بہار نے شائع کیا، جب یہ کتاب نقوی صاحب کے ہاتھ لگی تو انھوں نے اس میں تو دریافت قیمتی مواد کو شامل کیا۔ اسے بہت محنت، دیانت، سلیقہ اور اپنے اہم اور قیمتی افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے جمع و مرتب کر کے دوبارہ شائع کر دیا۔

حنیف نقوی صاحب اسلوب بھی ہیں، ان کے یہاں مباحث بہت روشن ہو کر سامنے آتے ہیں۔ تذکرہ نما بیاض ''دیوان جہاں'' اس کتاب کے تعلق سے انھوں نے قیمتی رائے کی حیات و شخصیت اور اس کے دیوان جہاں سے متعلق دوسرے ذرائع و مآخذ

سے رابطہ کیا۔ اور داخلی اور خارجی شواہد کی بنیاد پر اس شخص اور اس کتاب کی بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا اور یہ ثابت کیا کہ یہ اس کا دیوان نہیں بلکہ تذکرہ نما بیاض ہے۔

غالب احوال و آثار کی پہلی اشاعت: ۱۹۹۰ میں نصرت پبلشر لکھنؤ سے ہوئی جس میں ۲۳۴ صفحات ہیں۔ دوسری اشاعت: ۲۰۰۷ء غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی سے ہوئی۔ ان میں جو مضامین شامل ہیں ان کی فہرست یوں ہے۔

۱۔ حرفِ اول — پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی

۲۔ کچھ اس اشاعت کے بارے میں

۳۔ پیشِ گفتار

۴۔ پیش لفظ — مالک رام

۵۔ غالبؔ کا سال ولادت

۶۔ غالبؔ کا سفر کلکتہ

۷۔ غالبؔ اور معارجۂ کلکتہ

۸۔ غالبؔ کے عہد میں ڈاک کا نظام

۹۔ منشی نول کشور اور غالبؔ

۱۰۔ غالبؔ۔ کی ایک غزل اور مرزا یوسفؔ

۱۱۔ غالبؔ سے منسوب ایک شعر (چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط، الخ)

۱۳۔ تلامذہ غالبؔ (طبع ثانی) پر ایک نظر

۱۴۔ تلامذہ غالب۔ ایک بازدید

اس کتاب کی اشاعت اول (۱۹۹۰ء) میں کل ۷ مضامین شامل تھے۔ اشاعت ثانی (۲۰۰۷ء) میں تین مضامین

۱۔ غالبؔ اور معارضۂ کلکتہ

۲۔ غالبؔ کے عہد میں ڈاک کا نظام اور

۳۔ تلامذۂ غالب۔ ایک بازدید، اضافہ کے گئے ہیں

رجب علی بیگ سرورؔ، چند تحقیقی مباحث، حنیف نقوی کی ایک اہم تحقیقی کتاب ہے۔ جسے انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی نے ۱۹۹۱ء میں شائع کیا تھا۔ ۱۰۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں درج ذیل مباحث شامل ہیں

حرف آغاز: خلیق انجم

مرزا رجب علی بیگ سرورؔ اور بنارس

کچھ 'فسانہ عجائب' اور سرورؔ کے بارے میں

فسانہ عجائب کا بنیادی متن۔ایک جائزہ

مقدمۂ کلام سرورؔ

رجب علی بیگ سرور کے تعلق سے بعض مخفی باتوں کو انھوں نے اس میں اجاگر کیا ہے اور نئے تحقیقی گوشے واضح کئے ہیں جن سے سرور کو نئے انداز سے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔حنیف نقوی کا انداز تحقیق اور اس کا طریقہء کار پورے طور پر اس سے واضح ہے۔

مرزا غالبؔ کے پنج آہنگ کا قدیم ترین خطی نسخہ (عکسی ایڈیشن) حنیف نقوی کا ایک نادر و نایاب کارنامہ ہے۔اسے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے شائع کیا تھا۔اس کتاب سے ان کی تحقیقی بصیرت کھل کر سامنے آئی ہے۔تحقیق میں جن عوامل کی ضرورت ہوتی ہیں ان پر یہ کتاب کھری اترتی ہے۔

بقول ڈاکٹر عابد رضا بیدار:

''پنج آہنگ کا نسخۂ بنارس ڈاکٹر حنیف نقوی کی دریافت کے مطابق قدیم ترین قلمی نسخہ ہے اس لئے اپنی اہمیت کے پیش نظر عکسی طور سے پیش کیا جارہا ہے۔''

دیوان ناسخ (عکسی ایڈیشن) نسخۂ بنارس کے ناشر بھی خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ،ے جو ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا ۔۱۶۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی بازیازت اور اس کی تدوین پر حنیف نقوی نے بڑی محنت کی ہے۔یہ نسخہ ۱۲۵۵ھ/ ۱۸۳۹ء کا مکتوبہ ہے، کاتب کا نام محمد حسین علی، بقول پروفیسر حنیف نقوی ناسخؔ کے پہلے دیوان کا اصل نسخہ ہے۔حنیف نقوی کی تحقیقی مشقت کی جس قدر داد دی جائے کم ہے۔

رائے بنی نرائن دہلوی (سوانح اور ادبی خدمات)اس کا ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی ہے جسے،۱۹۹۷ میں شائع کیا گیا۔۱۳۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں رائے بنی نرائن دہلوی کی سوانح کو جس تحقیقی اور مستند انداز سے پیش سے پیش کیا ہے وہ ان کی عرق ریزی کی عمدہ مثال ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے حنیف نقوی کی ادبی، تحقیقی اور تنقیدی سرگرمیوں کا اعتراف ان لفظوں میں کیا تھا:

''حنیف نقوی کو میں ایک مدت سے پڑھتا رہا ہوں اور شاید ہی کوئی تحریر ان کی ایسی ہو جسے پڑھ کر میری معلومات میں اضافہ نہ ہوا ہو یا میری کوئی غلط فہمی دور نہ ہوئی ہو۔یہ ضرور ہے کہ اک زمانے تک ان کی شہرت نہ کچھ ''شہرت شکن''لوگوں کی سی تھی۔یعنی وہ بڑے بڑے محققوں کی غلطیاں اور فرگزاشتیں ڈھونڈنے اور بیان کرنے میں ماہر تھے لیکن آہستہ آہستہ ان کے کام کی بعض ایسی خوبیاں مجھ پر کھلیں کہ جن میں مجھے ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔''

(حنیف نقوی کی جاسوسیاں)

12.4 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ نے/ کو

- حنیف نقوی کی سوانح حیات اوران کے حالات زندگی سے واقفیت ہوئی۔
- حنیف نقوی کی تصنیفات وتالیفات کا علم ہوا۔ان کی مرتب کردہ تحقیقی کتابوں کی ایک اہم فہرست پڑھنے کو ملی۔
- حنیف نقوی کے تحقیقی کارناموں اوران کی مرتب کردہ قدیم مخطوطات، کتابوں،اورمخفی کتابوں کی تفصیلی جانکاری حاصل ہوئی۔ان کے تحقیقی اوصاف وامتیازات سے پوری طرح واقفیت ہوئی۔

12.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ حنیف نقوی کی تاریخ پیدائش اورجائے ولادت بتایئے اوران کی تاریخ وجائے وفات بھی بتایئے۔

۲۔ حنیف نقوی کی چھ اہم تحقیقی وتنقیدی کتابوں کے نام مع اسمائے ناشرین اورسن تصنیف بتایئے۔

۳۔ حنیف نقوی کی اہم کتابوں کے بارے میں اختصار سے ذکر کیجیے۔

12.6 سوالات کے جوابات

۱۔ حنیف نقوی کی پیدائش ضلع بدایوں کے موضع سہسوان میں 17 اکتوبر 1936 کو ہوئی تھی۔ان کا انتقال بنارس میں ۲۲/ دسمبر۲۰۱۲ءکو ہوا جہاں وہ سپرد خاک ہیں۔

۲۔ ۱۔شعرائے اردو کے تذکرے (نکات الشعرا سے گلشن بے خار تک) اشاعت اول،نسیم بک ڈپولکھنؤ،۱۹۷۶ء،اشاعت دوم،اتر پردیش،اردو اکادمی،لکھنؤ،۱۹۹۸ء

۲۔ انتخاب کربل کتھا مع مقدمہ وفرہنگ،اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ،۱۹۸۳ء

۳۔ تلاش وتعارف (مجموعۂ مقالات) نصرت پبلشرز لکھنؤ،۱۹۸۷ء

۴۔ انتخاب کلام رجب علی بیگ سرورؔ،اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ،۱۹۸۸ء

۵۔ غالب احوال وآثار،نصرت پبلشرز لکھنؤ،طبع اول،۱۹۹۰ء،غالب احوال وآثار،غالب انسٹی ٹیوٹ،نئی دہلی،طبع دوم، ۲۰۰۷ء

۶۔ رجب علی بیگ سرورؔ،چند تحقیقی مباحث،انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی،۱۹۹۱ء

۳۔

’’شعرائے اردو کے تذکرے‘‘ میں انھوں نے تذکرے کے مختلف معنی،تذکرہ نگاری بحیثیت فن،تذکرہ کی افادیت،اس کے محرکات،اس کی اہمیت پر بھرپور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔انھوں نے دکنی ادب اوراس کے تاریخی پس منظر کو بھی ملحوظ خاطر رکھا

اور تمام قابل ذکر دکنی شعرا کے کارناموں کا تذکرہ شامل کیا۔ انھوں نے بعض تذکروں پر بھرپور تحقیقی اور تنقیدی نظر ڈالی ہے اور ان کے تسامحات اور غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ کم و بیش تمام تذکروں کے حوالے سے انھوں نے گفتگو کی ہے۔ تذکروں کی ادبی و تنقیدی اہمیت پر متوازن گفتگو، شامل مقالہ تذکروں کا تاریخی، تحقیقی، ادبی اور تجزیاتی مطالعہ وغیرہ اس کتب کی اہم مباحث ہیں۔ امتیاز علی خان عرشی نے انھیں ایک خط میں لکھا تھا کہ ''میں نے اس تحقیقی مقالہ کو اول سے آخر تک پڑھا۔ آپ نے جس لگن سے مسالا اکٹھا کیا ہے وہ قابل داد ہے اور جس دیدہ ریزی سے اسے مرتب کیا ہے وہ مستحق تحسین و آفرین ہے۔'' مشفق خواجہ نے تو اس کتاب کو اردو ادب میں ایک اہم اضافہ قرار دیا۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ حنیف نقوی پہلے شخص ہیں جنھوں نے تذکروں کو بغور پڑھا اور بہت سے مسائل پر فیصلہ کن انداز میں رائے دی ہے۔ انھوں نے ایک مستند محقق کی طرح محاکے اور فیصلے بھی کیے ہیں۔

ان کے مضامین کا ایک مجموعہ ''تلاش و تعارف'' کے نام سے شائع ہوا۔ نام سے ہی ظاہر ہے کہ اس میں تحقیقی مضامین شامل ہیں۔ تلاش و تعارف تحقیق کا بنیادی عنصر ہے اور اسی مناسبت سے انھوں نے کتاب کا نام رکھا۔ اس میں سات مضامین ہیں اور سبھوں کی نوعیت تحقیقی ہے۔

''میر و مصحفی'' حنیف نقوی کی ایک ایسی کتاب ہے جس میں تین مضامین میر پر اور تین مصحفی پر ہیں۔

تحقیقی مقالات کا یہ مجموعہ درج ذیل ۶ مقالات پر مشتمل ہے:

۱۔ میرؔ کے دیوان سوم کا ایک نادر قلمی نسخہ ۲۔ 'نکات الشعرا' کے چند خطی نسخے ۳۔ میرؔ اور انعام اللہ خاں یقینؔ ۴۔ مصحفیؔ کا سال ولادت

۵۔ مصحفیؔ سے منسوب دو تذکرے ۶۔ مصحفیؔ کے ایک عزیز اور شاگرد۔ شیخ علی بخش بیمارؔ

ان مضامین میں میر و مصحفی پر جس احسن طریقے سے بحث و تمحیص کی گئی ہے وہ انتہائی گراں قدر ہے۔ دلائل و شواہد اکٹھا کر کے ایک ایک نکتے پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے اور بنیادی ماخذ کے حوالے سے اپنی باتیں رکھی ہیں۔ حنیف نقوی کا تحقیقی کمال اس کتاب سے ظاہر ہے۔

تاثر غالب (غالبؔ کی کم یاب نظم و نثر کا مجموعہ) بہ اضافہ ترجمہ خطوط فارسی از پرتو روہیلہ مرتبہ: قاضی عبدالودود۔ حنیف نقوی کی بازیافت کی اہم کڑی ہے۔

رجب علی بیگ سرورؔ، چند تحقیقی مباحث، حنیف نقوی کی ایک اہم تحقیقی کتاب ہے۔ جسے انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی نے ۱۹۹۱ء میں شائع کیا تھا۔ ۱۰۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں درج ذیل مباحث شامل ہیں

۱۔ مرزا رجب علی بیگ سرورؔ اور بنارس ۲۔ کچھ 'فسانہ عجائب' اور سرورؔ کے بارے میں ۳۔ فسانہ عجائب کا بنیادی متن۔ ایک جائزہ ۴۔

مقدمۂ کلام سرورؔ

رجب علی بیگ سرور کے تعلق سے بعض مخفی باتوں کو انھوں نے اس میں اجاگر کیا ہے اور نئے تحقیقی گوشے واضح کئے ہیں جن

سے سرور کو نئے انداز سے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔حنیف نقوی کا انداز تحقیق اور اس کا طریقہء کار پورے طور پر اس سے واضح ہے۔

مرزا غالبؔ کے پنج آہنگ کا قدیم ترین خطی نسخہ (عکسی ایڈیشن) حنیف نقوی کا ایک نادر و نایاب کارنامہ ہے۔اسے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے شائع کیا تھا۔اس کتاب سے ان کی تحقیقی بصیرت کھل کر سامنے آئی ہے۔تحقیق میں جن عوامل کی ضرورت ہوتی ہیں ان پر یہ کتاب کھری اترتی ہے۔

بقول ڈاکٹر عابد رضا بیدار:

''پنج آہنگ کا نسخۂ بنارس ڈاکٹر حنیف نقوی کی دریافت کے مطابق قدیم ترین قلمی نسخہ ہے
اس لئے اپنی اہمیت کے پیش نظر عکسی طور سے پیش کیا جارہا ہے۔''

دیوان ناسخ (عکسی ایڈیشن) نسخۂ بنارس کے ناشر بھی خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ہے جو ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا ۔۱۶۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی بازیازت اور اس کی تدوین پر حنیف نقوی نے بڑی محنت کی ہے۔یہ نسخہ ۱۲۵۵ھ/ ۱۸۳۹ء کا مکتوبہ ہے، کاتب کا نام محمد حسین علی، بقول پروفیسر حنیف نقوی ناسخ کے پہلے دیوان کا اصل نسخہ ہے۔حنیف نقوی کی تحقیقی مشقت کی جس قدر داد دی جائے کم ہے۔

رائے بینی نرائن دہلوی (سوانح اور ادبی خدمات) اس کا ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی ہے جسے، ۱۹۹۷ میں شائع کیا گیا۔۱۳۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں رائے بینی نرائن دہلوی کی سوانح کو جس تحقیقی اور مستند انداز سے پیش کیا ہے وہ ان کی عرق ریزی کی عمدہ مثال ہے۔

12.7 فرہنگ

لفظ	معنی
عالم	علم کا جاننے والا
اصحاب	صاحب کی جمع
جزئیات	جز کی جمع
تصنیفی	لکھنے کا کام
کلاسیکی	پرانی
معتبر	اعتبار کے لائق
زعفران زار	ہنسی ٹھٹھول سے بھرپور
میلان	رجحان
طبعی	طبیعت کے مطابق

فہم وفراست	عقل وسمجھ
متصف	خوبیوں سے بھرا ہوا
شناخت	پہچان
رابطہ	تعلق
جداگانہ	الگ تھلگ
تساہمات	غلطیاں
نشاندہی	اشارہ کرنا
نو دریافت	نئے سرے سے تلاش کیا ہوا
ازالہ	پورا کرنا
اہل علم	علم والا
تحسین	تعریف
غلط فہمی	غلط باتوں پر یقین رکھنا
ثانی	دوسرا
اختصاص	خصوصیات
خاک	مٹی
بحر بیکراں	سمندر جس کا کنارہ نہ ہو

12.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ سید حسن عباس — حنیف نقوی علمی آثار

۲۔ سید حسن عباس — حنیف نقوی نمبر (رسالہ ''ادراک'')

۳۔ گوشۂ حنیف نقوی — رسالہ ''کتاب نما'' نومبر ۲۰۱۳

۴۔ وہاب اشرفی — تاریخ ادب اردو

اکائی 13 : گیان چند جین

ساخت:

13.1 اغراض ومقاصد
13.2 تمہید
13.3 گیان چند جین: حیات اور ادبی کارنامے
13.3.1 گیان چند جین: سوانحی کوائف اور حالات زندگی
13.3.2 گیان چند جین کی تصنیفات وتالیفات
13.3.3 گیان چند جین کے تحقیقی کارنامے۔اوصاف وامتیازات
13.4 آپ نے کیا سیکھا
13.5 اپنا امتحان خود لیجئے
13.6 سوالات کے جوابات
13.7 فرہنگ
13.8 کتب برائے مطالعہ

13.1 اغراض ومقاصد:

اس اکائی میں آپ/کو

- گیان چند جین کے سوانحی کوائف اور حالات زندگی سے واقف ہوں گے۔
- گیان چند جین کی تصنیفات کی تفصیلی معلومات حاصل ہوگی۔
- گیان چند جینکے تحقیقی کارناموں اور ان کی ادبی خدمات کے ساتھ ان کے اوصاف اور امتیازات کے بارے میں جان سکیں گے۔

13.2 تمہید:

گیان چند جین (1923-2007) اردو کے ایک معروف ومستند محقق اور ماہر لسانیات تھے۔ان کا مطالعہ حد درجہ وسیع تھا۔انھوں نے تعلیمی دوران میں ہی لکھنا پڑھنا شروع کر دیا تھا۔وہ ابتدا سے ہی شعر وسخن میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے اور اپنے بڑے بھائی کے توسط سے عروض کی کئی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔چونکہ وہ لسانی اعتبار سے اردو اور ہندی کو ایک ہی زبان مانتے ہیں اس لئے ان کی اردو اور ہندی عروض پر گہری نظر ہے۔داستانوں سے انھیں گہری دلچسپی تھی اس لئے انھوں نے داستانوں پر بہت عمدہ اور اعلیٰ درجے کا کام کیا ہے۔ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین میں بھی تخلیقی شان نظر آتی ہے۔اور سب سے بڑھ کر اسلوب کی دلکشی اس بات

کی غمازی کرتی ہے کہ ان کا تخلیقی ادب سے لگاؤ بھی کم گہرا نہیں تھا۔لیکن تخلیقی ادب کی جانچ پڑتال کو ہی انھوں نے اپنا شیوہ بنایا اور تحقیق کو اصل میدان منتخب کیا۔

گیان چند جین کو کلاسیکی ادب سے گہری دلچسپی تھی اور وہ بڑے شوق سے کلاسیکی کتابوں کے مطالعے کے لئے بے چین رہتے تھے۔ان

کو ادب کے تمام نثری اصناف سے دلچسپی رہی۔ گیان چند جین تحقیق کو حقیقت کی دریافت کا عمل مانتے ہیں۔ وہ تحقیق میں اخلاقیات کے قائل تھے۔ان کا ماننا تھا کہ تحقیق میں اگر کوئی کسی کی غلطی کی نشاندہی کرتا ہے تو اسے خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرنا چاہئے۔تحقیق میں سچ کا راستہ اختیار کرنا اور دوسروں کے بتائے ہوئے صحیح اور مستند شواہد و دلائل کو قبول کرنا عین ایمان تحقیق ہے۔

گیان چند نے اپنے عہد کے معاصرین کے علاوہ اپنے پیش روؤں پر بھی کھل کر تنقید کی ہے اور ان کے تحقیقی کاموں میں فروگذاشتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنے مستند دلائل و براہین سے سچ ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ان کا ذہن ہمیشہ منصفانہ رہا اور تحقیق میں اسے وہ اولیت دیتے رہے۔محمود شیرانی ہوں،عبدالحق ہوں، قاضی عبدالودود ہوں،مسعود حسن رضوی ادیب یا کوئی اور محقق سبھوں پر انھوں نے خامہ فرسائی کی ہے اور ان کے تحقیقی کاموں میں غلطیوں اور غلط بیانیوں و تاریخ ماٰخذ کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنی تحقیقی صلاحیتوں کی بنیاد پر دلائل پیش کرتے ہوئے ان کی اصلیت کو سامنے لانے کی حتی المقدور کوشش کی۔۔

گیان چند جین کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا لیکن انھوں نے اس کا برا نہ مانا اور ہمیشہ کھلے دل و دماغ کے ساتھ ان فروگذاشتوں کو قبول کیا جو ان سے سرزد ہوئی تھیں۔اس سے ظاہر ہوا کہ تحقیق میں کچھ بھی حرف آخر نہیں ہے۔

چونکہ انھوں نے اردو کی نثری داستانیں پر ہی پی ایچ ڈی کی تھی اس لئے داستانوں کے تعلق سے ان کی معلومات بھرپور اور وسیع ہے۔داستانوں کے حوالے سے ان کی تحریروں کا مطالعہ آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان کا ذہن ہمیشہ مثبت فکر اور مثبت انداز گفتگو پر مرکوز رہا۔

ڈی لٹ کے لئے انھوں نے اردو مثنوی کا انتخاب کیا تھا جس کا مرکز و محور شمالی ہند تھا۔اس لئے اس صنف کی بابت انھیں جتنی معلومات ہے وہ بہت کم محققوں کو ہے۔مثنوی کے حوالے سے ہی انھوں نے اپنے معاصرین اور اپنے پیش روؤں پر کھل کر تنقید کی اور ان کی تحقیقات کی ان غلطیوں کی نشاندہی کی جن کے وہ دعوے میں غلط مفروضات کے کام لیتے رہے۔ان کا ماننا تھا کہ تحقیق میں وسیع النظری اور بردباری شرط ہے۔

گیان چند جین کو تاریخ ادب اردو سے بھی گہری واقفیت تھی۔انھوں نے سیدہ جعفر کے ساتھ مل کر تاریخ ادب اردو 1700 تک کی تالیف کی۔یہ کام بڑی محنت طلب تھا اور اسے بڑی چھان بین کے ساتھ بہ طریق احسن انھوں نے انجام دیا۔اس کتاب کے ہر صفحے سے ان کی محنت عیاں ہے۔انھوں نے اردو ادب میں لکھی جانے والی تاریخوں کا بھی ایک طویل جائزہ لیا ہے۔ان کا یہ کام ایک اہم تحقیقی کاوش ہے اس میں جین صاحب نے تقریباً 27 مشہور ادبی تاریخوں اور تقریباً 17 نسبتاً غیر معروف تاریخوں کا

جائزہ لیا ہے۔ان کا یہ جائزہ تحقیقی وسیع النظری اور علمیت کی عمدہ مثال ہے۔

گیان چند جین نے مضامین کی شکل میں تحقیقی مضامین زیادہ لکھے ہیں۔ وہ اپنے مضامین میں بھی صداقت پسندانہ رویہ اختیار کرتے رہے ہیں۔

''تحقیق کا فن'' گیان چند جین کی مقبول کتاب ہے۔جس میں تحقیق و تدوین کے اصول وضوابط کے علاوہ تحقیق کے مختلف مسائل، امکانات، رجحانات فکریات اور مبادیات کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔تحقیق میں جدید طریقۂ کار کے اصولوں کی پابندی کو وہ ناگزیر قرار دیتے ہیں۔اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ گیان چند جین ''تحقیق'' کو ایک سنجیدہ عمل تصور کرتے تھے۔تحقیق کے اصول وضوابط کے تمام تر گوشوں پر انھوں نے کھل کر بحث کی اور ایسے ایسے نادر مشورے دیے ہیں کہ آنے والی نسلوں کے لئے یہ کتاب نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

13.3 گیان چند جین: حیات اور ادبی کارنامے

13.3.1 گیان چند جین: سوانحی کوائف اور حالات زندگی

گیان چند نام تھا لیکن مذہب جین ہونے کی وجہ سے اپنے نام کے آگے جین کا لاحقہ لگا کر گیان چند جین کہلائے۔ان کے والد لالہ بھال سنگھ اپنے وقت کے بہت معروف شخص تھے۔ان کی پیدائش 19 ستمبر 1923 کو ضلع بجنور کے علاقہ سیوہارہ (یوپی) میں ہوئی تھی۔ان کو بچپن سے تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا۔سیوہارہ کے ایک اسکول مسلم قدرت اسکول میں 1937 میں آٹھویں جماعت میں داخلہ لیا۔اس سے پہلے ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور قرب وجوار کے معلموں کے یہاں بھی جا کر تعلیم حاصل کرتے رہے۔ میٹرک کا امتحان مرادآباد کے پارکر ہائی اسکول سے 1929 میں پاس کیا اور انٹر مرادآباد کے ہی گورنمنٹ انٹر کالج سے 1941 میں کیا۔آگے کی تعلیم کے لئے وہ الہ آباد آگئے یہاں انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی میں بی۔اے میں داخلہ لیا اور 1943 میں کامیاب ہوئے۔ پھر اس یونیورسٹی سے 1949 میں ایم اے فرسٹ کلاس فرسٹ ڈویژن سے کامیابی حاصل کی۔انھوں نے پی ایچ ڈی کے لئے اسی یونیورسٹی کا انتخاب کیا اور یہاں سے ہی ڈاکٹریٹ کی ڈگری 1948 میں حاصل کی۔انھیں تعلیم سے اس قدر دلچسپی تھی کہ آگرہ یونیورسٹی سے پرائیویٹ طور پر سماجیات (مونولوجی) میں 1954 میں ایم اے کیا۔آگرہ یونیورسٹی سے ہی انھوں نے ڈی لٹ بھی کیا جو 1960 میں تکمیل پائی تھی۔تعلیم سے فراغت اور اس کے دوران بھی وہ علمی جستجو میں لگے رہے۔

گیان چند جین کو ملازمت بھی جلدی ہی ملی 10 جولائی 1950 کو حمیدیہ کالج بھوپال میں بحیثیت لکچرر ان کی تقرری ہوئی۔1956 میں وہ اس کالج کے صدر شعبہ اردو اور پروفیسر ہوئے۔یہاں کالج میں ان کا زیادہ دل نہ لگا اور وہ یونیورسٹی جانے کی تگ ودو میں لگے تھے۔آخرش 15 اکتوبر 1965 کو جموں یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر ان کی تقرری ہوئی اور یہ ملازمت 1976 تک چلتی رہی۔ پھر وہ اپنے ایک تعلیم ادارے جہاں سے انھوں نے تعلیم حاصل کی تھی یعنی الہ آباد یونیورسٹی آگئے جہاں وہ بحیثیت پروفیسر 7 اکتوبر 1976 کو عہدہ سنبھالا۔لیکن محض تین برسوں میں یعنی 1979 میں وہ یہاں سے پھر ہجرت کر گئے اور اس بار ان کا

مستقر مرکزی حیدرآباد یونیورسٹی بنا جہاں 26 مارچ 1979 کو بحیثیت پروفیسر ہی ان کی تقرری ہوئی۔ یہاں وہ طویل عرصہ تک رہے اور اردو زبان وادب کی خدمت میں کوشاں رہے۔ وہاں سے اپریل ۱۹۸۹ء میں سبک دوش ہوئے۔

گیان چند جین کو انگریزی، اردو اور لسانیات سے خاص دلچسپی تھی۔ اس وجہ سے وہ اپنے آنے والے زمانے میں ان موضوعات کا ایسا انتخاب کیا جو ان کے لئے تحقیق کا ذریعہ بھی بنا۔

اردو کے اساتذہ میں انھیں پروفیسر ضامن علی، ڈاکٹر حفیظ سید، ڈاکٹر اعجاز حسین اور ڈاکٹر رفیق حسین سے ان کے مراسم بڑے گہرے رہے اور وہ جہاں کہیں بھی گئے۔ دوستوں کا ایک ایسا حلقہ بنایا جو ان سے عقیدت رکھتا تھا۔

گیان چند جین کی شادی جون 1953 میں ہوئی۔ ان کی بیوی سہارنپور کی رہنے والی تھی اور خود بھی ہندی میں ایم اے تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ میری والدہ کی طرح میری بیوی کا تعلق بھی جین مذہب سے نہیں تھا بلکہ سناتن ہندو خاندان سے تھا۔ گیان چند کے اہل خاندان ہندی زبان جانتے تھے ان میں اردو سے آشنائی نہ تھی لیکن گیان چند جین نے اردو زبان کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اور مردم شماری میں بھی اپنی مادری زبان اردو ہی بتاتے رہے۔

گیان چند جین اردو اور ہندی کو ایک ہی زبان مانتے تھے وہ کہتے تھے کہ لسانی اعتبار سے اردو اور ہندی زبان ایک ہی ہے۔

گیان چند جین نے اردو زبان و ادب کی خدمت میں اپنی پوری عمر صرف کر دی اور بطور محقق اور ماہر لسانیات معروف ہوئے۔

درجہ ششم سے ہی انھیں شعر و شاعری سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور وہ بیت بازی میں بڑے شوق سے حصہ لیتے تھے۔ جب وہ آٹھویں درجے کو پہنچے تو انھیں شعر کی سمجھ زیادہ آئی۔ ان کے بڑے بھائی پرکاش مونس کو شعر و ادب سے لگاؤ تھا۔ ان سے شعر سنتے اور بحث کرتے۔ ان سے ہی لے کر انھوں نے عروض کی کتابیں پڑھیں جن میں یگانہ کی چراغ سخن، خواجہ عشرت لکھنوی کی عروض پر کتابیں تھیں۔ عروض پڑھ سیکھ کر شاعری کرنے لگے اور انھوں نے دسمبر 1937 میں پہلی غزل کہی۔ غرض ان کی ادبی زندگی کا آغاز شعر و سخن سے ہوا۔ اور پھر آہستہ آہستہ نثر نگاری کی طرف متوجہ ہوئے اور آخرش تحقیق کو ہی اپنا شعبۂ خاص منتخب کیا جس میں ان کے کارہائے نمایاں روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔

ان کے خاندان کوائف کے تعلق سے زیادہ معلومات دستیاب تو نہیں البتہ یہ معلوم ہوا کہ ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔

۱۹۸۲ء میں گیان چند جین کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا تھا۔

گیان چند جین کی وفات ۲۲/اگست ۲۰۰۷ء میں ہوئی۔

13.3.2 گیان چند جین کی تصنیفات وتالیفات

۱۔ اردو کی نثری داستانیں (ڈی فل کا مقالہ) انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی طبع اول ۱۹۵۴ء ترمیم واضافہ شدہ دوسرا ایڈیشن کراچی ۱۹۶۹ء۔ مزید ترمیم واضافہ شدہ تیسرا ایڈیشن (پہلا ہندوستانی ایڈیشن یوپی اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۷ء)

۲۔ تحریریں (مجموعہ مضامین) فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۶۴ء

۳۔اردو مثنوی شمالی ہند (دی لٹ کا مقالہ) انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ طبع اول ۱۹۶۹ء ترمیم و اضافہ شدہ دوسرا ایڈیشن انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی ۱۹۸۷ء

۴۔تفسیر غالب (غالب کے منسوخ کلام کی شرح) جموں کشمیر اکادمی آف آرٹ، کلچر اینڈ کلچر اینڈ لینگویجز' سری نگر' مطبوعہ اشاعت ۱۹۷۱ء واقعی سنہ ۱۹۷۲ء طبع دوم ۱۹۸۶ء

۵۔رموز غالب (غالب پر مضامین کا مجموعہ) مکتبہ جامعہ نئی دہلی، فروری ۱۹۷۶ء

۶۔حقائق (مجموعہ مضامین) ناشر خود۔الہ آباد ۱۹۷۸ء

۷۔ذکر و فکر (مجموعہ مضامین) ناشر خود۔الہ آباد، مطبوعہ تاریخ ۱۹۸۰ء واقعی تاریخ ۱۹۸۱ء

۸۔عام لسانیات، ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۸۵ء

۹۔لسانی مطالعے

۱۰۔ابتدائی کلام اقبال، بہ ترتیب و سال ۱۹۰۸ء تک اردو ریسرچ سنز حیدر آباد دکن ۱۹۸۸ء نیز شائقہ پبلشنگ ہاؤس کراچی ۱۹۸۸ء

۱۱۔اردو کا اپنا عروض۔۔۔انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۹۰ء

۱۲۔کھوج (تحقیقی مضامین) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۹۰ء

۱۳۔پرکھ اور پہچان (مجموعہ مضامین) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۹۰ء

۱۴۔تحقیق کا فن، یوپی اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۹۰ء

۱۵۔ایک بھاشا دو لکھاوٹ، ۲۰۰۵ء

۱۶۔ادبی اصناف، ۱۹۸۹ء

۱۷۔غالب شناس: مالک رام، ۱۹۶۹

۱۷۔مقدمے اور تبصرے، ۱۹۹۰ء

۱۸۔اوپندر ناتھ اشک، ۲۰۰۰

۱۹۔قاضی عبدالودود بحیثیت مرتب متن، ۲۰۰۰ وغیرہ وغیرہ

ان کتابوں کے علاوہ ان کے کئی مقالات اب بھی رسائل میں محفوظ ہیں جن کو کتابی شکل میں یکجا کرنے کی ضرورت ہے۔

13.3.3 گیان چند جین کے تحقیقی کارنامے اور امتیازات

گیان چند جین اردو زبان و ادب کے ایسے بلند پایہ محقق تھے جنھوں نے متعدد موضوعات پر مقالے لکھے۔یک موضوعی کتابوں کی تعداد گو کم ہے لیکن ادبی تحقیق کے پیش نظر انھوں نے جو بھی کتابیں لکھیں ان کی افادیت اردو زبان و ادب میں ہمیشہ قائم

رہے گی۔لسانیات،عروض،داستان،مثنوی،شرح غالب اوردوسرے صلاحیت آزماموضوعات پر کتابوں کے ساتھ مقالوں کا انبار لگا دیا۔گیان چند نے جو بھی کام کیا،دل لگا کر کیا۔اس میں تحقیق و تفتیش کے مستند پہلوؤں کو پیش نظر رکھا۔ان کے لکھنے کی رفتار بھی بہت تیز تھی۔

داستانوں پر کام کلیم الدین احمد اور وقارعظیم نے بھی کیا ہے لیکن گیان چند جین کی کتاب اردو کی نثری داستانیں سب پر بھاری ہے۔گیان چند نے اپنی کتاب میں 1870 تک کی داستانوں کی مکمل فہرست قارئین کے سامنے رکھ دی ہے۔یہ کام کس قدر تحقیق طلب ہے اوراس میں انھیں کتنی جانفشانی سے کام لینا پڑا ہوگا وہ ایک محقق ہی سمجھ سکتا ہے۔گیان چند کی تحقیقی کاوشوں کو دیکھتے ہوئے بلاشبہ انھیں چند اہم محققین کی صف میں رکھا جاسکتا ہے۔

''تحقیق کا فن'' گیان چند کا ایک ایسا اہم کارنامہ ہے جس سے طالب علم اور استاد دونوں استفادہ کر سکتے ہیں۔اس کی تصنیف میں انھوں نے انگریزی کی سو سے زیادہ کتابوں اور سترہ مجلّات سے استفادہ کیا۔تحقیق کے فن پر مضامین تو پڑھنے کو ملتے ہیں لیکن باضابطہ ایک ضخیم کتاب کی اشاعت اور زبان وادب کے لئے فال نیک ہے۔گیان چند نے تحقیق کے متعلق 32 سے زیادہ موضوعات پر گفتگو کی ہے جن میں بطور خاص تحقیق اور تحقیق کار،موضوع،خاکہ،مواد کی فراہمی،مواد کی پرکھ اور حزم واحتیاط،زبان و بیان،تدوین متن،ادبی لسانیات وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جن پر الگ الگ طویل مضمون کی ضرورت ہے لیکن انھوں نے تسلسل کے ساتھ تحقیق کی مبادیات اوراس کی ماہیت پر کھل کر باتیں کی ہیں۔کتاب کے آخر میں تحقیق سے متعلق اردو اصطلاحوں کی فرہنگ شامل کیا ہے اوراس طرح انگریزی کی اصطلاحوں کو بھی پیش کر دیا گیا ہے۔محقق کے اوصاف بیان کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ ایک محقق کو بے تعصب اور غیر جانبدار ہونا چاہئے۔تحقیق غیر جذباتی فن ہے اس کے مزاج میں سیمابیت،بے صری اور عجلت قطعی نہیں۔تحقیق کے لئے مزاج میں اعتدال کا ہونا شرط ہے۔علم کا غرور سم قاتل ہے۔نتائج تحقیق پیش کرنے کے لئے ہمت ہو اور اخلاقی جرأت ہو۔مزاج تقلیدی نہ ہو،ضعیف الاعتقاد نہ ہو۔سائنسی اور منطقی ذہن کا مالک ہو۔تاریخی شعور تو رکھتا ہو لیکن تنقیدی ژرف نگاہی بھی لازمی ہے۔گیان چند نے اپنی اس کتاب میں ان سب سے باتوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے اور یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا تحقیقی رویہ اسی کسوٹی پر پورا اترتا ہے کیونکہ وہ اپنے استاد مسعود حسن رضوی ادیب کو بھی نہیں بخشے اور اظہار رائے سے نہیں ہچکچاتے۔ایک جگہ انھوں نے لکھ دیا''مسعود حسن رضوی جب محمد حسین آزاد یا واجد علی شاہ پر لکھتے تھے تو محقق کے بجائے وکیل صفائی ہوجاتے تھے۔''(ص86) غرض انھوں نے اس کتاب میں جابجا مثالوں اور حوالوں سے اپنے مفروضات کی تصدیق کی ہے۔

''تفسیر غالب'' گیان چند کی ایسی کتاب ہے جس میں غالب کے غیر متداول کلام کی شرح کی گئی ہے۔انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ غالب کے متداول کی شرحیں تین سے اوپر ہیں لیکن ابتدائی قلم زد کلام اس قدر مغلق ہیں کہ وہ ابھی تک کاملاً تشریح نہیں ہوا۔ان کی یہ شرح 175 شعروں کے علاوہ نسخۂ عرشی کے غیر متداول کلام کی شرح ہے۔انھوں نے اس میں ایسی شرحوں کے بارے میں بھی باتیں کی ہیں جو غالب کے شارحین ان شعروں پر بھی پہلے کر چکے تھے۔گیان چند جین کا ماننا ہے کہ غالب کا قلم زد کلام اجنبی فارسی محاوروں کی جنت ہے۔انھوں نے شرح کے دوران بہار عجم اور فرہنگ آنند راج سے مدد لی اور غالب کے اشعار گنجینۂ معنی

کا طلسم کشائی کی۔ اس کتاب سے غالب فہمی میں اضافہ ہوا ہی نہیں ہوا بلکہ تحقیقی وتشریحی دوررسی اور غالب شناسی کا ایک اہم پہلو بھی سامنے آیا۔

غالب سے ان کی دلچسپی کی مثال ان کی ایک اور اہم تحقیقی کتاب ''رموز غالب'' ہے۔ اس میں بارہ مضامین ہیں جن میں 9 تحقیقی اور 3 تنقیدی ہیں۔ اس کتاب میں مشمولہ مضامین میں انھوں نے ماہرین غالب کہلانے والے محققین کی فروگذاشتوں کی نشاندہی کی ہے اور اپنے دلائل، شواہد سے حقائق کو ظاہر کیا ہے۔ یہ کتاب غالبیات میں ایک اہم اور وقیع اضافہ مانا جاتا ہے۔ غالب کے تعلق سے بہت ساری غلط بیانیوں اور ان کے حوالے سے غلط اظہارات کی انھوں نے کھل کر تنقید کا نشانہ بنایا اور اپنے تحقیقی زور قلم سے دلائل وشواہد کی بنیاد پر غالب کو اصل غالب کی شکل میں پیش کیا۔

''ابتدائی کلام اقبال'' گیان چند جین کا ایک اہم کارنامہ ہے جسے تحقیق کی دنیا میں اور اقبالیات کے ماننے والوں کے لئے اہم ہے۔ انھوں نے قیام حیدرآباد کے دوران عبدالصمد خاں کے بے نظیر کتب خانے سے ''کلام اقبال'' نام کی ایک قلمی بیاض مرتبہ محمد انور خان طالب علم جامعہ ملیہ اسلامیہ 1924 ملی۔ اس میں اقبال کا منسوخ کلام بکثرت دکھائی پڑا۔ غیر مطبوعہ نئی نظمیں بھی ملیں۔ اس طرح انھوں نے تاریخی ترتیب کے ساتھ 1924 تک کے اقبال کے کلام کو مرتب کیا لیکن اشاعت میں تاخیر ہونے کے سبب یہ کام پڑا رہا پھر اچانک انھیں عبدالصمد خان کے ہاں سے قلمی بیاض اقبال ملی جسے عبدالصمد صاحب نے عماد الملک سید حسین بلگرامی کے ذخیرے سے خریدا تھا۔ اس میں اقبال کا منسوخ کردہ کلام بکثرت تھا۔ اس طرح انھوں نے دونوں نسخوں کی مدد سے تدوین کا کام کیا۔ نظم وغزل کو، نیز منسوخ اور متداول کلام کو ملا جلا کر پیش کیا۔ انھوں نے اس میں جا بجا حواشی بھی دیے ہیں۔ یہ ایک ایسا تحقیقی کام ہے جو گیان چند کے حصے میں تو آیا لیکن اس سے ان کو وہ عزت وشہرت نہ ملی جس کے وہ متقاضی تھے۔ اقبال کے ماننے والوں کے لئے یہ ایک معرکہ آرا کام رہا ہے۔

گیان چند کا لسانیات سے گہرا تعلق رہا ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر کتابیں تو لکھی ہیں لیکن مضامین بھی کثرت سے لکھے ہیں۔ ''عام لسانیات'' اور ''لسانی مطالعے'' ان کی دو اہم کتابیں ہیں جو یک موضوعی ہیں۔ ''عام لسانیات'' ایک ضخیم کتاب ہے اور اس میں 24 ابواب ہیں۔ وہ اس کام میں 1956 سے ہی لگ گئے تھے۔ یہ کتاب لسانیات کے بھرپور علوم کا یہ ذخیرہ ہے۔ ''لسانی مطالعے'' کو بھی پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ''لسانیات'' جسے علم کی حصولیابی کے لئے اردو زبان وادب میں کس طرح کے وسائل کی ضرورت ہے ان پر زور دیا گیا ہے۔ چند موضوعات یوں ہیں: لسانیات کے مطالعے کی اہمیت، زبان کا آغاز، اردو مسودے، اردو عروض، اردو الفاظ کا رومن املا، وغیرہ لیکن اردو اور ہندی کے رشتوں کے تعلق سے ان کے چند مضامین بالخصوص اردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ، اردو اور ہندی، مہاتما گاندھی اور بھاشا کا سوال قابل مطالعہ ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے ماہر لسانیات ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی لسانی خدمات پر بھی ایک مضمون سپرد قلم کیا ہے۔ سارے مضامین لائق مطالعہ اور قابل توجہ ہیں۔

''تحریریں''، ''تجزیے''، ''حقایق''، ''کھوج'' ''پہچان اور پرکھ''، ''ذکر وفکر'' اور ''مقدمے اور تبصرے'' ان کے ایسے مضامین کے مجموعے ہیں جن میں تحقیقی، ادبی علمی اور تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین میں ان کی تحقیقی بصیرت کے ساتھ

صاف گوئی اور بے باکی کے اوصاف و امتیازات صاف دکھائی پڑتے ہیں، جو تحقیق کے لئے لازمی عناصر ہیں۔ ان مضامین میں زبان و ادب اور تحقیق کے اہم موضوعات پر تحقیقی نظروں کے مطابق تجزیہ نگاری کی خصوصیات ملتی ہیں۔ انھوں نے اپنی باتوں کو مستند حوالوں کے ساتھ کہی ہیں۔ تحقیق کے رموز و نکات سے واقف گیان چند جین اپنے عصر کے ایسے محقق تھے جنھوں نے تبصروں، مقدموں اور مضامین کے توسط سے اپنے عہد اور اس سے پہلے کے محققین کی فرد گذاشتوں کی گرفت کی ہے۔ ان کی غلط بیانیوں اور مفروضات پر انگلی رکھی ہے اور صاف اور سادہ لہجے میں ان کو دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش ہے اور حقایق کو سامنے رکھا۔ انھوں نے تقریباً ہر مضمون میں غیر معمولی محنت کی ہے اور تلاش و جستجو کا حق ادا کرتے ہوئے حتمی فیصلے دیے ہیں۔ انھوں نے شکوک و شبہات کی بنیاد پر کوئی دلیل یا مثال پیش نہیں کی۔ ان کے نشانے پر کئی محققین آئے۔ یہ تو ان کے الگ الگ موضوع پر لکھے گئے مضامین کا حال ہے لیکن انھوں نے قاضی عبدالودود بحیثیت مرتب متن جو کتاب لکھی ہے اس میں انھوں نے قاضی صاحب کی کئی اہم تحریروں کو تحقیق و تنقید کا نشانہ بنایا اور نہایت دیانتداری اور فراست روی سے اپنی دلیلوں کو سامنے رکھا۔ قاضی صاحب کی تحقیق کو ہدف بنانا بجائے خود ایک اہم قدم اور فیصلہ ہے لیکن وہ کسی مروت کے بغیر تحقیق کے الفاظ صادق کو اپنے قلم سے نکلنے دیا۔ انھوں نے اس کی پرواہ نہ کی کہ ان کے معاصرین یا ان کے معتقدین اس پر کیا اعتراض کریں گے یا جواب دیں گے۔ تحقیق کا یہی سب سے اہم فریضہ ہے، جسے گیان چند جین نے ادا کیا۔ حالانکہ ماضی میں یہی کام قاضی صاحب بھی اپنے معاصرین اور پیش رووں کے ساتھ ایسا کرتے رہے تھے بہت ممکن ہے یہ ہے یہ ہنر گیان چند جین نے ان سے ہی سیکھا ہو۔۔

''ایک بھاشا، دو لکھاوٹ دو ادب'' گیان چند جین کی ایک ایسی کتاب ہے جس پر ادبی حلقوں میں واویلا مچا۔ گیان چند جین نے ہندی اردو کے تعلق سے بھی جو مفروضات قلم بند کئے وہ ان کے اپنے صوابدید کے مطابق تھے لیکن اس کتاب پر خوب بحثیں ہوئیں۔ مخالفت اور حمایت میں مضامین لکھے گئے لیکن پھر بھی اس کتاب کی تحقیقی یا لسانی اہمیت کم نہ ہوئی۔ انھوں نے اپنا ایک نظریہ پیش کیا اور یہ بتایا کہ ہندی اردو دو لسانی زبان ہیں لیکن دونوں کی حیثیت ایک زبان کی ہے۔ اس کتاب سے ایک طبقۂ خاص کو صدمہ پہنچا لیکن سچائی کا اظہار ہمیشہ صدمے دو چار کرتا ہی ہے۔ گیان چند نے جو سمجھا اور ان کے اپنے تجربے اور مشاہدے میں آیا ان کے مطابق انھوں نے یہ کتاب لکھ دی۔ ان کی یہ کتاب تحقیق ہی نہیں بلکہ ایک محقق کے نظریات کو بھی پیش کرتی ہے۔

گیان چند صلح جوئی کے قائل نہ تھے، وہ بے جا تعریف و توصیف کو پسند نہیں کرتے۔ علمی بحث و تمحیص کسی کی ناراضی انھیں اذیت نہیں پہنچاتی، انھوں نے نئے مآخذ کا پتہ لگایا، ہر کام کو نئے سرے سے کیا، اور ان کی افادیت، اہمیت اور ان کے مشتملات سے علمی دنیا کو روشناس کرایا۔ محققین میں ان کا انداز بیان سادہ اور سلیس رہا ہے۔ اسلوب نثر کے حسن میں شفاف پن ہے۔ صفائی، صراحت اور مدلل طریقۂ کار پر اپنی نثر کو قائم رکھتے ہیں اس کے لئے وہ لفظ اور معنی کی قطعیت اور استدلال کے منطقی ربط پر زور دیتے ہیں اور ہر لحہ اس کا خیال رکھتے ہیں۔

گیان چند نے جو تحقیقی کام کئے ہیں، تحقیقی مضامین لکھے ہیں ان میں تحقیقی ذوق، متن کو ترتیب دینے کی صلاحیت، ردو قبولیت کے لئے دلائل کی فراہمی، مثالوں اور حوالوں کی مدد سے مضبوط استدلالی رویہ، انتقادی شعور کی پختگی اور بالغ نظری کوٹ کوٹ

کر بھری تھی۔ان کی تحقیقی کتابیں اور کتاب میں مشمولہ مضامین بحثیت محقق ان کی تعین قدر کے لئے کافی ہیں۔

13.4 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ رکو

- گیان چند جین کی سوانح حیات اور ان کے حالات زندگی سے واقفیت ہوئی۔
- گیان چند جین کی تصنیفات وتالیفات کا علم ہوا۔ان کی مرتب کردہ تحقیقی کتابوں کی ایک اہم فہرست پڑھنے کو ملی۔
- گیان چند جین کے تحقیقی کارناموں اور ان کی مرتب کردہ قدیم مخطوطات، کتابوں، اور مخفی کتابوں کی تفصیلی جانکاری حاصل ہوئی۔ان کے تحقیقی اوصاف وامتیازات سے پوری طرح واقفیت ہوئی۔

13.5 اپنا امتحان خود لیجیے

ا۔ گیان چند جین کی تاریخ پیدائش اور جائے ولادت بتائیے اور ان کی تاریخ وفات بھی بتائیے۔

۲۔ گیان چند جین کی چھ اہم تحقیقی کتابوں کے نام مع اسمائے ناشرین وسن تصنیف بتائیے۔

۳۔ گیان چند جین کی تحقیقی خصوصیات کے بارے میں چند کتابوں کے حوالے سے اختصار سے ذکر کیجئے۔

13.6 سوالات کے جوابات

ا۔ان کی پیدائش 19 ستمبر 1923 کو ضلع بجنور کے علاقہ سیوہارہ (یوپی) میں ہوئی تھی۔گیان چند جین کی وفات ۲۲/اگست ۲۰۰۷ء میں ہوئی۔

۲۔ان کی چھ اہم تحقیقی کتابوں کے نام مع اسمائے ناشرین وسن تصنیف درج ذیل ہیں۔

ا۔اردو کی نثری داستانیں (ڈی فل کا مقالہ) انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی طبع اول ۱۹۵۴ء ترمیم واضافہ شدہ دوسرا ایڈیشن کراچی ۱۹۶۹ء۔مزید ترمیم واضافہ شدہ تیسرا ایڈیشن (پہلا ہندوستانی ایڈیشن یوپی اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۷ء)

۲۔تحقیق کا فن، یوپی اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۹۰ء

۳۔اردو مثنوی شمالی ہند (ڈی لٹ کا مقالہ) انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ طبع اول ۱۹۶۹ء ترمیم واضافہ شدہ دوسرا ایڈیشن انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی ۱۹۸۷ء

۴۔تفسیر غالب (غالب کے منسوخ کلام کی شرح) جموں کشمیر اکادمی آف آرٹ، کلچر اینڈ کلچر اینڈ لینگویجز' سری نگر' مطبوعہ اشاعت ۱۹۷۱ء واقعی سنہ ۱۹۷۲ء طبع دوم ۱۹۸۶ء

۵۔رموز غالب (غالب پر مضامین کا مجموعہ) مکتبہ جامعہ نئی دہلی، فروری ۱۹۷۶ء

۶۔عام لسانیات، ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۸۵ء

۳۔ گیان چندجین کی تحقیقی خصوصیات ان کی کتابوں کے حوالے سے لائق تحسین وآفرین ہیں۔

"تحقیق کا فن" گیان چندجین کا ایک ایسا اہم کارنامہ ہے جس سے طالب علم اور استاد دونوں استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس کی تصنیف میں انھوں نے انگریزی کی سو سے زیادہ کتابوں اور سترہ مجلّات سے استفادہ کیا۔ تحقیق کے فن پر مضامین تو پڑھنے کو ملتے ہیں لیکن باضابطہ ایک ضخیم کتاب کی اشاعت اور زبان وادب کے لئے فال نیک ہے۔ گیان چند نے تحقیق کے متعلق 32 سے زیادہ موضوعات پر گفتگو کی ہے جن میں بطور خاص تحقیق اور تحقیق کار، موضوع، خاکہ، مواد کی فراہمی، مواد کی پرکھ اور حزم واحتیاط، زبان و بیان، تدوین متن، ادبی لسانیات وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جن پر الگ الگ طویل مضمون کی ضرورت ہے لیکن انھوں نے تسلسل کے ساتھ تحقیق کی مبادیات اور اس کی ماہیت پر کھل کر باتیں کی ہیں۔ کتاب کے آخر میں تحقیق سے متعلق اردو اصطلاحوں کی فرہنگ شامل کیا ہے اور اس طرح انگریزی کی اصطلاحوں کو بھی پیش کر دیا گیا ہے۔ محقق کے اوصاف بیان کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ ایک محقق کو بے تعصب اور غیر جانبدار ہونا چاہئے۔ تحقیق غیر جذباتی فن ہے اس کے مزاج میں سیمابیت، بے صری اور عجلت قطعی نہیں۔ تحقیق کے لئے مزاج میں اعتدال کا ہونا شرط ہے۔ علم کا غرور سم قاتل ہے۔ نتائج تحقیق پیش کرنے کے لئے ہمت ہو اور اخلاقی جرأت ہو۔ مزاج تقلیدی نہ ہو، ضعیف الاعتقاد نہ ہو۔ سائنسی اور منطقی ذہن کا مالک ہو۔ تاریخی شعور تو رکھتا ہو لیکن تنقیدی ژرف نگاہی بھی لازمی ہے۔ گیان چند نے اپنی اس کتاب میں ان سب سے باتوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا تحقیقی رویہ اسی کسوٹی پر پورا اترتا ہے کیونکہ وہ اپنے استاد مسعود حسن رضوی ادیب کو بھی نہیں بخشتے اور اظہار رائے سے نہیں ہچکچاتے۔ ایک جگہ انھوں نے لکھ دیا "مسعود حسن رضوی جب محمد حسین آزاد یا واجد علی شاہ پر لکھتے تھے تو محقق کے بجائے وکیل صفائی ہو جاتے تھے۔" (ص 86) غرض انھوں نے اس کتاب میں جابجا مثالوں اور حوالوں سے اپنے مفروضات کی تصدیق کی ہے۔

"تفسیر غالب" گیان چند کی ایسی کتاب ہے جس میں غالب کے غیر متداول کلام کی شرح کی گئی ہے۔ انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ غالب کے متداول کی شرحیں تین سے اوپر ہیں لیکن ابتدائی قلم زد کلام اس قدر مغلق ہیں کہ وہ ابھی تک کاملاً تشریح نہیں ہوا۔ ان کی یہ شرح 175 شعروں کے علاوہ نسخۂ عرشی کے غیر متداول کلام کی شرح ہے۔ انھوں نے اس میں ایسی شرحوں کے بارے میں بھی باتیں کی ہیں جو غالب کے شارحین ان شعروں پر بھی پہلے کر چکے تھے۔ گیان چندجین کا ماننا ہے کہ غالب کا قلم زد کلام اجنبی فارسی محاوروں کی جنت ہے۔ انھوں نے شرح کے دوران بہار عجم اور فرہنگ آنند راج سے مدد لی اور غالب کے اشعار گنجینۂ معنی کا طلسم کشائی کی۔ اس کتاب سے غالب فہمی میں اضافہ ہوا ہی نہیں ہوا بلکہ تحقیقی وتشریحی دوررسی اور غالب شناسی کا ایک اہم پہلو بھی سامنے آیا۔

غالب سے ان کی دلچسپی کی مثال ان کی ایک اور اہم تحقیقی کتاب "رموز غالب" ہے۔ اس میں بارہ مضامین ہیں جن میں 9 تحقیقی اور 3 تنقیدی ہیں۔ اس کتاب میں مشمولہ مضامین میں انھوں نے ماہرین غالب کہلانے والے محققین کی فروگذاشتوں کی نشاندہی کی ہے اور اپنے دلائل، شواہد سے حقائق کو ظاہر کیا ہے۔ یہ کتاب غالبیات میں ایک اہم اور وقیع اضافہ مانا جاتا ہے۔ غالب کے تعلق سے بہت ساری غلط بیانیوں اور ان کے حوالے سے غلط اظہارات کی انھوں نے کھل کر تنقید کا نشانہ بنایا اور اپنے تحقیقی زور

قلم سے دلائل وشواہد کی بنیاد پر غالب کو اصل غالب کی شکل میں پیش کیا۔

''ابتدائی کلام اقبال'' گیان چند جین کا ایک اہم کارنامہ ہے جسے تحقیق کی دنیا میں اور اقبالیات کے ماننے والوں کے لئے اہم ہے۔انھوں نے قیام حیدرآباد کے دوران عبدالصمد خاں کے بے نظیر کتب خانے سے ''کلام اقبال'' نام کی ایک قلمی بیاض مرتبہ محمد انور خان طالب علم جامعہ ملیہ اسلامیہ 1924 ملی۔اس میں اقبال کا منسوخ کلام بکثرت دکھائی پڑا۔غیر مطبوعہ نئی نظمیں بھی ملیں۔ اس طرح انھوں نے تاریخی ترتیب کے ساتھ 1924 تک کے اقبال کے کلام کو مرتب کیا لیکن اشاعت میں تاخیر ہونے کے سبب یہ کام پڑا رہا پھر اچانک انھیں عبدالصمد خان کے ہاں سے قلمی بیاض اقبال ملی جسے عبدالصمد صاحب نے عماد الملک سید حسین بلگرامی کے ذخیرے سے خریدا تھا۔اس میں اقبال کا منسوخ کردہ کلام بکثرت تھا۔اس طرح انھوں نے دونوں نسخوں کی مدد سے تدوین کا کام کیا۔نظم وغزل کو، نیز منسوخ اور متداول کلام کو ملا جلا کر پیش کیا۔انھوں نے اس میں جا بجا حواشی بھی دیے ہیں۔یہ ایک ایسا تحقیقی کام ہے جو گیان چند کے حصے میں تو آیا لیکن اس سے ان کو وہ عزت وشہرت نہ ملی جس کے وہ متقاضی تھے۔اقبال کے ماننے والوں کے لئے یہ ایک معرکہ آرا کام رہا ہے۔

گیان چند کا لسانیات سے گہرا تعلق رہا ہے۔انھوں نے اس موضوع پر کتابیں تو لکھی ہیں لیکن مضامین بھی کثرت سے لکھے ہیں۔''عام لسانیات'' اور ''لسانی مطالعے'' ان کی دو اہم کتابیں ہیں جو یک موضوعی ہیں۔''عام لسانیات'' ایک ضخیم کتاب ہے اور اس میں 24 ابواب ہیں۔وہ اس کام میں 1956 سے ہی لگ گئے تھے۔ یہ کتاب لسانیات کے بھر پور علوم کا یہ ذخیرہ ہے۔''لسانی مطالعے'' کو بھی پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ''لسانیات'' جسے علم کی حصولیابی کے لئے اردو زبان وادب میں کس طرح کے وسائل کی ضرورت ہے ان پر زور دیا گیا ہے۔ چند موضوعات یوں ہیں: لسانیات کے مطالعے کی اہمیت، زبان کا آغاز، اردو مسودے، اردو عروض، اردو الفاظ کا رومن املا، وغیرہ لیکن اردو اور ہندی کے رشتوں کے تعلق سے ان کے چند مضامین بالخصوص اردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ، اردو اور ہندی، مہاتما گاندھی اور بھاشا کا سوال قابل مطالعہ ہیں۔اس کتاب میں انھوں نے ماہر لسانیات ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی لسانی خدمات پر بھی ایک مضمون سپرد قلم کیا ہے۔سارے مضامین لائق مطالعہ اور قابل توجہ ہیں۔

گیان چند صلح جوئی کے قائل نہ تھے، وہ بے جا تعریف وتوصیف کو پسند نہیں کرتے۔علمی بحث وتمحیص کسی کی ناراضی انھیں اذیت نہیں پہنچاتی، انھوں نے نئے مآخذ کا پتہ لگایا، ہر کام کو نئے سرے سے کیا، اور ان کی افادیت، اہمیت اور ان کے مشتملات سے علمی دنیا کو روشناس کرایا۔محققین میں ان کا انداز بیان سادہ اور سلیس رہا ہے۔ اسلوب نثر کے حسن میں شفاف پن ہے۔صفائی، صراحت اور مدلل طریقۂ کار پر اپنی نثر کو قائم رکھتے ہیں اس کے لئے وہ لفظ اور معنی کی قطعیت اور استدلال کے منطقی ربط پر زور دیتے ہیں اور ہر لمحہ اس کا خیال رکھتے ہیں۔

گیان چند نے جو تحقیقی کام کئے ہیں، تحقیقی مضامین لکھے ہیں ان میں تحقیقی ذوق، متن کو ترتیب دینے کی صلاحیت، ردو قبولیت کے لئے دلائل کی فراہمی، مثالوں اور حوالوں کی مدد سے مضبوط استدلالی رویہ، انتقادی شعور کی پختگی اور بالغ نظری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ان کی تحقیقی کتابیں اور کتاب میں مشمولہ مضامین بحیثیت محقق ان کی تعین قدر کے لئے کافی ہیں۔

13.7 فرہنگ

لفظ	معنی
توسط	ذریعہ
خندہ پیشانی	خوشی سے
معاصر	اپنے عہد کا
پیش رو	گزرے ہوئے
براہین	مثال
فروگزاشت	غلطیاں
بردباری	انکساری
احسن	خوبصورت
صداقت	سچائی
مبادیات	ماہیت
ناگزیر	ضروری
لاحقہ	بعد کا
جستجو	تلاش
تقرری	منتخب ہونا
مراسم	تعلقات
آشنائی	جان پہچان
امتیاز	ممتاز ہونا
بیت بازی	شعر گوئی کا کھیل
بلند پایہ	اعلیٰ مرتبہ
افادیت	مفید
قاری	پڑھنے والا
استفادہ	فائدہ اٹھانا
اکابر	مستند و معروف

انہماک	دل لگا کر
دیدہ ریزی	پوری آنکھ گڑا کر

13.8 کتب برائے مطالعہ

ا۔	وہاب اشرفی	تاریخ ادب اردو
۲۔	ڈاکٹر محمد حسین	اردو تحقیق کا ارتقا
۳۔	لسانیات نمبر	''اردوئے معلیٰ'' شعبۂ اردو، دہلی۔1981
۴۔	گوشۂ گیان چند	''نیا ورق'' بمبئی۔۱۹۱۳